

۱۵۰



# پاکستان کا المیہ

میر دہری محمد ظفر اللہ خاں



# پاکستان کا المیہ



چودھری محمد ظفر اللہ خاں



۱۵۵

اشرف تنویر

اقتساف فنانے پبلیکیشنز

شعبان نیما — ایٹ روڈ — لاہور



24737  
ACC. #  
MADAR-I-MILLAT LIBRARY  
AIWAN-I-QUAID-I-AZAM  
NAZARIA-I-PAKISTAN TRUST



۱۹۸۹ء

آتش و فتنان پہلی کیشف، شبستان سینا

ایسٹ روڈ لاہور فون نمبر ۳۳۱۴۳۳

پریسنگ ہاؤس لاہور

قیمت :

جنوری :

پیشہ :

پرنٹرز :

252

جملہ حقوق محفوظ



## تصاویر

- ۳۵ چودھری نصر اللہ خاں
- ۳۵ چودھری ظفر اللہ خاں اور چودھری محمد علی
- ۳۵ چودھری ظفر اللہ خاں جب پاکستان کے وزیر خارجہ تھے
- ۳۶ دہلی - ۱۹۳۴ء - سر آغا خاں، وائسرائے ہند کے پرائیویٹ سیکرٹری، چودھری ظفر اللہ خاں اور سید امجد علی
- ۳۷ بی بی سی پر عاشق حسین شاہوی چودھری ظفر اللہ خاں سے انٹرویو کر رہے ہیں
- ۳۷ چودھری شاہنواز، چودھری بشیر احمد، امت المحلی، خواجہ سرور حسن اور چودھری ظفر اللہ خاں
- وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کا پاکستان دستور ساز اسمبلی سے خطاب - وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں ان کے بائیں جانب بیٹھے ہیں -
- ۳۸ لندن - ۱۹۳۹ء - چودھری ظفر اللہ خاں اور انوار احمد کاہلوں
- ۳۹ چودھری ظفر اللہ خاں
- ۳۹ ۱۹۷۳ء - چودھری ظفر اللہ خاں سر لیون کے دورے کے دوران
- ۴۰ چودھری ظفر اللہ خاں فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے سینیٹر بنے
- ۴۰ ۳۰ جولائی ۱۹۶۵ء امریکہ کی برکس لین یونیورسٹی کی طرف سے چودھری ظفر اللہ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی جا رہی ہے -
- ۴۱ لندن - ستمبر ۲۰۱۲ء - دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر چودھری ظفر اللہ خاں اور علامہ اقبال
- ۴۲ چودھری ظفر اللہ خاں ۱۹۲۶ء میں
- ۴۲ چودھری ظفر اللہ خاں سعودی عرب کے حکمران شاہ ابن سعود کے ہمراہ
- ۱۳۰ اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری سر ڈاکٹر ایم شولٹ اور چودھری ظفر اللہ خاں
- ۱۳۰ ۱۹۵۰ء - چودھری ظفر اللہ خاں وزیر اعظم برطانیہ لارڈ ایشلی کے ساتھ
- ۱۳۱ چودھری ظفر اللہ خاں کا کراچی میں ایک پریہوم پریس کانفرنس سے خطاب
- ۱۳۲



- ۱۳۳ چودھری ظفر اللہ خاں اور سعودی عرب کے شاہ فیصل
- ۱۳۳ مصر کے صدر جمال عبدالناصر اور چودھری ظفر اللہ خاں کے درمیان گفتگو
- ۱۳۴ وزیر اعظم لیاقت علی خان کا سرواں دکن کے اعزاز میں استقبال، چودھری ظفر اللہ خاں وزیر اعظم کے سامنے والی نشست پر۔
- ۱۳۵ ۱۹۶۹ء - چودھری ظفر اللہ خاں اور جرمنی کے ممتاز قانون دان پروفیسر ڈاکٹر نیگے
- ۱۳۵ چودھری ظفر اللہ خاں، مصر کے وزیر خارجہ، مولوی تمیز الدین خاں، حسن اصفہانی اور مصری سفیر عبدالرحیم
- ۱۳۶ اقوام متحدہ - ۲۶ ستمبر ۱۹۶۷ء - مین اور پاکستان کے اقوام متحدہ میں داخلے کا منظر
- ۱۳۶ اردن کا اعلیٰ ترین اعزاز ملنے کے بعد چودھری ظفر اللہ خاں شاہ حسین کے ہمراہ
- ۱۳۷ چودھری ظفر اللہ خاں اور ممتاز امریکی شخصیات
- ۱۳۷ کینبرا - آسٹریلیا کے گورنر جنرل لارڈ گریسی اور چودھری ظفر اللہ خاں
- ۱۳۸ چودھری ظفر اللہ خاں کا بطور مرکزی وزیر آل انڈیا ریڈیو سے خطاب
- ۱۳۸ سر رام موہن لہیار اور چودھری ظفر اللہ خاں
- ۱۳۹ چودھری ظفر اللہ خاں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن
- ۱۳۹ سردار عبدالرب نشتر، چودھری ظفر اللہ خاں، عبدالستار پیرزادہ
- ۱۴۰ بیگ (ٹالینڈ) مئی ۱۹۶۳ء - مصطفیٰ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے جج کی حیثیت سے۔
- ۲۴۹ لاہور - چودھری ظفر اللہ خاں ۱۱ جنوری ۱۹۸۱ء







”پاکستان کا المیہ“ سرچودھری محمد ظفر اللہ خاں کی انگریزی تصنیف  
 THE AGONY OF PAKISTAN کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ چودھری صاحب کی خواہش  
 تھی کہ ہم اسے انگریزی میں بھی شائع کریں۔ لیکن ہماری اولین ترجیح اسے اردو  
 میں شائع کرنا تھی۔ جس کے لئے چودھری صاحب نے ہمیں تحریری اجازت بھی دیدی تھی۔  
 تاہم کتاب کے اردو ترجمے میں خاصا وقت صرف ہو گیا۔ اس دوران میں چودھری صاحب  
 انتقال کر گئے۔ ہماری کوشش ہے کہ اس کتاب کا انگریزی ورژن بھی جلد شائع کر دیا جائے۔

پبلشرز





## سیوانچی خاکہ

سر چودھری محمد ظفر اللہ خاں ۶ فروری ۱۸۹۳ء کو سیالکوٹ شہر کے محلہ نخاس میں پیدا ہوئے۔  
 ۱۹۰۷ء میں امریکن مشن سکول سیالکوٹ سے میٹرک کیا۔ ۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا،  
 اور عربی کے مضمون میں یونیورسٹی بھر میں اول رہے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں قانون کی تعلیم کے لئے انگلستان  
 گئے۔ جون ۱۹۱۴ء میں انگلینڈ ان سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں کنگز کالج لندن سے  
 ایل ایل بی کرنے کے بعد سیالکوٹ واپس آگئے جہاں اگست ۱۹۱۶ء تک وکالت کی پھر اگست ۱۹۱۶ء  
 میں "انڈین کیسز" کے اسٹنٹ ایڈیٹر ہو کر لاہور شفٹ ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۵ء تک لاہور چیف  
 کورٹ میں پریکٹس کی۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۴ء تک لاہور میں لیگجر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب  
 لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں  
 مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دہلی میں انہیں صدر منتخب کیا گیا۔ اسی سال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت  
 کی۔ جون ۳۲ء سے اکتوبر ۳۲ء تک سر میاں فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے۔  
 ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک وائسرائے کی کونسل  
 کے ممبر رہے۔ ستمبر ۱۹۴۱ء سے جون ۱۹۴۷ء تک فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج رہے۔ جون ۱۹۴۷ء  
 سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک چیئرمین آف پرنسز کے چانسلر نواب آف بھوپال کے ایگزیٹو مشیر رہے جولائی ۱۹۴۷ء  
 میں پنجاب بوڈری کشن میں مسلم لیگ کی طرف سے پیش ہوتے رہے۔ قائد اعظمؒ کے حکم پر وسط ۱۹۴۷ء  
 سے وسط دسمبر ۱۹۴۷ء تک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ دسمبر ۱۹۴۷ء سے نومبر  
 ۱۹۵۴ء تک پاکستان کے وزیر خارجہ رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک سیکورٹی کونسل کے سامنے کشمیر کا  
 کیس پیش کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں عالمی عدالت انصاف کے جج منتخب ہوئے۔ ۵ فروری ۱۹۶۱ء تک اس  
 عہدے پر رہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک عالمی عدالت انصاف کے نائب صدر رہے۔ اگست ۱۹۶۱ء  
 سے فروری ۱۹۶۴ء تک یو این او میں پاکستان کے مستقل مندوب کی حیثیت سے کام کیا۔ ۶ نومبر ۱۹۶۴ء کو  
 دوبارہ عالمی عدالت انصاف کے جج منتخب ہوئے۔ ۵ فروری ۱۹۷۳ء تک اس عہدے پر رہے۔ ۱۹۷۰ء  
 سے ۱۹۷۳ء تک عالمی عدالت انصاف کے صدر رہے۔  
 یکم ستمبر ۱۹۸۵ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔



## پیش لفظ

جس نے مسودے کا مطالعہ کیا اس نے ایک ہمدرد نقاد کی حیثیت سے اس کتاب کا یوں ذکر کیا کہ اس ”شواہد کے مرتب مجموعے“ میں مصنف نے اپنی سوچ کو پس منظر میں رکھنے کی پوری دیانتدارانہ کوشش کی ہے، ماسوا آخری حصے کے۔ تاریخی حصے واقعت پسندانہ طور پر پیش کئے گئے ہیں اور تقریباً سارے واقعات کے لئے تحریری شہادت ان ذرائع سے پیش کی گئی ہے جنہیں یقیناً تصور پاکستان کا ہمدرد نہیں کہا جاسکتا۔ ان حصوں میں مصنف کا مقصد ان کوششوں اور مصائب کا خلاصہ بیان کرنا ہے، جن میں سے پاکستان کے حصول کے لئے گزرنا پڑا اور جنہیں یکجا کر کے ابھی تک منظر عام پر نہیں لایا گیا تھا۔

دی ایگجٹیشن کی تصنیف ”دی گریٹ ڈیلوئمنڈ“ اور ایلن کیمپبل جانسن کی ”مشن وڈ ماؤنٹ بیٹن“ تقریباً لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانحریاں ہیں۔ مسٹر بیٹن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ایماء اور موصد افزائی پر اس غیر معمولی سعی کا بیڑہ اٹھایا، جبکہ مسٹر جانسن کئی برس تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس آفیسر رہے۔

پروفیسر رش بروک ولسن مغربی مصنفین میں واحد مصنف ہیں جنہوں نے اپنی تصنیف ”دی ایسٹ پاکستان ٹریجڈی“ بغیر کسی تعصب کے واقعت پسندانہ انداز میں لکھی۔

سر پیٹریکل مولن کی ”ڈیوائنڈ اینڈ کوئٹ“ اس موضوع کے اُن بعض پہلوؤں پر کارآمد روشنی ڈالتی ہے جو ابھی تک غیر واضح رکھے گئے تھے۔ مثلاً پارٹیشن ایوارڈ میں آخری لمحہ پر کی جانے والی تبدیلی جو پاکستان کے لئے سنگین نقصان کا باعث بنی۔

مسٹر جسٹس مہر چند مہاجن کی تصنیف ”گلنگ بیک“ اور ہندوستانی مصنفین کی متعدد دوسری تصانیف سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ مکمل طور پر غیر متعصب ہوں گے۔ لیکن از روئے امکان ان



پر پاکستانی حمایت میں تعصب کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے برعکس چودھری محمد علی کی تصنیف ”ایمر جنس آف پاکستان“ ایک قابل قدر تاریخی جائزے پر مبنی ہے جو زیر بحث موضوع کو بڑی قدرت اور ندرت سے بیان کرتے ہیں۔ ایک جاں نثار پاکستانی سول سروسٹ، ایڈمنسٹریٹر اور منجھے ہوئے سیاستدان کا قلم جو عنوان کے موضوع کی ادائیگی میں نمایاں صلاح کو پُر کرتا ہے۔

مصنف اس ”شواہد کے مرتب مجموعے“ کے نتیجہ خیز حصوں کی ذاتی طور پر پوری ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

تمام حوالہ جات قرآن کریم سے لئے گئے ہیں۔ جو ان کے علاوہ ہیں ان کے ساتھ ماخذات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

کتاب کا مسودہ نومبر ۱۹۷۲ء میں مکمل ہوا اور اسی تاریخ تک احاطہ کرتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا قاری کے لئے مفید ہوگا۔

ظفر اللہ خاں

لندن  
نومبر ۱۹۷۳ء



بارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے برصغیر پاک و ہند کے وسیع و عریض علاقے بتدریج مسلم حکمرانوں کے تحت آتے گئے اور مسلمانوں کا اقتدار مغل حکمرانوں (۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء) کے دور میں سب سے مضبوط صورت میں سامنے آیا۔ پھر اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں اس بے پناہ عروج کا زوال شروع ہوا یہاں تک کہ آخری مغل حکمران کو (جو شخص عہد رفتہ کی ایک علامت تھا اور جس کا اختیار نہ ہونے کے برابر تھا) ۱۸۵۷ء میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس نے زندگی میں اپنی زندگی کے آخری ایام انتہائی کسپرسی کے عالم میں گزارے۔

شاہی اقتدار کے زوال کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی قسمت کو بھی زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانوی حکمرانوں کی نظر میں ۱۸۵۷ء کے غدر، جو ہندوستان کی آزادی کی عظیم جنگ تھی کی بنیادی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی تھی۔ اگرچہ مسلمانوں نے درحقیقت اس میں بہت تھوڑا حصہ لیا تھا۔ انیسویں صدی کے تقیہ چالیس برسوں کے دوران برصغیر کے غیر مسلم لوگوں پر برطانوی اقتدار کی بہرہ باریاں بچھاؤں ہوتی رہیں جبکہ مسلمانوں کو ظالم اور باغی اقلیت سمجھا جاتا رہا جس کے ساتھ برطانوی حکمرانوں کا سلوک سوتیلی ماں کا سا تھا۔

بظاہر لگتا تھا کہ تمام عناصر مسلمانوں کو حکومت اور حاکموں سے الگ تھلگ رکھنے کے لئے فعال تھے۔ مسلمانوں کے عاملوں اور بزرگوں نے اس صورت حال کو مسلسل تبلیغ و تلقین سے اور بھی شدید بنا دیا۔ جس کا مرکزی تصور یہ تھا کہ انگریزوں اور ان کے ہر کام کے متعلق مسلمانوں میں نفرت پیدا کی جائے۔ انگریز حکام کے ساتھ مسلمانوں کے ہر قسم کے رابطے اور ان کے قائم کردہ سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ سے گریز کی پالیسی پر بڑے پیمانے پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو مسلمانوں کے بنیادی مذہبی عقیدے کے خلاف قرار دیا گیا۔ غرضیکہ مسلمانوں نے اس دور کی ہر چیز سے ناظرہ توڑے رکھا۔



اور دنیا مایہا سے بے نیاز اپنی کھال میں مست رہے۔

اس کے نتائج مسلمانوں کے مستقبل کے لئے خوشگوار ثابت نہ ہوئے۔ درحقیقت اس رویے کے باعث ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل طویل المیاد عرصہ کے لئے گہنا گیا۔ سرسید احمد خان پہلے شخص تھے جنہوں نے سیاسی و سماجی خودکشی کے اس راستے کو بچپانہ جس پر مسلمان قوم روایت پرست علماء کی قیادت یا تبلیغ کے نتیجے میں چل رہی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم اپنانے کی ترغیب دینے کے کام کا آغاز کیا۔ سرسید احمد خان نے ملک میں ایک ایسے عمدہ تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے خود کو وقف کر دیا جو مسلمان طلباء کو جدید علوم کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کے لئے مسلم ثقافتی اقدار کے فروغ کے لحاظ سے ایک مرکزی حیثیت کا بھی حامل ہو۔ اس طرح ۱۸۷۵ء میں مستقبل کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سنگ بنیا در کھا گیا۔

سرسید احمد خان اپنے گرد نواب حسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی، الطاف حسین حالی اور اسی پائے کے دیگر دانشوروں اور زعماء کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جنہوں نے سرسید کے مقاصد کو پورا کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ سرسید احمد خان کو علی گڑھ میں کانچ کے قیام کے سلسلے میں خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کا پُر جوش اور بے پناہ تعاون حاصل رہا۔

ابتدائی برسوں میں اس کانچ کو دو ایسے پرنسپل ملے جنہوں نے مسلمان طلباء میں اپنی ثقافتی اقدار کے ساتھ وفاداریوں کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں مسٹر تھیوڈور بیک اور مسٹر بعد میں سر) تھامس آرنلڈ شامل تھے۔ ان اساتذہ کے شاگردوں نے اپنے ساتھ ان کے مشفقانہ رویے اور محبت کو ہمیشہ سراہا۔ مسٹر تھامس آرنلڈ کی تصنیف ”پریچنگ آف اسلام“ کو مستشرقین نے بے حد سراہا ہے۔

اپنی تحریروں اور تقریروں میں سرسید احمد خان نے اس بات پر زور دیا کہ برصغیر کی دو اہم ثقافتیں یعنی مسلم اور ہندو آٹھ سو برس سے ایک دوسرے کے برابر چلی آ رہی ہیں اور فطری طور پر یہ ایک دوسرے پر کسی حد تک اثر انداز ہونے میں ناکام نہیں رہیں، تاہم ان دونوں ثقافتوں کے وسیع پیمانے میں باہم مل جل جانے کا عمل بھی کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا۔ اور یقیناً ان دونوں کے ملاپ سے کسی مشترک تہذیب نے بھی جنم نہیں لیا۔ اس صورت حال کی ایک وجہ سرسید کے نزدیک



یہ تھی کہ دونوں ہندوستانی مذاہب سے ماخوذ تھیں اور دونوں مذاہب کے درمیان کوئی نقطہ اتصال نہیں تھا۔ سید احمد خاں کے مطابق اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اور ہندو برصغیر میں دو فرقوں کی بجائے دو الگ الگ قوموں کی حیثیت سے ابھرے۔

عیسائیوں، سکھوں اور پارسیوں میں سے خاص طور پر دو مؤرخ الذکر فرغے سیاسی لحاظ سے (ہندو) اکثریت کے ساتھ اتحاد کا رجحان رکھتے تھے۔ عیسائیوں نے سیاسی لحاظ سے آزاد رہنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ مگر ان کا الگ سے کوئی پلہ نہ تھا اس طرح برصغیر میں مجموعی سیاسی گروہ بندی جس کی بنیاد مذہبی اقدار پر صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پائی جاتی تھی۔

آل انڈیا کانگریس کی بنیاد انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے میں (۱۸۸۵ء) ایک انگریز مسٹر ہیوم نے رکھی جس کی دل چسپی کا بنیادی نقطہ برصغیر کی سماجی اقدار تھیں۔ برطانوی وزیر اعظم مسٹر اسٹین نے پارلیمنٹ میں ۱۰ جولائی ۱۹۰۴ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”..... جس طرح ہندوستان اپنی سالمیت اور آزادی بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھنے کے لئے برطانیہ کا مہونہ منت ہے۔ بالکل اسی طرح انڈین نیشنل کانگریس کا قیام بھی ہماری ہی نسل کے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔۔۔۔۔“ اس سماجی تنظیم (انڈین نیشنل کانگریس) نے جلد ہی سیاسی رنگ روپ اختیار کر لیا۔ اس میں مسلمان ارکان بھی شامل رہے مگر یہ ہمیشہ ہندو مقاصد اور پارلیمنٹ کی ترجمان رہی۔ انیسویں صدی کے اختتام تک اس جماعت نے قابل ذکر سیاسی اہمیت اختیار کر لی اور اس کے بعد اس کے اندر سورج اور قوت میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا۔ وائسرائے لارڈ کرزن کے عہد میں ہندوستان میں سیاسی سونچ کو کافی حد تک ہمبزمی جس کے نتیجے میں کانگریس کے وقار میں بھی اضافہ ہوا اور یہ ہندوستان کے مختصر سے سیاسی لحاظ سے باشعور طبقے میں کافی مقبول ہونے لگی۔

میونسپل کمیٹی کی سطح پر عوامی نمائندگی کا نظام وائسرائے لارڈ ڈرپن (۸۳-۱۸۸۰ء) کے زمانے میں پہلی بار ہندوستان میں متعارف کرایا گیا۔ اس نظام کو کسی حد تک بعض دوسرے اداروں میں بھی رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ نظام ہندوستان کے مخصوص حالات کے باعث ناکام ثابت ہوا کیونکہ یہاں قومی جذبات پر گروہی یا فرقہ وارانہ وفاداریاں بڑی طرح حاوی تھیں۔ چند کمیاب اور نہایت معمولی مستثنیات کے علاوہ ان انتخابات میں مسلمانوں کو اس بات کا قلع بھرہ ہوا کہ ایسے حلقہ انتخابات میں جہاں



غیر مسلم معمولی سی بھی اکثریت میں تھے وہاں سے کسی مسلمان کا منتخب ہو جانا قطعاً ناممکن تھا۔ پھر مسلمانوں کی خراب معاشی حالت بھی ان کے استحصال کا باعث بنتی تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر یہاں تک مسلمانوں کے مفادات کا تعلق تھا، عوامی نمائندگی کا یہ نظام محض ایک مذاق سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ مسلمانوں نے اس نظام کی مزید توسیع کو شکوک و شبہات کی فطرت سے دیکھنا شروع کر دیا اور وہ کسی ایسے نظام یا طریق کار کے متلاشی بن گئے جو مستقبل میں ان کے سیاسی اور ثقافتی مفادات کا تحفظ کر سکے۔

اسی سوچ کا نتیجہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی صورت میں نکلا یہ سر آغا خان، سید امیر علی اور نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ جیسے زعماء کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مسلم رہنماؤں کے ایک وفد نے وائسرائے لارڈ مینٹو (۱۹۰۵-۱۰) سے ملاقات کی جس کے دوران مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مختلف تجاویز پیش کی گئیں جن میں سے ایک اہم تجویز مسلمانوں کے لئے بعد اکا نہ انتخابات کا نظام نافذ کرنے سے متعلق تھی۔ یہ تجویز منٹو مارلے آئینی اصلاحات کی سکیم کے ذریعہ نافذ کر دی گئی جو ہندوستان کی آزادی تک نافذ العمل رہی۔

مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی مرکزی سیاسی تنظیم بن گئی جو مسلم مفادات کے تحفظ کے لئے کئی برسوں تک اعتدال پسند جماعت کی حیثیت سے تعمیری کردار ادا کرتی رہی۔ کچھ عرصہ تک یہ تحریک خلافت کی سرگرمیوں کے باعث پس پردہ چلی گئی اور پھر اسے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی سیاسی رقابت کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ ۱۹۳۰ء کے عشرے کے آخری برسوں سے پھر فعال اور زیادہ طاقت ور ہو گئی۔ یہاں تک کہ اسے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت تسلیم کر لیا گیا۔

ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی جانب پیش قدمی کے ہر مرحلے پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اختلافات شدت اختیار کرتے گئے اور ان کے درمیان عدم موافقت کی طبع وسیع تر ہوتی گئی۔ اس معاملے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس کش مکش کے اصل فرق ہندو اور مسلمان تھے۔ ہندوؤں کی واضح اور بھاری اکثریت کے باعث عیسائی، سکھ اور پارسی وغیرہ چھوٹے فرقے قدرتی طور پر ہندوؤں کی جانب مائل تھے۔ یہ فرقے اکثر صورتوں میں کانگریس کے موڈ پر چلائے جاتے تھے تاہم بعض صورتوں میں ان کا یہ رجحان بادل خواستہ بھی تھا۔



وہ پنج جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان حامل تھی تہذیبی تھی اور اس کو پائنا ممکن نہیں تھا۔ دونوں  
 قومی مذاہب کی بنیاد پر قائم تھیں اور اگرچہ صدیوں کے میل جول سے دونوں کے درمیان کچھ روابط بھی  
 استوار ہو گئے تھے مگر یہ بہت معمولی نوعیت کے تھے۔ اور ان کا باعث بھی صرف یہ تھا کہ ہندوؤں سے مسلمان  
 بن جانے والے لوگ اپنی بعض روایات پر ابھی تک عمل پیرا تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ بھی  
 ہندو روایات چھوڑ رہے تھے۔ ہر جگہ وہ دونوں قوموں کے درمیان کسی نوعیت کا کام دیتے۔

ہندو تہذیب کے مقابلے میں مسلمان تہذیب کو "کشادہ" تہذیب کا نام دیا جاسکتا ہے۔  
 ہندو تہذیب نہ صرف "بند" پیکر کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ مسلمانوں کے خلاف اسے دوسرے طور پر مفضل تہذیب  
 کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ ذات پات کا نظام قدامت پرست ہندو معاشرے کو شدید تعصب سے  
 بھرپور مختلف شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کے باوجود ان شعبوں کا عجیب نوعیت کا مربوط نظام باہر  
 کے کسی آدمی کے لئے ناقابلِ فہم اور پریشان کن تاثرات کا حامل ہے۔ سخت تفریق کے باوجود ہم  
 ذاتیں بہر حال ہندو مت کے اندر مربوط ہیں۔ یہاں تک کہ اچھوت بھی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے  
 تمام تر تعصبات کے باوجود اسی نظام کا ایک ناقابلِ تفریق حصہ ہیں۔ ہندو معاشرے کی بنیاد رکھی  
 گئی ہے۔

سماجی مفاد کے لئے سکھوں کو شمالی ہندوستان میں ہندوؤں کے رشتے کے بھائی کہا جاتا ہے۔  
 یہ اور بات ہے کہ سکھ خود کو ہندوؤں کے ساتھ اس قسم کے کسی رشتے میں منسلک نہیں سمجھتے۔ سکھ ایک  
 منظم فرقہ ہیں۔ تاہم شہروں میں ایسے سکھ گھرانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے جن کے کچھ افراد ہندو  
 ہیں اور کچھ سکھ۔ یہ لوگ باقی باشندوں کی طرح عام ثقافتی اقدار کی پابندی کرتے ہیں۔

نریشیت کے پیروکار پارسی ایک مربوط مذہبی اور تہذیبی گروپ کی حیثیت سے ہندوستانی میشت  
 کے صنعتی اور تجارتی شعبہ میں احترام کی نگاہ سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر ان کی  
 حیثیت ان کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے جیسے کہ برطانیہ میں یہودیوں کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔  
 عیسائیوں کو اب وہ خاص حیثیت حاصل نہیں ہے جو ہندوستان کے حکمرانوں کے ہم مذہب  
 ہونے کے باعث کبھی ہوا کرتی تھی۔ آزادی کے بعد سے عیسائیوں نے ملک کی اکثریت یعنی ہندوؤں  
 کے ساتھ اپنا زیادہ سے زیادہ تشخص قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کم از کم سیاسی نقطہ نظر سے اور



جزع کے اندر مختلف تحریکوں کے نتیجے میں انہیں ہندوستانی نظام میں ایک مضبوط اور خود مختار حیثیت حاصل کرنے میں مدد ملی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں عیسائیوں کو سر لحاظ سے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا موقع ملا ہے۔ تاہم مشرقی سرگرمیوں اور مستقبل کے امکانات کے لحاظ سے عیسائی پاکستان میں ہندوستان کی نسبت زیادہ خوش ہیں۔ سیاسی لحاظ سے وہ ہندوستانی صوبے کے رالہ میں زیادہ مضبوط پوزیشن میں ہیں۔ جہاں ان کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ وہاں یہ لوگ کیونز م کے علیہ دار بن کر ابھرے ہیں اور انہیں ایک سے زائد بار کے رالہ کی صوبائی حکومت بنانے اور چلانے کا موقع ملا ہے۔ تاہم ایسا غلط عرصہ کے لئے ہوا ہے اور وہ بھی دوسری جماعتوں کے ساتھ سیاسی اتحاد کے باعث۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تقابلی پوزیشن کے پیش نظر حکومت خود اختیاری کے واسطے میں مستقبل کے لئے دونوں قوموں کے ذہن میں شکوک و شبہات موجود تھے۔ مسلمانوں کے مذہب کی بنیاد کو سمجھنا زیادہ آسان تھا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک آبادی کے لحاظ سے صرف پنجاب میں مسلمانوں کو معمولی اکثریت حاصل تھی شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان م کو کے براہ راست کنٹرول میں آتے تھے اور سندھ صوبہ ممبئی کا حصہ تھا۔ بنگال میں بھی مسلمان اقلیت میں تھے۔ تاہم ان کی تعداد ہندوؤں کے تقریباً برابر تھی۔ ہندوستان کے باقی تمام صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے اور اسی وجہ سے انتظامیہ میں ان کا عمل دخل بہت کم تھا۔ تجارت و صنعت میں ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ جہاں برطانوی اور غیر مسلم لوگوں کو اجارہ داری کی سی کیفیت حاصل تھی۔ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد جن میں پنجاب کے لوگ بھی شامل تھے، مسلح افواج میں تھی۔ اس کی وجہ ان لوگوں کی ابھی صحت اور جنگی صلاحیتیں تھیں۔ ان حالات میں حکومت خود اختیاری کا مطلب مسلمانوں کے لئے مسلسل ہندو غلبے کے سوا کچھ نہیں تھا جس کے تمام تر منفی نتائج کا سامنا انہیں کرنا پڑتا۔

کیا ہندوؤں کے لئے بھی خدشہ کی کوئی بنیاد تھی؟ اس قسم کا اندیشہ جس کا ہندوؤں کو بخوبی احساس تھا صرف بنگال میں تھا۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ تاہم بنگال کے ہندو اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ وہ صوبے کی ہر چیز پر پھیلے ہوئے تھے اور مستقبل قریب میں انہیں اس صورت حال کے تبدیل ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ لارڈ ڈرزن



کی تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) کے باعث ایک نیا صوبہ وجود میں آیا جو مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل تھا جس کا صدر مقام ڈھاکہ تھا۔ مسلمانوں نے اس پر اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اس کو تشکیل شدہ صوبے میں مسلمان واضح اکثریت میں تھے۔ اس تقسیم پر بنگال کے ہندوؤں نے وہ فساد اور ہنگامہ کھڑا کیا کہ بالآخر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال منسوخ کر دی گئی۔

ہندو مسلم آویزش سے قطع نظر بنگال ہمیشہ باقی ہندوستان کے لئے مشکل مسئلہ بنا رہا ہے۔ یہ صورت حال برطانیہ کی ہندوستان میں آمد سے پہلے بھی تھی جو برطانوی دور میں بھی برقرار رہی اور یہ آج بھی جوں کی توں ہے۔

لارڈ کیمز نے کلکتہ میں ایک عرصہ مقیم رہے۔ بنگالی ہندو کے ذہن اور کردار کے بارے میں ان کا بیان بلاشبہ تصحیح آمیز ہے مگر اس خاکہ کشی کو سنجیدگی کے ساتھ عام پبلک کے سامنے پیش کرنے پر اسے یقیناً کسی ایسی چیز نے اُکسایا ہوگا جو ان کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ کہتے ہیں :-

”کسی انگریز کے لئے جیسا کوئی اطالوی ہوتا ہے، جیسا اطالوی کے نزدیک ہندو ہوتا ہے اور عام ہندو جیسا کسی بنگالی کو سمجھتے ہیں ویسا ہی بنگالی ہندو کو دیگر بنگالی سمجھتے ہیں۔ بنگالی (ہندو) کی جسمانی صحت کمزور بلکہ قحط زدہ شخص کی سی ہوتی ہے۔ وہ مسلسل ہونے والی بارش میں بھیگا رہتا ہے۔ اس کی خواہشات ایک جگہ بیٹھے بیٹھے سب کچھ حاصل کرنے پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس کے اعضا ناتواں اور حرکات کسی اندرونی جسمانی درد کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ صدیوں سے ولیہ اور طاقتور نسل کے انسانوں کے پاؤں میں روند جاتا رہا ہے۔ ہمت، آزادی اور سچائی جیسی خوبیوں سے اس کا منشور اور ریختہ یکجہرا آتش ہے۔ اُس کا ذہن اُس کے جسم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اندر یہ بے چارگی کی آخری حد تک کمزور ہوتا ہے۔ اس میں مردانہ مزاحمت مفقود ہوتی ہے مگر اس کی پٹک اور عیاری شدید آب و ہوا والے اس خطے کے باشندوں کو خوشامد پر اُکساتی ہے جو بہر حال نفرت سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ تمام طور طریقے جو کسی بھی کمزور قوم کے تمدنی دفاع کے ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے ہیں وہ اس نسل کے لوگوں میں عام ہیں۔ یہاں تک کہ یہ (بنگالی ہندو) لوگ اس معاملے میں پہلی دوسری صدی عیسوی کے یونانی اور تاریک عہد کے یہودیوں سے بھی آگے ہیں۔ بیٹھنے کے لئے سینگ، شیر کے لئے بچہ، شہد کی مکھی کے لئے ڈنک اور قدیم یونانی گیت کے مطابق عورت کے لئے سخن جو حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے، بنگالی کے لئے دھوکہ دہی عین اُسی حیثیت کی حامل



ہوتی ہے خوش آمد و عشرے، دلفریب بہانے، حالات کے نانے بانے سے بنی ہوتی فریب کاریاں اور جھوٹ، عیاری، جھوٹی قسمیں اٹھانا اور جھلساری زیریں گنگا کے خطے میں آباد لوگوں کے دماغی اور جارجانہ ہتھیار ہیں۔ (میکالے، ایسے آن وارن ہینٹنگٹن)

بنگالی ہندو کو تشویش صرف یہ تھی کہ اس کے مسلمان مزارعین کو اس کے پیچھے استحصال سے نکالا نہیں جانا چاہیئے تھا تاہم یہ تشویش زیادہ شدید نہیں تھی کیونکہ اس قسم کا واقعہ عملاً کبھی پیش نہیں آیا تھا۔ ہندوؤں کے اندیشے کے پیچھے کارفرما بنیادی عنصر کی تاریخی اور جغرافیائی وجہ تھیں۔ گزشتہ ساڑھے چار سو سال کے دوران شمالی ہندوستان وسطی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں کی بلیکارا نشانہ بنتا رہا۔ یہ سلسلہ سو پلوں صدی کے وسط تک جاری رہا تھا جب مغل بادشاہوں نے شمالی ہندوستان کو فتح کر کے ہندوستان پر دو سو سال تک اپنا تسلط برقرار رکھا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کو پہنچنے تک شمالی ہندوستان کی ایک چوتھائی سے زائد آبادی اسلام قبول کر چکی تھی اور تہذیبی تبدیلی کا یہ عمل برطانوی دور حکومت میں بھی جاری رہا تھا اور اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ اسلام کا اثر آہستہ آہستہ مگر تسلسل کے ساتھ پورے ہندوستان میں مختلف رفتار اور شدت کے ساتھ جاری رہا تھا۔

ہندو انتظامیہ کا مقصد اسلام کی اس تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی لہر کو نہ صرف روکا تھا بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے اسے واپس لوٹانا بھی تھا۔ ہندوؤں کو خدشہ تھا کہ اسلام کے اس سیلاب عظیم کا اصل مرکز ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ تھا جس پر افغانستان، ایران اور ترکی کے اثرات غالب تھے۔ پنجاب کے ایک ہندو لیڈر لالہ لاجپت رائے نے بنگال کے ایک معروف ہندو لیڈر مسٹر سی آر اس کے نام ۱۹۲۰ء کے عشرے کے آخری برسوں کے دوران ایک خط میں لکھا :

”میں سات کروڑ مسلمانوں سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے علاوہ افغانستان، وسطی ایشیا، عرب، میسوپوٹیمیا اور ترکی کے مسلح حملے سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔“

(بحوالہ فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد دوم صفحہ ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳



بن گئی۔ یہ وہ صورت حال تھی جو شمالی ہندوستان کے ہندو کے لئے سو مان روح بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایمان کی واحد وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور دوسرے یہ کہ شمالی ہندوستان سمیت ہندو پورے برصغیر میں ہر شعبہ زندگی پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے صنعت و تجارت، ہنگام، قرضوں کی فراہمی، تعلیم، عرص سب شعبوں پر ہندو چھائے ہوئے تھے اور کوئی مسلمان خواہ وہ کتنی ہی جہد و جہد اور محنت کیوں نہ کر لے ان شعبوں میں سے کسی میں قدم نہیں جما سکتا تھا۔ صرف زراعت میں مسلمان اپنی کفالت کر سکتا تھا بشرطیکہ اسے گاؤں کے مہاجن سے جو اکثر ہندو ہی ہوتا تھا، نجات دلائی جاسکے۔ یہ صورت حال صدیوں تک برقرار رہی حتیٰ کہ ۱۹۰۱ء میں پنجاب لینڈ ریٹی ایکٹ نافذ ہوا جس کے تحت مزدور زمین کسی حالت میں بھی کاشت کار سے غیر کاشت کار کو منتقل نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ ہی اسے کسی عدالت کے فیصلے کے تحت ضبط کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک خالص معاشی اقدام تھا جس کا مقصد تمام کاشت کاروں کو خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم سود خور مہاجنوں کے مظالم سے نجات دلانا تھا۔ مگر یہ صوبے کے مسلم اور غیر مسلم عوام کے درمیان جھگڑوں کی بنیاد بن گیا۔

پنجاب یونیورسٹی اور اس سے متعلقہ ادارے غیر مسلم کنٹرول میں تھے اور یہ لوگ انہیں اکثر خالصتاً غیر مسلم مفادات کے لئے پروئے کار لاتے رہتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کے لئے دہری رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رکاوٹیں شدید تر ہوتی گئیں۔ موجودہ صدی کے دوسرے عشرے میں آئینی اصلاحات کی مانٹیکو، چیمسفورڈ سیکم نافذ کی گئی جس سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچا۔ اس نظام کے تحت پنجاب کے پہلے وزیر تعلیم سر فضل حسین (۱۹۲۱-۱۹۲۲ء) نے کچھ انتظامی اقدامات کے ذریعہ سرکاری تعلیمی اداروں میں مسلمان طلباء کے چالیس فیصد داخلوں کو یقینی بنایا۔ ان میں عام تعلیمی اداروں کے علاوہ ٹیکنیکی اور پیشہ وارانہ تعلیم کے ادارے بھی شامل تھے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اس وقت پنجاب کی آبادی کا ۵۵ فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایک اعتدال پسندانہ اقدام تھا مگر اس پر بھی غیر مسلموں نے ہر مرحلے پر اسے سختی کے ساتھ چیلنج کیا۔

ہندوؤں کی مسلم دشمنی کا سب سے تلخ خمر یہ مسلمانوں کو انصاف کے شعبہ میں کرنا پڑتا تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے کہ تمام ہندو جو ڈیشل آفیسر متعصب نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض غیر جانبداری کا شافی مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس تمام مسلمان جج بھی بدعنوانوں



سے پاک نہ تھے۔ تاہم ۱۹۱۹ء کے بعد اس شعبہ کا سرچشمہ تیزی سے بدعنوانیوں میں مٹوٹ ہوتا گیا۔ اور پندرہ سال کے عرصہ میں ساری صورت حال بدل گئی۔ ایک بے حد لائق مگر انتہائی مستعجب ہندو کو لاہور ہائیکورٹ کا چیف جسٹس مقرر کر دیا گیا۔ اس کے عہد میں کوئی مسلمان انصاف کے حصول کے لئے اس ہائی کورٹ سے اعتماد کے ساتھ رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ کئی برطانوی اور ہندوستانی جج دیاننداری کے ساتھ اپنے عہد کے حلف کو نبھارہے تھے۔ مگر انہیں ایسا کرنے سے روکنے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کیے جاتے تھے۔ ہائیکورٹ کا ماحول پراگندہ ہو چکا تھا اور ماتحت عدالتوں پر دباؤ ڈالا جاتا تھا۔ جوڈیشل کیمڈر کو ہائی کورٹ کا چیف جسٹس کنٹرول کرتا تھا جوں کی ترقی اور دیگر معاملات پر اسے کامل اختیار حاصل تھا۔ اس کی حمایت انصاف کے شعبہ میں ملازمت کے تحفظ اور ترقی کی ضمانت تھی اور اس کی ناراضگی صریحاً نقصان کا باعث بن جاتی تھی۔

چیف جسٹس ہائی کورٹ پنچ میں تقریروں کو بھی کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے دور میں صرف ایسے مسلمانوں کو ہائی کورٹ کے پنچ میں شامل کیا جاتا رہا جو اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔ دو مواقع پر مسلمان ججوں کا تقرر صوبے کے باہر سے کیا گیا حالانکہ پنجاب میں اس وقت بھی قابل لوگوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ مسلمانوں میں اچھے سے اچھے وکیل موجود تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی اس اہلیت کا حامل نہ تھا جسے ہندو چیف جسٹس ہائی کورٹ کے پنچ میں شمولیت کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔ مبادا اس بات کو غیر ضروری مبالغہ سمجھا جائے۔ یہاں ہم آپ کی توجہ ایک دوسری ٹھوس صورت حال کی جانب مبذول کراتے ہیں جس کی ہر تفصیل کی تصدیق ریکارڈ سے کی جاسکتی ہے اور یہ مندرجہ بالا واقعات سے کہیں زیادہ حیران کن ہے۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں اس چیف جسٹس نے لاہور ہائیکورٹ پنچ میں مستقل حیثیت سے تقرر کے لئے باقاعدہ سودے بازی کی۔ اس طرح اس نے چار ایڈیشنل ججوں کو ان کے حق سے محروم کر دیا جن میں مسٹر جسٹس ٹیک چند بھی شامل تھے۔ جو بلاشبہ ایک لائق اور پنچ کے سب سے زیادہ باصلاحیت جج تھے بلکہ لاہور ہائی کورٹ یا کسی بھی دوسری ہائی کورٹ میں ان جیسا قابل جج موجود نہ تھا۔ مسٹر جسٹس ٹیک چند کا عرصہ ملازمت سترہ طویل برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان برسوں کے دوران انہوں نے ایسا شاندار ریکارڈ قائم کیا جس کا مقابلہ لاہور ہائیکورٹ یا کسی بھی ہندو ملک کی ہائیکورٹ نہیں کر سکتی۔ اس ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آنریبل جج کے



مرصہ ملازمت کے دوران خواہ وہ تنہا مقدمہ کی سماعت کرتا یا پنچ میں شامل ہو کر کسی ایک مقدمہ کا فیصلہ بھی کسی مسلمان کے حق میں نہیں کیا گیا۔ جبکہ مقدمہ کا دوسرا فریق غیر مسلم تھا۔ نہ اس نے دو مسلمان فریقوں کے درمیان کبھی ایسے فریق کے حق میں فیصلہ کیا جس کا وکیل مسلمان تھا۔ اس صورت میں فیصلہ اس مسلم فریق کے حق میں کیا جاتا جس کا وکیل غیر مسلم ہوتا۔ مؤخر الذکر حالات میں غیر مسلم وکیل اپنے مسلمان مؤکلوں سے بھاری فیس لیتے اور اس کے ساتھ یہ ضمانت بھی فراہم کرتے کہ اس کیس کی سماعت مسٹر جسٹس ٹیک چنڈ کریں گے اور اگر پنچ سماعت کرے گا تو مسٹر ٹیک چنڈ اس میں شامل ہوں گے اور کیس کا فیصلہ غیر مسلم وکیل کے حق میں کیا جائے گا۔ یہ گارنٹی کبھی ناکام نہیں ہوئی۔

جب اس کی لاہور ہائی کورٹ پنچ سے ریٹائرمنٹ کا وقت نزدیک آیا تو اسے ایک ذاتی نوعیت کی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق کسی بھی ہائی کورٹ کے پنچ سے ریٹائر ہونے والا جج ہائی کورٹ اس کی کسی ماتحت عدالت یا فیڈرل (سپریم) کورٹ میں وکالت نہیں کر سکتا تھا۔ مسٹر جسٹس ٹیک چنڈ نے اپنی اس مشکل کا ذکر فیڈرل کورٹ کے ایک مسلمان جج سے کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ فیڈرل کے چیف جسٹس اور ان کے رفقاء کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ جسٹس ٹیک چنڈ کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس مسلمان جج کی کوشش سے یہ شرط نرم کر دی گئی تاکہ وہ لاہور ہائی کورٹ پنچ سے ریٹائر ہوئے کے بعد سپریم کورٹ میں وکالت کر سکیں یا اپنی مرضی کا کوئی دوسرا کام کر سکیں۔

اُس کے آخری چند برسوں کے بارے میں مسٹر جسٹس مہر چند ہاجن کہتے ہیں:

”جن دنوں میں ۱۹۵۲ء کا موسم گرما اپنے بالائی دھرم سالہ ماؤس میں گزار رہا تھا تو مجھے بخشی ٹیک چنڈ کا ایک جذباتی خط ملا۔ میں ان کے لاہور میں واقع گھر میں اپنے سکول اور کانجے کے دنوں میں قیام پذیر رہا تھا۔ وہ نہ صرف لاہور کے ایک سرکردہ وکیل تھے بلکہ لاہور ہائی کورٹ کے قابل ترین ججوں میں شمار ہوتے تھے۔

بعد ازاں وہ ممبر پارلیمنٹ بھی بنے اور مختلف ذیلی کمیٹیوں میں بھی شامل رہے جنہوں نے ہندوستان کے آئین کی تیار می میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اب موسم گرما لاہور میں گزار رہے تھے جہاں سے انہوں نے مجھے خط لکھا تھا کہ میں جب بھی کسی دوست سے ملتا ہوں تو زبانی مجھے ایسا کہوں



نفسوں ہوتا ہے کہ میں اب اس دوست سے دوبارہ نہیں مل سکوں گا۔ اس خط کے بعد ان پر مسکتے کے مرض کا حملہ ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی حالت بہت اتر ہو گئی اور وہ گزشتہ پانچ برس سے اسی حالت میں ہیں۔ انہیں اس بے چارگی اور کمپرسی کے عالم میں دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ وہ شخص جس نے ایک صحت مند اور خوش باش زندگی گزاری۔ جو بار اور پنج دونوں میں اعلیٰ ترین پوزیشن کا حامل رہا جس نے اپنی قوم کی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ خدمت کی اور جس کا دل اپنے بھائیوں کی مشکلات پر ہمیشہ کھل جاتا تھا۔ آج کیسی بے چارگی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا سربستہ راز ہے جسے کوئی حل نہیں کر سکا۔

(”گلنگ بیک“ صفحہ ۲۰۸-۲۰۷)

ہندو مسلم کش مکش پنجاب میں شدید تر تھی اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی کم و بیش شدت کے ساتھ موجود تھی۔ مسلمان آئینی طور پر اپنے تحفظ کے لئے کوشاں تھے۔ جبکہ ہندوؤں کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کو مغلوب قوم کی پوزیشن میں لے جایا جائے اور پھر انہیں وہیں رکھا جائے۔ ۱۹۲۰ء کی مائیکوچیمس فورڈ اصلاحات کی سکیم کے مطابق صوبوں کو دو عملی نظام کے تحت ایک خاص حد تک خود مختاری دی گئی تھی۔ یہ نظام مختلف صوبوں میں مختلف حد تک کامیاب ثابت ہوا۔ پنجاب میں اس نظام کی بغیر معمولی مثال قائم ہوئی جہاں سرفضل حسین جیسی شخصیت کی رہنمائی میں مسلم عوام کے سیاسی شعور پر مستقل نوعیت کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ انہیں پنجاب میں دس سال اور مرکز میں پانچ برس تک اعلیٰ سرکاری عہدوں پر کام کرنے کا عملی تجربہ حاصل تھا۔ یہ سرفضل حسین کی سیاسی تیز فہمی، غلصہ جہاد اور محتاط رہنمائی کا نتیجہ تھا کہ لندن میں ۱۹۳۲-۱۹۳۰ء کے دوران منعقد ہونے والی گول میز کانفرنسوں اور ۱۹۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مشترکہ سلیکٹ کمیٹی میں مسلمانوں کے نمائندوں نے ہر آئی ٹیس آغا خان کی قیادت میں اپنے موقف کی بھرپور انداز میں نمائندگی کی۔ ان مباحث کے نتیجے میں جو سکیم سامنے آئی اور جسے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نام دیا گیا۔ اس میں مسلمانوں کی پوزیشن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے مقابلے میں بڑی حد تک بہتر اور مضبوط ہو گئی۔ جہاں تک صوبائی بجاس قانون سازی میں نمائندگی کا معاملہ تھا تو اس سلسلے میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ پیش رفت بنگال کے صوبے میں کی۔ اس سے قبل کے ایکٹ (۱۹۱۹ء) کے تحت



مسلمان بنگال میں مجلس قانون سازی کی عمومی نشستوں کا صرف چالیس فیصد حاصل کر سکتے تھے۔ مگر اس میں مخصوص نشستوں کی ایک خاصی بڑی تعداد مقرر کیے جانے کے باعث جن پر قبضہ کرنے کا مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ان کی حقیقی نمائندگی صرف اٹھائیس فیصد رہ جاتی تھی۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت بنگال کی مجلس قانون سازی میں مسلمانوں کی عمومی نمائندگی کی شرح ۸۲.۸ فیصد تک جا پہنچی۔ پنجاب مجلس قانون سازی میں مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی معمولی اکثریت حاصل تھی تاہم صوبہ سرحد اور سندھ میں مسلمانوں کو صوبائی مجالس قانون سازی میں اطمینان بخش اکثریت حاصل تھی۔

اب ہر طبقہ خود کو مرکز میں برطانیہ سے ہندوستانیوں کو اقتدار کی منتقلی کے لئے تیار کر رہا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس اپنے قومی شخص کو ثابت کرنے کی سرگودھا کوشش کر رہی تھی جس کا دعویٰ اس کے بیدادی اصولوں میں شامل تھا۔ تاہم شمال مغربی سرحدی صوبے کے سوا جہاں کانگریس کو معمولی سی حمایت حاصل تھی مسلم اکثریت کے کسی صوبے میں اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے برعکس محمد علی جناح کی بھرپور قیادت جو ایک وقت میں کانگریس کے سرگرم رکن ہی نہیں بلکہ بڑی منزل بھی رہ چکے تھے، اب مسلم لیگ کی اوجھلے نوک کا کام جاری تھا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں اقلیتوں کے لئے جو دو تحفظات میں سے ایک تحفظ یہ بھی تھا کہ صوبائی گورنر جو اپنے وزراء کے مشورے پر چلنے کے پابند تھے انہیں اس بات کے خصوصی اختیارات حاصل تھے کہ وہ کسی اقلیت کے مفادات کے تحفظ کے لئے وزارت کے مشورے کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبوں میں پہلے عام انتخابات ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوئے جن کے نتیجے میں کانگریس نے سات غیر مسلم اکثریتی صوبوں میں کامیابی حاصل کی مگر اس نے صوبائی گورنروں کو اقلیتوں کے تحفظ کے لئے حاصل اختیارات کا بہانہ بنا کر ان صوبوں میں حکومتیں قائم کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ گورنروں کو اقلیتوں کے بارے میں حاصل خصوصی اختیارات کے باعث ان صوبوں میں کانگریس کی پالیسیاں موثر ثابت نہیں ہو سکیں گی اور نہ ہی وہ قانون سازی کا کام اپنی منشا کے مطابق کر سکے گی۔ اس کے باعث ایک تعطل رونما ہوا جو چند مفتوں کے بعد بالآخر اس انہام و تقسیم پر ختم ہوا کہ صوبوں کے انتظام میں گورنر اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں خصوصی اختیارات کو استعمال نہیں کریں گے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو بحیثیت اقلیت حاصل شدہ تحفظات سے محروم کرنا تھا۔ جو مسلمانوں کے لئے بڑی حد تک اطمینان کا باعث تھے مگر کانگریس کے ساتھ برطانوی حکومت کی اس انجام



تفہیم کے بعد مسلمان عملاً اس تحفظ سے محروم ہو گئے۔

اس طرح ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی ایک لحاظ سے علیٰ تنبیح کے بعد کانگریس ان صوبوں میں حکومتیں بنانے پر رضامند ہوئی جن میں اسے اکثریت حاصل تھی۔ ایک آئینی تحفظ سے محروم کئے جانے کے بعد شکستہ دل مسلمانوں کو توقع تھی کہ اب کانگریس اس بات کی متمنی ہوگی کہ مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے ہندو اکثریتی صوبائی حکومتوں میں انہیں شمولیت کی دعوت ضرور دی جائے گی۔ مگر کانگریس نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ کانگریس نے وزاری تہمدوں پر مسلم لیگ سے مسلمانوں کے نمائندوں کے تقرر پر رضامندی ظاہر کی بشرطیکہ وہ کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ اس کا سبب ہا مطلب یہ تھا کہ ایسے مسلم نمائندے جو نہی وزارت کی پیش کش قبول کریں گے مسلم لیگ سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس قسم کی پیش کش مسلم لیگ کے لئے قطعی ناقابل قبول تھی جس کا صاف مقصد ہندو اکثریت کے ان صوبوں میں مسلم لیگ کو عملاً ختم کر کے اسے کانگریس میں ضم کر دینا تھا۔

تاہم ایک راستہ ابھی کھلا تھا۔ اگر کانگریس یہ سمجھتی تھی کہ اقلیتوں کے تحفظ کے سلسلے میں گورنروں کو حاصل اختیارات اس کے نزدیک نا انصافی کی بات تھی جسے قبول کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس صورت میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہر صوبے کا وزیر اعلیٰ اپنے صوبے میں اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کا ذمہ دار ہو۔ اور کانگریس کو مسلم اکثریتی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ سے بھی اسی قسم کے تحفظات کی فراہمی کی اُمید کرنی چاہئے تھی۔

اگر اس قسم کا کوئی اعلان ہو جاتا جس کے تحت مختلف صوبوں میں ہندو اور مسلم اکثریتوں کے مفادات کو تحفظ فراہم کیا جاسکتا تو برصغیر کی سیاسی تاریخ کا اندازہ ہی کچھ اور ہوتا۔ راقم الحروف کو یاد ہے جب اس نے لگ بھگ تیس سال قبل ایک کٹر مسلمان کانگریسی کو سامنے ایسی تجویز پیش کی تھی تو اس نے جواب میں کہا تھا ”تم بہت سادہ لوح ہو تم ہندو سے انصاف پسندی اور کشادہ دلی کی امید رکھتے ہو۔ چنانچہ ہندو مسلم مفاہمت کا یہ موقع نہ صرف گنوا دیا گیا بلکہ کانگریسی وزارتوں نے مختلف ہتھکنڈوں اور سیاسی پالیسیوں سے ہندو اکثریتی صوبوں میں ایسی فضا پیدا کر دی کہ مسلمانوں کو جلد ہی کانگریس کے سیاسی تسلط اور ہندو غلبے کا شدت کے ساتھ احساس ہونا شروع ہو گیا۔

دوسری عالمی جنگ کے باعث بالواسطہ طور پر مسلمانوں کو ذرا دم لینے کا موقع ملا۔ گورنر جنرل ہند



نے اتحادیوں کی حمایت میں ہندوستان کی جنگ میں شمولیت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ کانگریس نے اس فیصلے سے اس بنیاد پر اختلاف کیا کہ ایسے اہم معاملے کے بارے میں مرکزی مجلس قانون ساز کی رائے لینا ضروری تھا۔ چنانچہ کانگریس نے صوبوں میں وزارتوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کانگریس کے اس اقدام پر مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کا اظہار ”ایم نجات“ مناکر کیا گیا۔ صوبوں میں کانگریس کا اقتدار (۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۹ء) مسلم لیگ کو پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی حمایت فراہم کرنے کا باعث بنا اور برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہو گئی۔

اس سلسلے میں ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“ کا معنیف رقمطراز ہے:

”۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان بکر ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان بہت سے ایسے واقعات رونما ہو چکے تھے جن کے باعث ہندوستان میں درج ذیل بات کے ساتھ ایک قومی حکومت کے قیام کا کام بے حد مشکل ہو چکا تھا۔ پہلا دھچکا کانگریس کا وہ طرز عمل تھا جو اس نے اپنے حکومتی صوبوں میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد روا رکھا تھا۔ اس کے بعد دوسری عالمی جنگ اور اس کے نتائج ہندوستان کی متحدہ شکل میں آزادی کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے۔ صوبائی حکومتوں سے کانگریس کی علیحدگی، اس کی جانب سے کرپس پشکیش ”کوستر کیا جانا اور اس کی ”ہندوستان چھوڑو تحریک“ نے اس کے مقاصد کو سالہا سال پیچھے ڈال دیا۔ جس کا اس کے مخالفین کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا جن میں مسلم لیگ سرفہرست رہی ہے۔“ (صفحہ ۵۲۶)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے محمد علی جناح کے زیر صدارت لاہور کے تاریخی اجلاس میں ہندوستان کے آئندہ آئینی دھچکے کے بارے میں ایک قرارداد منظور کی جس کا اہم بیڑا حسب ذیل ہے:

”اے اے اسلام لیگ کا یہ اجلاس پورے غور و فکر کے بعد فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی بھی آئینی پلان اس ملک میں قابل عمل یا مسلم لیگ کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا تا وقتیکہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہ ہو:

یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے ملحقہ یونٹوں کا ضروری علاقائی تزامیم و اضافوں کے بعد ایسے علاقوں کی صورت میں از سر نو تعین کیا جائے گا جن میں مسلمان عددی لحاظ سے اکثریت میں ہیں جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں ہے۔ آزاد ملکوں کی تشکیل کے لئے ان یونٹوں کے گروپ بناتے جائیں گے جن کے اندر یہ یونٹ خود مختار ہوں گے اور انہیں خود اختیاری کے حقوق حاصل ہوں گے۔“

یہ قرارداد بنگال کے وزیر اعلیٰ سٹر اسے کے فضل الحق نے پیش کی۔ کانگریس کا فوری رد عمل اس



کو تشکیک کا نشانہ بنانا تھا۔ انہوں نے اسے مطالبہ پاکستان کا نام دیا۔ حالانکہ مسلم لیگ کے پورے اجلاس میں بحث و مباحثہ کے دوران پاکستان کا نام تک نہیں لیا گیا تھا۔ اس قرارداد کو اپڑھے لکھے مسلمان حلقوں میں بڑا چرچا تھا اور اس کے بنیادی تصور میں بنگال شامل نہیں تھا۔ کانگریسی حلقوں نے لاہور ریزولوشن میں اس کو بھی شامل کر دیا۔ مسلمانوں کو کانگریس کا بہت شکر گزار ہونا چاہیے۔

۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں بٹلر کی فوجوں نے نیدر لینڈ (ہالینڈ) اور بلجیم کو روند کر فرانس پر قبضہ کر لیا۔ برطانیہ کا سقوط قریب سمجھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ خوفزدہ کانگریسی قیادت نے بھی کھلے بندوں برطانیہ اور اتحادیوں کے لئے اپنی ہمدردی اور حمایت کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ تاہم اسی سال خزاں کے موسم تک یہ بات واضح ہونے لگی کہ شدید برطانیہ نازی جارحیت کے خلاف کامیاب مزاحمت کر سکے گا کیونکہ امریکہ بھی اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں کود چکا تھا اور اس سے یہ امید پیدا ہو چکی تھی کہ شاید وہ نازی تسلط کے خلاف مغرب کا نجات دہندہ بن کر سامنے آجائے گا۔ اس پر کانگریسی لیڈروں نے پھر دل کو مضبوط کیا اور جنگ سے لاتعلقی اور عدم تعاون کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ اس بات کا ثبوت نومبر ۱۹۴۰ء میں منمنی بھٹ کے تجویز پر بحث کے دوران مرکزی مجلس قانون ساز کے اجلاس میں ایوان کے لیڈر کی تقریر سے ملاحظہ ہو سکتا ہے اور قانون اور جنگی سپلائی کے محکموں کے وزیر بھی انہوں نے کانگریس کی اس متضاد پالیسی کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ ہی حکومت ہند کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کے بارے میں ایک واضح اعلان بھی کیا۔

برطانیہ کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان کے لئے آئینی طرز حکومت کے متعلق فیصلے کا ستر بجے حد پیچیدہ ہے جس کو جنگ کے دوران حل کرنا بے حد مشکل تھا کیونکہ برطانیہ کی تمام تر سوچ اور کوششوں کا مرکز زندگی اور موت کی وہ جدوجہد تھی جس کے لئے اسے مجبور کر دیا گیا تھا۔ ایوان کے لیڈر نے وائسرائے ہند کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ جنگ کی صورتحال ایسے کسی اعلان کی راہ میں مزاحم نہیں ہے کہ ہندوستان کی آزادی برطانوی پالیسی کا ایک اہم مقصد ہے جس پر موجودہ آئینی ڈھانچے کے اندر وہ کڑھوسا نظامی اقدامات کے ذریعہ عمل کیا جاسکتا ہے۔ وائسرائے نے خود کو اس تجویز کا محرک قرار دیا اور ایوان سے درخواست کی کہ اس مسئلے میں محسوس ممکنہ اقدامات کے لئے انہیں تجاویز پیش کی جائیں۔

انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان کی مرکزی حکومت کا ڈھانچہ بدستور ایٹ انڈیا کمپنی کے اٹھارویں صدی کے ساتویں عشرے کے نظام حکومت سے بڑی حد تک مشابہ تھا جب دارن ہیسٹنگنز



کو ہندوستان کا پہلا برطانوی گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ وائسرائے کی کامیابی اُس وقت اس کا نام گورنر جنرل کی ایجنسی کو کنسل ہو کر ثابت ہو گیا تھا۔ اچھے سولین ممبران کے علاوہ کمانڈر انچیف پر مشتمل ہوتی تھی جو وزیر دفاع ہوا کرتا تھا۔ وائسرائے کو کنسل کے اجلاسوں کی صدارت کیا کرتا تھا۔ فیصلے اکثریت کی بنیاد پر ہوتے تھے۔ برابر ووٹ ہونے کی صورت میں وائسرائے کا ووٹ فیصلہ کن ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر وائسرائے، کمانڈر انچیف اور دو سولین ممبرز کا نقطہ نظر کسی مسئلے پر ایک ہوتا تو معاملہ وائسرائے کے اکثریتی ووٹ سے فیصلے ہو جایا کرتا تھا۔ وائسرائے کو کنسل کی اکثریت کا فیصلہ بدلنے کا اختیار نہیں تھا۔ یہ اختیار برطانوی سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند کے پاس تھا جس کی وساطت سے حکومت ہند برطانوی پارلیمنٹ کو جوابدہ تھی اور وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں کنسل کے متفقہ فیصلے کو بھی تبدیل کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

۱۹۰۹ء تک کنسل کی ممبری صرف برطانوی باشندوں تک محدود تھی۔ پہلا ہندوستانی جو کنسل کا ممبر مقرر ہوا سر ایس۔ پی۔ سینہا (بعد میں لارڈ سینہا آف رائے پور، بنگال) ایڈووکیٹ جنرل بنگال تھا جسے اُس سال کنسل میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں کنسل میں ہندوستانی ارکان کی تعداد بڑھا کر تین کر دی گئی جن میں سے ایک ہمیشہ مسلمان ہوتا تھا۔ پھر پوزیشن یہ ہو گئی کہ اگر کسی مسئلے پر تینوں ہندوستانی ارکان کی رائے ایک ہوتی اور وائسرائے ان سے متفق ہوتا تو وہ مسئلہ وائسرائے کے فیصلہ کن ووٹ کے ذریعہ (اگر اس کی ضرورت ہوتی) ہندوستانی ارکان کی مرضی کے مطابق طے پا جاتا۔ اس طرح وائسرائے کی کامیابی میں بتدریج نسبتاً لبرل رجحان نشوونما پاتا رہا۔ اس کا اظہار وائسرائے لارڈ ولنگٹن (۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۶ء) کے دور میں زیادہ بھرپور انداز میں ہوا جو ہندوستانیوں کے ساتھ بے پناہ اور پُر جوش ہمدردی رکھتا تھا اور جس کے ہاں حکومت میں لبرل رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ اس کے پہلے چار سالہ عہدہ حکومت میں سر فضل حسین وائسرائے کی کامیابی کے مسلم رکن تھے۔ جنگ کی کوششوں میں عدم تعاون کی واضح کانگریسی پالیسی کے باوجود ہندو (جو درحقیقت کانگریس سے اندر ہی اندر مکمل رابطہ رکھتے تھے) اور قوم کی فراہمی کا سب سے بڑا ذریعہ تھے) جنگ کی جدوجہد میں اپنے کاروباری مفادات کے لئے صنعتی اور تجارتی لحاظ سے مکمل تعاون کر رہے تھے۔ اور وزارت جنگی سپلائی ان عناصر کی رہنمائی اور پشت پناہی کرتی تھی۔ فوجی بھرتی والے علاقوں سے بھی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کی کوئی مثال سامنے نہیں آتی تھی۔ تاہم کانگریسی تیادت کی جانب سے جنگی مقاصد کے بارے میں بظاہر جو رویہ سامنے آ رہا تھا اس سے بیرون ملک ہندوستان کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ ہندوستانیوں



کو جنگ میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ایک ایسے بھرپور اقدام کی ضرورت تھی جسے جنگ میں کامیابی کی صورت میں برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کے متعلق اپنے وعدے پورے کرنے کے سلسلے میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

ایگزیکٹو کونسل کے مسلم رکن نے وائسرائے پر زور دیا کہ ان حالات میں کونسل میں اس طریقے سے توسیع کی جانی چاہیے کہ اس میں ہندوستانی ارکان کو اکثریت حاصل ہو جائے۔ وائسرائے کی سفارش پر ستمبر ۱۹۴۱ء سے شاہ برطانیہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور یوں ہندوستانیوں کو ملک کی مرکزی انتظامیہ میں اپنی آواز مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ ہندوستان میں برطانوی تجارتی مفادات کے ایک نمائندہ سر ایڈورڈ مینٹل کو بھی اس توسیع شدہ کونسل میں شامل کیا گیا۔

کونسل میں توسیع کے ایک سال کے دوران اسی مسلمان نے وہ (جس نے اس اثنا میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے بیج میں نشست قبول کر لی تھی) وائسرائے کو ایک یادداشت ارسال کی جس میں اس نے پُر زور انداز میں سفارش کی کہ وقت آگیا ہے کہ وائسرائے کی کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں اور کونسل کو کابینہ کی حیثیت سے ایسی افہام و تفہیم کے ساتھ کام کرنا چاہیے کہ برطانوی سیکرٹری آف سٹیٹ ہندوستان کے دفاع کے علاوہ کونسل کے منظور شدہ کسی بھی معاملے کو ویٹو نہ کرے۔ وائسرائے نے یہ یادداشت برطانوی سیکرٹری آف سٹیٹ کو مجبوری اور سیکرٹری آف سٹیٹ نے یادداشت کے مصنف کو صلاح مشورے کے لئے لندن طلب کر لیا۔ یادداشت کا مصنف جنوری ۱۹۴۲ء میں لندن پہنچا اور مارچ کے پہلے مہینے تک وہیں مقیم رہا۔

یادداشت میں مذکورہ تجاویز کے بارے میں سر جان اینڈرسن (گورنر بنگال ۱۹۳۲ء-۱۹۳۷ء) لارڈ پریوی سبیل ۱۹۴۳ء اور بعد ازاں لارڈ ویلورلے، سر جیمز گریگ (فنانس ممبر وائسرائے کی کونسل ۱۹۳۲ء-۱۹۳۹ء)، سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنگ ۱۹۴۳ء اور سر فریڈ لائر سٹیوارٹ (مستقل انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند ۱۹۳۰ء-۱۹۳۹ء) نارفوک ہاؤس سینٹ جیمز سکوائر میں ۱۹۴۳ء میں جنگ کے سلسلے میں پیش ڈیوٹی پر رہے) سے تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ ان میں سے ہر شخص نہ صرف اپنے اپنے شعبہ میں نمایاں حیثیت کا حامل تھا بلکہ ہندوستان کے حالات سے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ خیالات کی سنجیدگی اور صحیح قوت فیصلہ کے بارے میں بھی ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ سر جیمز گریگ نے



یادداشت کا ذکر برطانوی وزیراعظم سے کیا۔ وہ وزیراعظم کا پراسٹیوٹ سیکرٹری رہ چکا تھا جبکہ سر سمنٹن چرچل خزانے کا چانسلر تھا اور اسے وزیراعظم کا اعتماد حاصل تھا۔ سر فرنیٹ لارڈ سٹیوارٹ نے سیکرٹری آف سٹیٹ براہ راست ہند کو اس یادداشت اور تجاویز کے بارے میں بریف کیا اور سر جان اینڈرسن نے وزیر خارجہ براہ راست ہند کی ان تجاویز کی کاپی میں حلیت کرنے کا وعدہ کیا۔

یہ شاید جنگ کا سب سے زیادہ اہم اور توجہ طلب ذمہ تھا چنانچہ اس یادداشت پر مشاورت کا کام سسٹم ریزی کے ساتھ جاری تھا۔ مگر بالآخر ایک معاہدہ ہو ہی گیا۔ اگرچہ اس میں بے شمار تجاویز یا تو حذف کر دی گئیں یا ان میں کافی تبدیلی کرنا پڑی۔ یہاں تک طے پا گیا کہ سراسرے راماسوامی دیلار جو اسراتے کی کابینہ کے سینئر ترین رکن تھے اس معاہدہ کے تحت اختیارات اور عہدے کے لحاظ سے ہندوستانی وزیراعظم اور حکومت کے سربراہ ہوں گے، اگرچہ ان کے عہدے کا شائل یا نام مختلف ہو سکتا ہے مگر ان کی حیثیت وزیراعظم کی ہوگی۔ سب باتیں طے ہو چکی تھیں صرف دائرے کی طرف سے حتمی فیصلے کا باضابطہ اعلان ہونا باقی تھا۔ مگر قسمت کا کھماکون ٹال سکتا ہے ہمسٹر گاندھی نے عین وقت وہی اپنے متعدد یاروں سے گئے مرن برت کے لئے چن لیا۔ اس پر دائرے کی کونسل کے تین ہندوستانی ارکان سر جی موڈی (بمبئی) مسٹر ایم۔ ایس۔ اینے (سی پی) اور مسٹر سارکر (بنگلہ) گاندھی کے مرن برت کی حمایت میں کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ دائرے نے اس کو ذمہ داری کے احساس کو نقد ان قرار دیا اور کہا کہ لندن سکیم پر جنگ کے دوران میں ملحد رآمد سے سنگین قسم کے خطرات جنم لے سکتے ہیں۔ ان حالات میں یادداشت کا مصنف اپنے عدالتی فرائض کی بجائے آوری کے لئے واپس پیریم کو رٹ دہی گیا۔

”ہندوستان میں برطانوی حکومت کے علاوہ بھی کچھ باتیں قابل ذکر ہیں۔ خاص طور پر صوبائی لیفٹ گورنمنٹ کے سلسلے میں یہ بات سامنے آئی کہ صحیح سیاسی اقتدار جب بھی کسی کو پیش کیا گیا تو اسے حتمی معنوں میں مسترد کر دیا گیا اور جب اس میں دوسروں کو شریک کیا گیا تو شرکار میں سے کسی ایک نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ نتیجہ بڑی حد تک درست ہے کہ اگر حکومت برطانیہ ہندوستانی اقتدار میں شریک فریقین کو زیادہ اختیارات جلد دے دیتی تو مرکز میں ہندو مسلم اور دوسرے فرقوں کو یکجا رکھنے والی قوتوں کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہوتے اور تقسیم ملک کی ابھرتی ہوئی قوتوں کا پہلے سے سدباب کیا جاسکتا تھا۔

”اگرچہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ ایک عظیم ایکٹ تھا مگر اس کا نفاذ بہت تاخیر سے کیا گیا تھا اور ۱۹۳۹ء



پہلی یہ وقت سے اور بھی بہت پیچھے رہ گیا تھا جب اسے پہلی مرتبہ نافذ کرنے کے متعلق سوچا گیا تھا ہندوستان میں تقسیم اقتدار کے مواقع جو عالمی جنگ کے باعث پیدا ہوتے تھے اور پھر ۱۹۴۰ء میں سامنے آتے تھے جرات مندانہ یا صحیح انداز فکر کے فقدان اور اعلیٰ برطانوی حلقوں میں ہندوستان سے متعلق تھاکن اور احساسات کو نہ سمجھے جانے کے باعث غائب ہو گئے۔“ (بحوالہ: ”دی گریٹ ویلویسٹ“، صفحہ ۵۲۵ - ۵۶۱)

مگراں یادداشت کے مصنف نے بہت نہیں ہاری۔ وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کا صدر تھا جو رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز لندن سے منسلک تھا۔ مصنف نے فروری ۱۹۴۵ء میں انڈین انسٹی ٹیوٹ کے کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں شرکت کرنے والے وفد کی قیادت کی جو کمیٹیم ہاؤس سینٹ جیمز سکوائر لندن میں منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں اس نے عالمی جنگ میں ہندوستان کی جدوجہد اور کردار کے علاوہ اس کی آئینی حیثیت کی مندرجہ ذیل الفاظ میں ترجمانی کی:۔

”۱۹۴۸ء کے بعد سے ہندوستان میں رونما ہونے والی بڑی بڑی تبدیلیوں کا تعلق عالمی جنگ سے ہے۔ جنگ سے ہندوستان میں اس کی مضبوط عسکری حیثیت کا احساس ابھرا ہے خاص طور پر اس قومی عسکری صلاحیت کا احساس بیدار ہوا ہے جو ہندوستان کو خشکی اور سمندر کے اس وسیع و عریض علاقے میں حاصل ہے جو آسٹریلیا اور افریقہ کے معزنی ساحلوں کے درمیان واقع ہے۔ عالمی جنگ کے آغاز ہی میں اپرل ماہ برسے بھی بہت پہلے ہندوستان اس علاقے میں جنگی سپلائی کے لئے ایک اہم مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

”عجاپان کے عالمی جنگ میں اتر پڑنے سے اس معاملے میں ہندوستان کی پہلے ہی سے اہم حیثیت کو مزید تقویت حاصل ہو گئی۔ ہندوستان نہ صرف بنیادی مصنوعات اور خام مال کی فراہمی کے اہم چشموں میں سے ایک رہا بلکہ اس نے اپنی مینوفیکچرنگ صلاحیت اور صنعتی وسائل کو ایسی تیز رفتاری سے جنگ کے مقاصد کے لئے استعمال کے قابل بنایا جس سے وہ اتحادی قوتوں کے لئے دنیا کے اس حصے میں ایک اہم اٹل خانہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔

”اس معاملے میں ہندوستان کی جدوجہد کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ پانچ سال کے دوران وہ ایک مفروض ملک سے قرض خواہ ملک بن گیا ہے جس کی بڑی بڑی رقم سٹرلنگ کی صورت میں اب دوسرے ملکوں پر واجب الادا ہیں۔ افرادی قوت کی فراہمی کے لحاظ سے بھی ہندوستان کی کوششیں



غیر معمولی رہی ہیں۔ کسی قسم کی جبری بھرتی کے بغیر ہندوستان نے پچیس لاکھ افراد جنگی خدمات کے لئے پیش کئے ہیں جن کی اکثریت ہندوستانی آفیسروں کے ماتحت جنگ کے مختلف محاذوں پر شاندار خدمات انجام دے رہی ہے۔ ضرورت پڑنے پر ہندوستان اس تعداد کو دو گنا بلکہ چار گنا تک بھی بڑھا سکتا ہے اور اس صورت میں بھی یہ اس کی کل آبادی کا صرف ڈھائی فیصد ہوگا۔

”دولت مشترکہ کے ممالک کی آزادی اور مستقبل کے امن کے تحفظ کی خاطر ہندوستان نے اپنا کردار بہت سی قربانیاں دے کر ادا کیا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کی معاشی زندگی پر جنگ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں مگر یہ بعض مفید اقتصادی امکانات پر بھی مبنی ہیں۔ جنگی سپلائی اور افرادی قوت کے شعبوں میں تکنیکی لحاظ سے اہم پیش رفت ہوتی ہے اور ہنرمند افراد کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اگرچہ ان دونوں کا معیار اور صلاحیت ہندوستان کی حقیقی ضروریات سے ابھی بہت پیچھے ہے۔

یہ ایک نہایت خوش آئند تبدیلی ہے جو جنگ کے بعد کے برسوں میں ہندوستان کی معیشت کو سنبھال دینے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ مگر جنگ کے اثرات صرف اقتصادی شعبے تک محدود نہیں ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان برطانیہ پر سیاسی انحصار کے معاملے میں تیزی سے بے قراری کی کیفیت میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں سیاسی میدان میں پائی جانے والی بالروسی اور احساس محرومی اس اندیشے کے پیش نظر اور بھی شدید ہوتے جا رہے ہیں جو اسے جنگ کے بعد نظر انداز کئے جانے کے متعلق متوجہ ہیں۔ اس سے متعلق کچھ تجاویز اس کانفرنس میں بھی زیر بحث آنے والی ہیں۔

”اس معاملے میں ہندوستان کی پوزیشن کا جائزہ لینے کے لئے چین کے ساتھ اس کا مقابل کرنا شاید کسی حد تک مفید ثابت ہو سکے گا۔ چین کو آج دنیا کی ان چار بڑی طاقتوں میں شمار کیا جاتا ہے جن پر دوسری عالمگیر جنگ کے بعد انسانی مصائب میں کمی، عالمی امن کے قیام اور تحفظ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آبادی یا رقبہ کے لحاظ سے ہندوستان چین کے مقابلے میں کسی طرح کمتر نہیں ہے۔ ہندوستان آج چالیس کروڑ انسانوں کا مسکن ہے جو دنیا کی کل آبادی کے چھٹے حصے کے برابر ہے۔

”یہاں میری کوشش چین کو کسی لحاظ سے کمتر ثابت کرنا نہیں۔ نہ ہی میں ایک لحظہ کے لئے ہندوستان کی ستائش چاہتا ہوں جس کا وہ گزشتہ آٹھ برس کے دوران جاپانی جارحیت کے مقابلے میں مسلسل مزاحمت کے



باعث مستحق ہے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ بات تسلیم کی جاتے گی کہ قدرتی وسائل اور ان کی ترقی، مینوفیکچرنگ کی صلاحیت، صنعتی استعداد، تکنیکی اور کیمیکل مہارت، سرمایہ کاری، سائنس اور آرٹس کے شعبوں میں بنیادی اور اعلیٰ تعلیم، مواصلات، صحت عامہ اور پیشیوں کی دیگر بھلائی، نظم و نسق اور امن عامہ کے قیام، انصاف اور قانون کے نفاذ اور دیگر بے شمار معاملات میں ہندوستان چین سے کہیں آگے ہے۔ اگرچہ اس کی پوزیشن برطانیہ، امریکہ اور روس کے مقابلے میں کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو پھر وہ کیا معیار ہے جس کے تحت چین کو تو بڑی طاقتوں کی صف میں شامل کیا جاتا ہے مگر ہندوستان اس سے محروم ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ چین قدیم تہذیب کا حامل ہے مگر ہندوستان بھی تو قدیم تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ بلکہ جو چین اس معاملے میں ہندوستانی تہذیب کے چینی کچھ پر اثرات کو قبول کرے گا۔

”ممکن ہے یہ کہا جاتے کہ چین کا دعویٰ اس کی عظیم صلاحیتوں کی بنیاد پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو اس سلسلے میں مجھے ادب کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہندوستان کی صلاحیتیں چین سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان ذات پات اور سماجی طبقات میں بٹا ہوا ہے مگر ہندوستان میں ذات پات اور دوسری اڑبچ پنج چین میں کیولنٹ اور کوتانگ تفریق سے شدید برگر نہیں ہے۔ اپنی تاریخ میں متعدد بار جارحیت کا نشانہ بننے کے باوجود ہندوستان ایک مرتبہ بھی جارح نہیں رہا۔ وہ چین کے مقابلے میں کسی بھی لحاظ سے اس امر کا کم و بیش نہیں ہے کہ اسے بھی دنیا کی عظیم قوموں میں شمار کیا جاتے اور وہ اس حیثیت میں اپنے فرائض ادا کرے جس کا وہ بخوبی اہل ہے۔ کیا ہندوستان اور چین کے درمیان واحد نمایاں فرق صرف یہی ہے کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے چین سیاسی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہے اور ہر قسم کے طوفانوں کے خلاف اپنی آزادی کا تحفظ کر رہا ہے یا کرنے کا عزم رکھتا ہے جبکہ ہندوستان سیاسی لحاظ سے برطانیہ کا دستِ نگر ہے؟“

یادداشت کے مصنف نے اپنی تقریر اس وارننگ کے ساتھ ختم کی:

”دولتِ مشترکہ کے رہنماؤں! کیا آپ کو یہ ستم ظریفی نہیں کھٹکتی کہ ہندوستان کے پچیس لاکھ باشندے جنگ کے مختلف محاذوں پر دولتِ مشترکہ میں شامل اقوام کی آزادیوں کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں مگر وہ خود آزادی کی نعمت سے محروم ہیں۔ آخر ہندوستان کب تک انتظار کرے گا ہندوستان کا سفر جاری ہے۔ آپ اس کی مدد کر سکتے ہیں یا اس کی راہ میں روڑے اٹکا سکتے ہیں مگر اس کا راستہ نہیں روکا جاسکتا۔ ہندوستان



آزاد ہو کر ہے گا دولت مشترکہ کے اندر رہ کر بشرطیکہ آپ نے اسے اس کی جائز حیثیت دے دی اور دولت مشترکہ سے الگ ہو کر بھی، اگر آپ نے اس کے سوا کوئی متبادل راستہ نہ چھوڑا۔“

اسی شام کانفرنس میں شریک ہندوین کے اعزاز میں ملک معظم کی حکومت کی جانب سے کلیر بنجز

ہوٹل لندن میں ڈنر دیا گیا۔ لارڈ کرین بورن نے صدارت کی۔ وزیراعظم کے سوا تو برطانوی کابینہ کے تمام ارکان نے ڈنر میں شرکت کی۔ ان میں لارڈ سائمن، لارڈ چانسلر اور نائب وزیراعظم مٹر اٹلی شامل تھے جو بعد ازاں چھ ماہ سے بھی کم عرصہ کے دوران برطانیہ کے وزیراعظم بن گئے۔ لارڈ کرین بورن کی جانب سے تجویز کردہ جام صحت کے رسمی جواب میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی مندوب نے کہا:-

”بھئی مخلوق میں برطانیہ کے اس کردار کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا گیا ہے جو وہ جنگ کے بعد سلامتی کے انتظامات کے سلسلے میں ادا کرنے والے ہے۔ بعض تقاریر میں اس سلسلے میں بے چینی، تشویش بلکہ مایوسی تک پائی گئی ہے۔ جی یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستانی مسئلے کا اظہار ان شخصوں میں تشویش کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ کیا اس کانفرنس سے اس معاملے میں کسی رہنمائی کی توقع کرنا ان سے بہت بڑی امید والہ نہ کرنے کے مترادف ہوگا؟ میں جانتا ہوں کہ اس ملک کے بہترین دماغ اس مسئلے کا اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور ان میں سے کچھ اسے نشانے کی کوششوں میں مصروف بھی ہیں تاہم یہ بات انتہائی اطمینان اور سکون قلب کا باعث ہوگی اگر یہ کانفرنس اس مسئلے پر امداد کے حل کے امکانات پر روشنی ڈال سکے۔ یہ اس کانفرنس کی درحقیقت ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔ ملک معظم کی حکومت کا رویہ ایسا لگتا ہے کہ وہ ہندوستان کے متعلق اپنی پالیسی کے اعلان کے بعد اٹھا قدم اٹھانے کا کام ہندوستان پر چھوڑے گی۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ اس اعلان کے بعد لگے اقدام کی ذمہ داری خود ہندوستان پر عائد ہوتی ہے مگر اس اقدام کی عدم موجودگی میں کیا برطانیہ واقعی ہندوستان کے بارے میں تمام ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتا ہے؟ خود برطانیہ کے مفاد، دولت مشترکہ کے مفاد بلکہ عالمی امن کے مفاد کے پیش نظر میرے خیال میں صورتحال کو مزید بگڑانے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔“

”برطانیہ پر جنگ کے بار آورشدید دباؤ کے باوجود بہت سے معاملات میں اس کے کردار کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ برطانیہ اندرون ملک سماجی تحفظ کے ایک قابل تعریف نظام کی تشکیل میں مصروف ہے۔ نوآبادیات کے معاملے میں اس نے سارے مسئلے کو ایک نئی حیثیت دی ہے اور اس معاملے میں ایک



نیا مقصد متعین کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ خود اقتدار سے الگ ہو رہا ہے۔ خارجہ تعلقات کے معاملے میں بھرپور کوششوں کے بعد اس نے امریکہ کے ساتھ نئے تعلقات کی بنیاد رکھی ہے اور اس سے بھی زیادہ اطمینان بخش اس کے تعلقات کی نوعیت روس کے ساتھ ہے۔ کیا وہ ہندوستان کے مسئلے پر شکست قبول کرنا پسند کرے گا؟

”میں کہہ سکتا ہوں کہ یہاں ہوں مگر اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود وہ تعطل ختم کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں۔ کیا برطانیہ اس کے بعد اور کوئی کوشش نہیں کرے گا؟ کیا میں دولت مشترکہ کے مختلف علاقوں سے آنے والے مندوبین سے اپیل کر سکتا ہوں کہ وہ دیگر اہم اور شدید معاملات کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کے حل کے لئے مزید تعمیری ذہنوں کو آگے بڑھائیں جس کے ساتھ بعد از جنگ انتظامات کے بہت سے مسائل وابستہ ہیں تاکہ جب جنگ میں کامیابی حاصل ہو جائے جو فروری ۱۹۴۵ء کے اس مہینے میں اب کافی قریب آچکی ہے تو ہندوستانی کی آزادی کا مسئلہ بھی حل کیا جاسکے۔ یقیناً یہ ایک قابل قدر کوشش ہوگی۔“

”یہ مسئلہ کیا کہ ہم سب جانتے ہیں مشکل اور پیچیدہ ہے۔ ہندوستان میں مختلف سیاسی پارٹیاں الگ تھلگ اور غیر یکجہ راہ کو تصدیق پر قائم ہیں۔ آج کی رات میں صرف ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کیا ملک معظم کی حکومت کے لئے یہ قابل عمل نہیں ہوگا کہ وہ اعلان کرے کہ جاپان کے ساتھ جنگ کے خاتمہ کے ایک سال کے اندر ہندوستان میں طے پانے والے کسی مقامی سمجھوتے کو نافذ کر دیا جائے گا۔ مگر اس قسم کا سمجھوتہ طے پانے میں ناکامی کی صورت میں برطانوی حکومت ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے بارے میں پارلیمنٹ میں تجاویز پیش کرے گی جو ہندوستان کو دوسری برطانوی ڈومینین کے برابر لاکھڑا کرنے کے لئے تیار کی گئی ہوں گی۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مسئلے کے جس حل پر ملک معظم کی حکومت پہنچے گی وہ محض عارضی ہو گا اور صرف اس وقت تک نافذ العمل رہے گا جب تک خود ہندوستانی اس کے کسی متبادل انتظام پر متفق نہیں ہو جاتے۔ جب ہندوستانی کسی متبادل انتظام پر متفق ہو جائیں تو وہ عبوری آئین کی جگہ لے لے گا۔ عبوری آئین کے سلسلے میں ملک معظم کی حکومت جو بھی فیصلہ کرے گی وہ یقیناً ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو مطمئن نہیں کر سکے گا۔ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کو اپنے دعووں میں بڑی حد تک رد و بدل کرنا پڑے گا تاکہ انہیں ایک قابل عمل آئین میں سمویا جاسکے۔“



”لگزیں اس بات سے ناامید نہیں ہوں کہ اگر ملک معظم کی حکومت یہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے تو اس سے یا تو ہندوستانی جاعتیں کسی ایک جگہ پر متفق ہو جائیں گی یا انہیں ملک معظم کی حکومت کا تشکیل کردہ آئین ایک خاصے طویل عرصہ کے لئے قبول کر لینے کی ترغیب ضرور ملے گی جس کے دوران یہ دریافت کیا جاسکے گا کہ اسے کس طرح مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔“

”میں آپ سے معذرت چاہوں گا کہ میں نے ہندوستان کے مسئلے پر آپ کا اتنا زیادہ وقت لیا۔ مگر برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے درمیان تصفیہ کا مسئلہ میرے دل کی گہرائیوں سے وابستہ ہے اور دل کی گہرائیوں سے وابستہ معاملات اس قسم کے مواقع پر زبان پر آہی جایا کرتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ مستقبل کے امن اور تہذیب کی ترقی کے انتہائی اہم معاملات کا انحصار اس مسئلہ کے حل پر ہے جس پر اس وقت شاید اس قدر توجہ نہیں دی جا رہی جتنی کہ ضروری ہے۔“

دولت مشترکہ کا نفرنس کے افتتاح کے روز ابتدائی چند گھنٹوں میں کی جانے والی ان دو تقریروں کی بھرپور تہنیر کی گئی اور اس سے برطانوی سیاسی حلقوں میں سرگرمی پیدا ہو گئی۔ اس کے چند روز بعد وائسرائے لارڈ ویلر کو صلاح مشورہ کے لئے لندن بلایا گیا اور آزادی کی جانب ہندوستان کے آخری مرحلے کے سفر کا آغاز ہوا۔ مسٹر نہرو اور اُن کے قریبی سیاسی رفقاء اُن دنوں دکن، جنوبی ہندوستان میں اورنگ آباد کے قلعہ میں نظر بند تھے۔

اُس سال جولائی میں ہونے والے پارلیمانی انتخابات کے نتیجے میں لیبر پارٹی برطانیہ میں دوبارہ سربراہان قرار پائی۔ شاہ برطانیہ نے نئی پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر ۱۵ اگست کو تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

”ہندوستانی رعایا کے ساتھ کئے گئے وعدوں کے مطابق میری حکومت ہندوستانی رہنماؤں کے مشورے سے ہندوستان میں جلد مکمل حکومت خود اختیاری کے قیام کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔“

یہ وعدہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پورا ہو گیا مگر اس کا ایسا بڑے افسونگ انداز میں ہوا۔

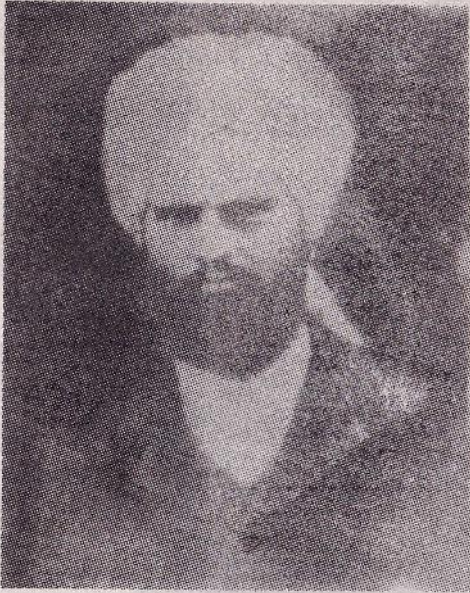
پچھلے صفحات میں جن حالات اور واقعات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے ان سے دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب کانگریس اور مسلم لیگ آزادی کی جدوجہد میں تیزی سے تعطل کی جانب بڑھ رہے تھے تو ۱۹۳۵ء سے وائسرائے کی کابینہ میں شامل مسلمان قیادت اس امید کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا سفر تیز تر کرنے کے لئے بے چین تھی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کی زیادہ بہتر طور پر



نگہداشت کی جائے۔ اس سے ہندو رہنماؤں کے وہ الزامات سراسر بے جواز اور بے بنیاد ثابت ہو جاتے ہیں کہ اس دور میں مسلمان صرف اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے اور انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔



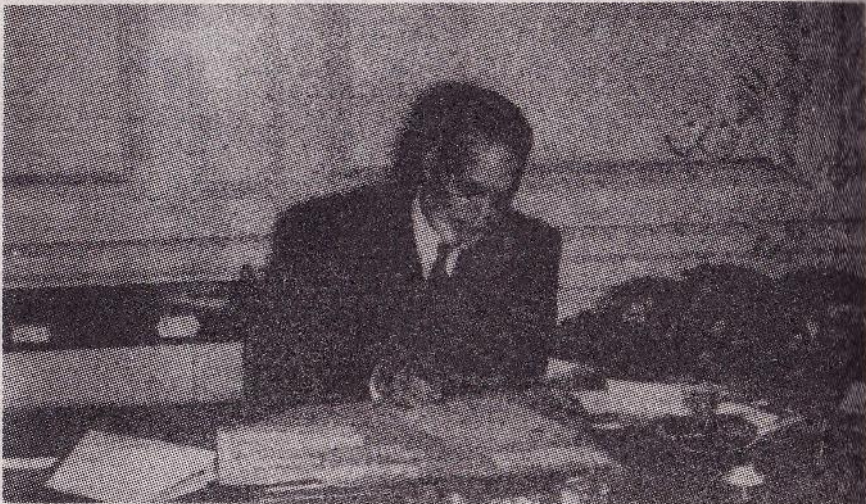




مصنف کے والد چچا وہری نعر اللہ خاں

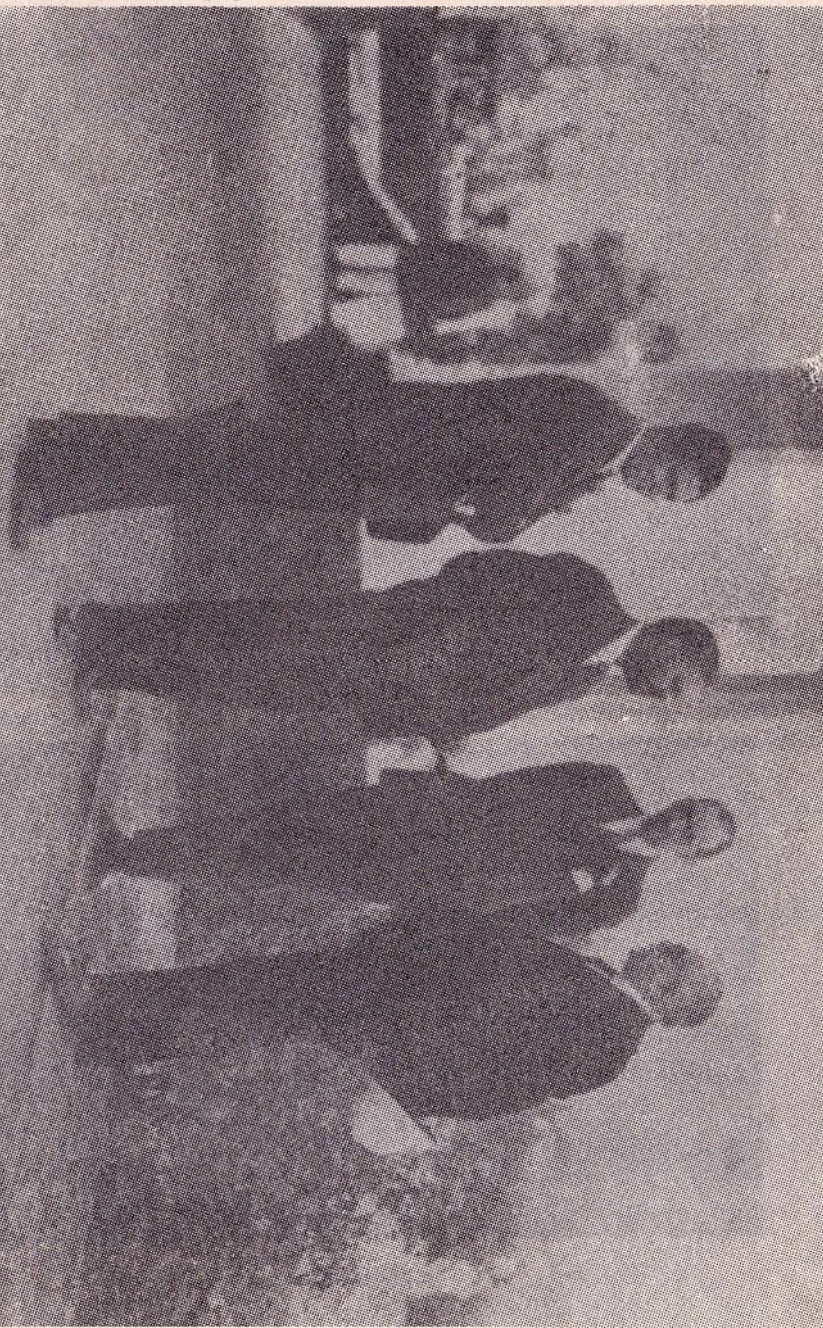


مصنف چودھری محمد علی کے ساتھ



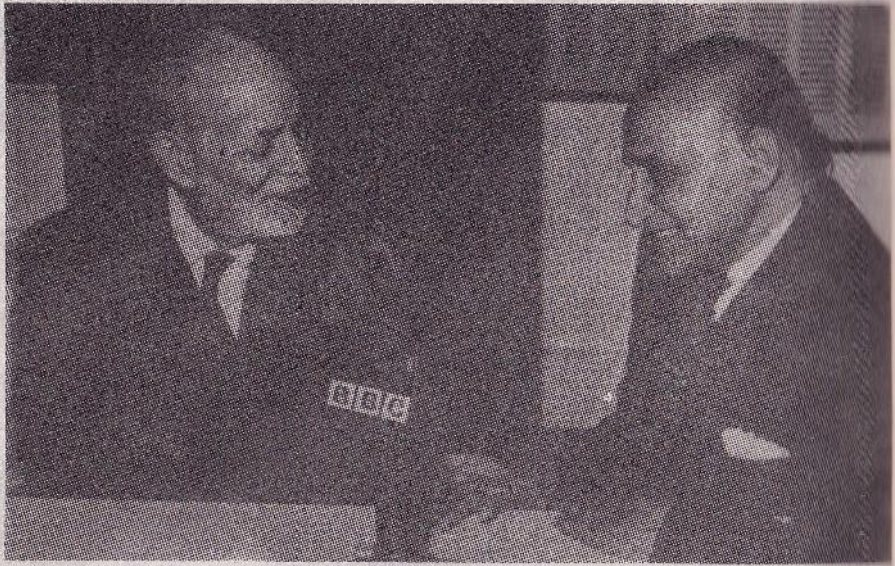
مصنف جب پاکستان کے وزیر خارجہ تھے



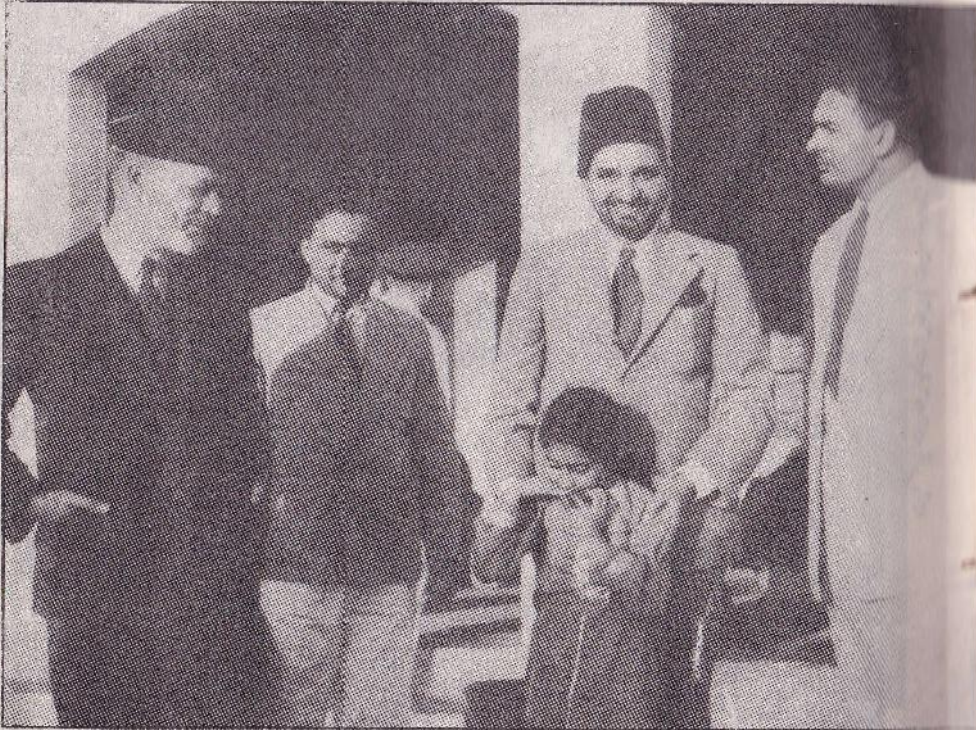


دہلی - ۱۹۳۴ء - سر آغا ظفر و السرائی، جلالہ و انجمن کے پرنسپل، پرنسپل اور سر اچھ علی





بینی سی پر عاشق حسین ٹالوی مصنف سے انٹرویو لے رہے ہیں



چودھری شاہنواز، چودھری شیلو، مصنف کی صاحبزادی امتی، خواجہ سرور حسن اور مصنف



وزیراعظم پاکستان علی خان یوسفزئی و ستمبر سالانہ اسمبلی میں تقریر کر رہے ہیں۔ مصنف (سید ذریعہ ناز) ان کے بیک گراؤڈ پر



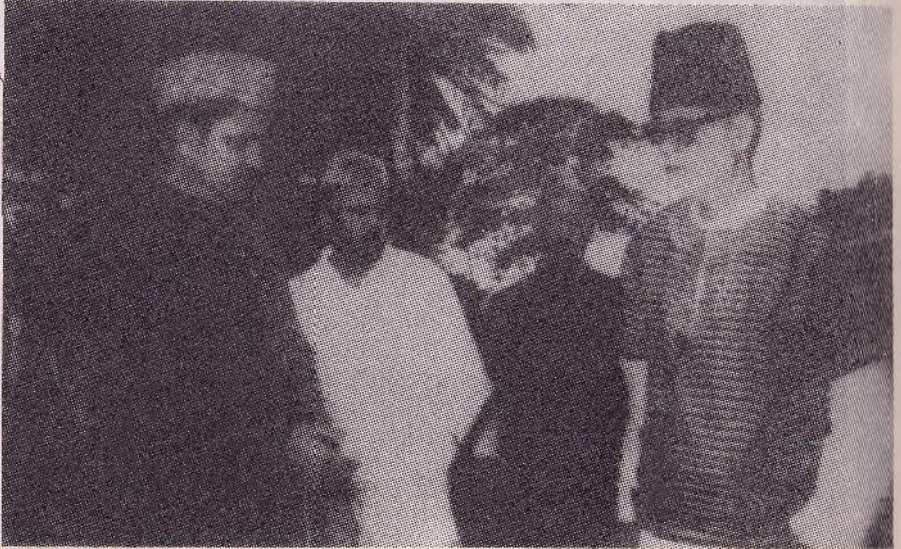




مصنف



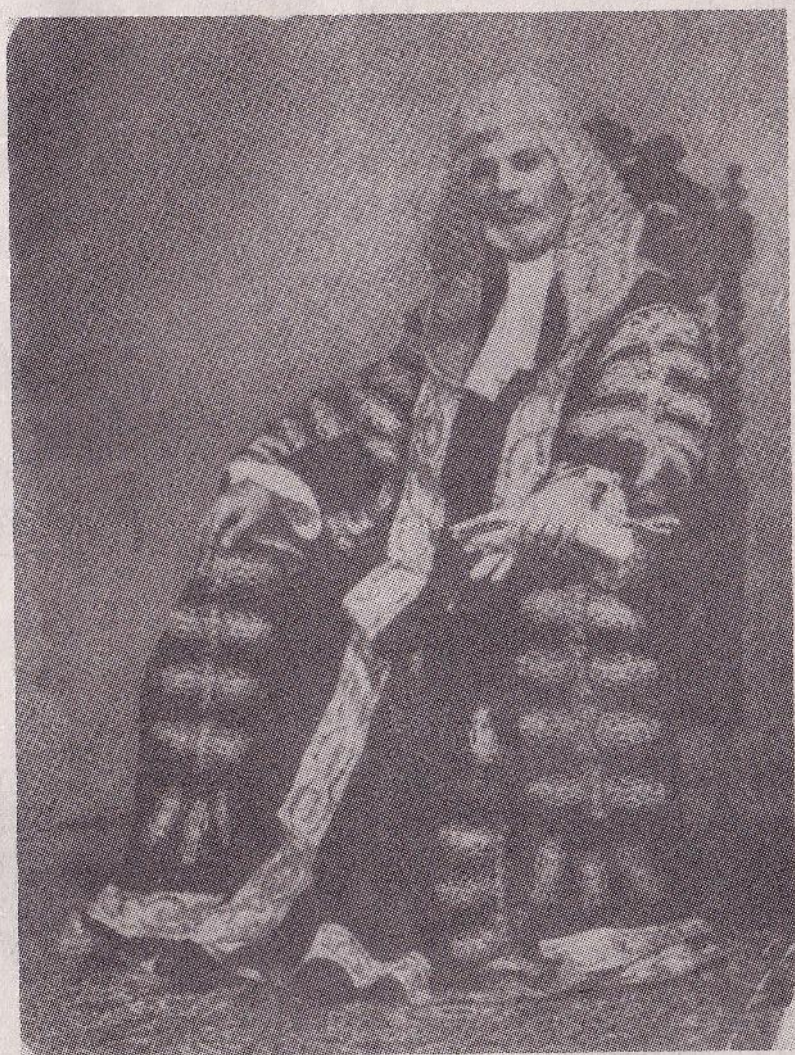
لندن ۱۹۳۹ء - مصنف اور انوار احمد کابلوی



۱۹۷۳ء - سیرالیون کے دورہ کے موقع پر مصنف وہاں کے روایتی لباس میں

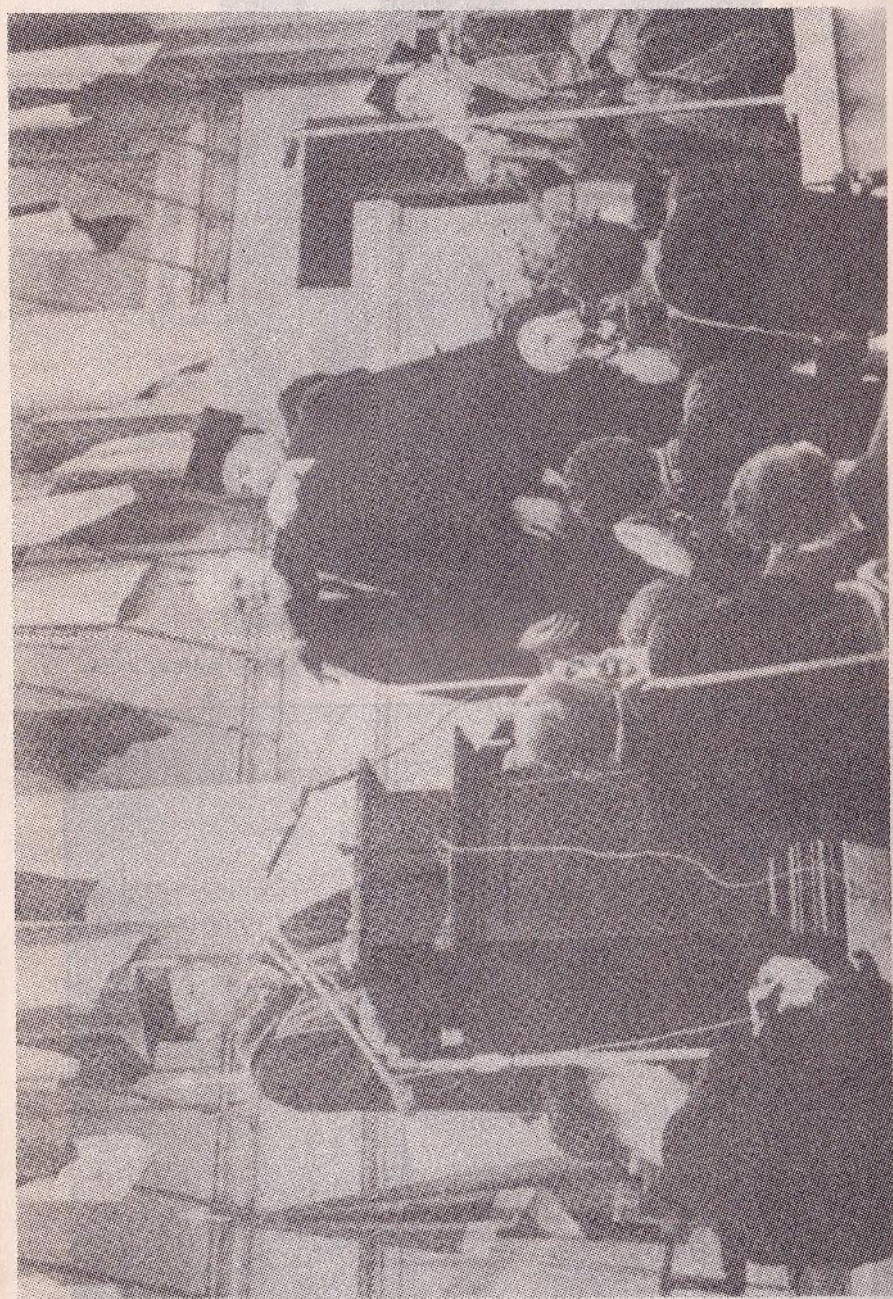


ACC. # 24737  
MADAR-I-MILLAT LIBRARY  
AIWAN-I-QUAID-I-AZAM  
NAZARIAT PAKISTAN TRUST



مصطفیٰ فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے سینئر جج کی حیثیت میں





۳۰ سالہ لائی برکس امریکی کی (کیٹھو فونیا) کی طرف سے مصنف کو اعزاز دی گئی دی چلی ہے





لندن ۱۹۳۱ء دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر مصنف اور علامہ اقبال بختیم پیس میں ایک پارٹی میں شرکت کے لئے جا رہے ہیں



مصنف ۱۹۳۶ء میں



ملک معظم کی حکومت ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسے اس اہم پروگرام کا طریق کار اور انداز متعین کرنے کے نہایت مشکل اور پیچیدہ مراحل کا سامنا تھا۔  
 ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں پیش کردہ فیڈرل سکیم ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے غیر صالحانہ رویے کے بھاری بھر کم بوجھ تلے دب چکی تھی اور اب اسے ناقابل تجدید قرار دے کر ترک کیا جا چکا تھا۔ ہندوستان کے آئینی افریق پر سب سے بڑا سوالیہ نشان ”متحدہ یا منقسم ہندوستان“ بن کر ابھر رہا تھا۔

برطانیہ ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی وحدت پر فطری طور پر نازاں تھا جو کہ برصغیر کو اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ حاصل ہوتی تھی۔ برطانیہ آزاد ہندوستان کو یہ وحدت اپنے دور اقتدار کے گراں قدر ورثہ کی حیثیت سے منتقل کرنے کا خواہشمند تھا۔ ملک معظم کی حکومت اور خاص طور پر ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے رکن کی حیثیت سے دو مرتبہ ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد برطانوی وزیراعظم اسٹلی لانگلیس اور مسلم لیگ کے درمیان ہندوستان کی وحدت برقرار رکھنے کے کسی بھی سمجھوتہ کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے انہی امکانات کی تلاش اور کوششوں کے سلسلے میں وزیراعظم برطانیہ نے اپنے تین وزراء پر مشتمل ایک کمیٹی مشن تشکیل دیا جو لارڈ پیٹک لارنس (سیکریٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان) سر سیٹھنور ڈکھن (صدر بورڈ آف ٹریڈ) اور سر ایلیگزینڈر ٹرنر (فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی) پر مشتمل تھا۔

مشن ۱۹۲۹ء کے موسم بہار میں ہندوستان پہنچا اور اس نے ان تمام مشکلات کے باوجود جن کی موجودگی میں اسے کام کرنا تھا، ہندوستانی سماجوں کے ساتھ تبادلات و خیالات اور بحثوں کے علاوہ وائسرائے ہند سے مشورہ کر کے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ایک سکیم تیار کی جسے کمیٹی



پلان کا نام دیا گیا۔ پھر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو اسے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ بات سب کے لئے حیرت اور اطمینان کا باعث بنی کہ دونوں نے اسے قبول کر لیا۔ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“ کے مصنف نے کانگریس کے کیبنٹ پلان کو منظور کرنے کو ”تباہی کی غرض سے قبول کرنا“ قرار دیا۔ (صفحہ ۳۷)

کیبنٹ پلان میں ہندوستان میں تین خود مختار زون قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں شمال مشرقی زون (بنگال اور آسام) شمال مغربی زون (پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ) اور مرکزی زون (غیر منقسم ہندوستان کے بقایا صوبہ جات اور علاقے) شامل تھے۔ ان زونوں کو مل کر ایک فیڈریشن قائم کرنے کی تجویز تھی جو دفاع، خارجہ معاملات، کرنسی، مواصلات اور وفاقی مالیات کی ذمہ دار ہوتی۔ دس سال کے بعد پہلا زون یا دوسرا زون یا دونوں فیڈریشن سے علیحدگی اختیار کرنے کے مجاز تھے اور مکمل آزادی اختیار کر سکتے تھے۔ اگر پہلا زون (بنگال اور آسام) مکمل آزادی کا اعلان کر دیتا تو اس صورت میں آسام کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ پہلے زون سے علیحدگی اختیار کر کے بدستور فیڈریشن میں شامل رہ سکتا تھا۔ کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں کانگریس کے صدر ایک نامور مسلمان رکن مولانا ابوالکلام آزاد تھے جو بعد ازاں منقسم ہندوستان میں پہلی نہرو کاہنہ میں وزیر تعلیم بنے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی جانب سے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لئے جانے کے بعد ان کا کام مکمل ہو گیا ہے چنانچہ انہوں نے کانگریس کی صدارت سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس کی صدارت کے لئے اپنے جانشین کے طور پر مسٹر نہرو کے انتخاب کی سرپرستی اور حمایت کی۔ اپنی یادداشتوں میں اپنے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے اپنی سیاسی زندگی کی سب سے فاش غلطی قرار دیا۔ مسٹر نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے اور انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کی ایک نئے انداز میں تشریح کرنا شروع کر دی۔

کیبنٹ مشن پلان کو برصغیر پاک و ہند کو متحد رکھنے کی آخری سیاسی کوشش تصور کرتے ہوئے یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اس پلان کو ناکام بنانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“ کا درجہ ذیل اقتباس ہمارے اس سوال کا جواب فراہم کرتا ہے :

”... یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آئینی آزادی کے لئے کیبنٹ مشن پلان جس کے ذریعہ محدود مگر موثر اختیارات کے ساتھ ایک وفاقی مرکز قائم کر کے ہندوستان کی وحدت قائم کی جاسکتی تھی



اسے مسلم لیگ نے جون ۱۹۴۶ء میں قبول کر لیا تھا مگر کانگریس نے اس کو کھلے بندوں تو نہیں لیکن علما مسترد کر دیا۔ (صفحہ ۱۶۱)

”کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنی منفی توضیح کے ساتھ بمبئی میں ۶ جولائی ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں بھاری اکثریت سے کینٹ مشن پلان منظور کرنے کی توثیق کر دی۔ پٹنہ نہرو نے کچھ ہی عرصہ پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کے جانشین کی حیثیت سے کانگریس کی صدارت سنبھالی تھی“ (صفحہ ۱۶۲)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے آخری اجلاس میں اور بعد ازاں ایک پریس کانفرنس میں بھی پٹنہ نہرو نے اعلان کیا کہ ”کانگریس نے کسی طویل یا مختصر پلان کو منظور نہیں کیا۔ کانگریس نے مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کے سوا کسی بات کا وعدہ نہیں کیا۔ یہ اسمبلی با اختیار ہوگی اور گروپوں کی سکیم پر شاید کبھی عمل نہیں کیا جائے گا۔“ (صفحہ ۱۶۲)

”پریس کانفرنس میں جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ کینٹ مشن پلان میں ترمیم کی جاسکتی ہے تو نہرو نے جواب دیا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی کے اندر اس پلان میں جس طرح مناسب سمجھے گی تبدیلی یا ترمیم کرنے میں آزاد ہوگی۔“ (صفحہ ۱۶۲)

”آئی کینٹ مشن پلان کی بنیاد کو اس طرح کھلے عام حقارت کے ساتھ مسترد کرنا، جو کہ آل انڈیا قوم پرستوں اور مسلمان ”علیحہ کی پسندوں“ کے درمیان ایک نازک رشتے کی حیثیت رکھتا تھا، ایک عظیم حقیقتوں یا ایک فاش سیاسی غلطی کی غمازی کرتا تھا اور اس کے نتائج کی پیش گوئی آسانی کی جاسکتی تھی۔ مٹنہ نہرو نے فوری طور پر ”کینٹ مشن کی طویل المیعاد سکیم کی بنیادی صورت سے انحراف“ پر احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ برطانوی حکومت کو اس بات کی مکمل وضاحت کرنی چاہیے کہ کیا کانگریس نے اس سکیم کو قبول نہیں کیا؟ لندن میں کینٹ مشن کے ارکان، برطانوی ذرا و صورت حال کی وضاحت میں ناکام رہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ۱۸ جولائی کو لارڈ ہیتھک لارنس نے اس بات پر زور دیا کہ سیاسی جماعتیں جنہوں نے ۱۶ مئی کے بیان سے اتفاق کیا ہے وہ آئین ساز اسمبلی میں جا کر اس کے قواعد و ضوابط سے باہر نہیں جاسکتیں۔ سر سٹیفورڈ کرسپس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ گروپوں میں شامل سوبے علیحدگی کے اختیارات کو نئے آئین کے تحت ہونے والے پہلے انتخابات کے بعد ہی استعمال کر سکتے ہیں وہ بھی اس صورت میں جب علیحدگی کے مسئلے کو مرکزی نقطہ بنا کر انتخابات



کر رہے جاتیں۔ پلان کے نفاذ کے متعلق یہ بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ اسے متحارب سیاسی جماعتوں اور طبقوں کے درمیان مفاہمت کے لئے اس کی کھل روح کے مطابق تسلیم کیا گیا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ پلان زیادہ سے زیادہ محض ایک فارمولہ تھا جس کی بنیاد پر اگر فریقین کے دلوں خواہش ہوتی تو ہر طور پر تعاون کا آغاز کیا جاسکتا تھا۔ یا پھر اس کے برعکس پلان کو قبول نہ کرنے کی صورت میں برطانوی اقتدار کی طاقت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

”اس صورتحال پر مسٹر چانچ اور مسلم لیگ چین سے نہیں بیٹھ رہے۔ مسلم لیگ کی آل انڈیا کونسل نے ۲۷ جولائی کو بمبئی میں ایک قرارداد منظور کی جس میں کھل کر اس بات کا اظہار کیا گیا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر کیبنٹ مشن پلان کے واضح مقاصد کو رد ہم برہم کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ مسلم لیگ کیبنٹ پلان کی منظوری کے سلسلے میں ۱۶ مئی کے بیان کو منسوخ کرتی ہے اور ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیا جاتا ہے کہ ”ڈائریکٹ ایکشن“ کا منصوبہ تیار کرے۔ مسلم لیگ کے تمام ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ حکومت سے ملنے والے تمام خطابات واپس کر دیں۔ اگرچہ مذمت کا نشانہ بننے والے گروہ کے غیر خواہوں کے درمیان اس کے بعد بھی پُر امید رہنے کی افواہیں گردش کرتی رہیں مگر یہ قرارداد عمل کیبنٹ مشن پلان کے لئے موت کا پروانہ ثابت ہوتی۔“

(صفحہ ۱۹۲-۱۹۳)

”مشن کی ناکامی میں کئی وجوہ کار فرما تھیں۔ اس کا اپنا طریقہ کار اور قواعد و ضوابط تھے۔ ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کا کم اہم مقصد کے لئے اہم مقاصد کو داؤ پر لگا دینا اور پھر ہاتھ باندھ کر گاندھی کا غیر مستحکم رویہ۔ مگر ابھی جبکہ کیبنٹ پلان کے متعلق امیدیں باقی تھیں کہ جواہر لال نہرو نے اس پر اپنی تقریر کے ذریعہ واضح طور پر یہ کہتے جوتے کاری غریب لگادی کہ کانگریس پلان کو صرف اسے تباہ کرنے کے لئے قبول کرے گی۔ وہ صوبوں کی گروپوں میں شمولیت کے نظام کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کرے گی جو کہ کیبنٹ مشن پلان کی اصل روح تھی۔ مصالحت پر مسلمانوں کا اعتماد اس زخم کے بعد شاید ہی باقی رہ سکتا تھا۔“ (صفحہ ۵۲)

پلان کی روح کو دوبارہ زندہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ ہندو مسلم باہمی اعتماد بحال نہ کیا جاسکے کیونکہ مسٹر نہرو بار بار اور دو ٹوک الفاظ میں کہہ چکے تھے کہ کانگریس اس پلان پر نیک نیتی



کے ساتھ عملدرآمد کرنے کی خواہاں نہیں تھی۔ وائسرائے لارڈ ویل نے کانگریس کی قیادت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی سخت کوشش کی کہ وہ پلان پر پوری طرح عملدرآمد کرے، مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مسٹر موسے کی تصنیف 'دی لاسٹ ڈیز آف برٹش راج' میں شامل وائسرائے ہند اور کانگریس کے دو انتہائی سرکردہ لیڈروں کے درمیان گفتگو اس سلسلے میں کئی اگستائیاں کرتی ہے :

"کیبنٹ مشن پلان ہندوستان کی آزادی کے لئے تیار کیا گیا تھا جس کی بنیاد وفاق ہندوستان کے نظریہ پر رکھی گئی تھی جس میں تین گروپوں کی تشکیل کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ گروپ اے (جس میں ہندو اکثریتی منصوبے شامل تھے) گروپ بی (مسلمانوں کا اکثریتی گروپ) اور گروپ سی (جس میں مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت ہوتی)۔ وفاق ہندوستان میں سب سے اہم عنصر گروپ اے ہوتا جس میں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہوتی اور جو گروپ بی اور سی سے ہمیشہ زیادہ طاقتور ہوتا۔

"یہ وہ انتظام تھا جسے مسلم لیگ نے قبول کر لیا یہاں تک کہ نہرو رپورٹ کی سکیم کو کھلے عام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر خواجہ ناظم الدین نے تجویز پیش کی کہ کانگریس ایک اعلامیہ جاری کرے کہ اس نے کیبنٹ مشن پلان کو اپنی وضاحت کی بجائے اس وضاحت کے مطابق قبول کیا ہے جو کہ خود کیبنٹ مشن نے اس سلسلے میں کی ہے۔ انہیں اس بات کی بھی ضمانت فراہم کرنی چاہیے کہ گروپوں میں شامل اقلیتیں کیبنٹ مشن پلان کے مطابق دس سال سے قبل علیحدگی اختیار نہیں کر سکیں گی۔ دوسرے لفظوں میں اس سکیم کو بروئے کار لانے کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔

"خواجہ ناظم الدین نے وائسرائے کو بتایا کہ ان حالات میں مسلم لیگ سکیم کو مسترد کرنے سے متعلق اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکتی ہے اور عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ویل نے یہ سوال بلا تکلف گاندھی اور نہرو کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا "کیا آپ مجھے وہ گارنٹی فراہم کر سکتے ہیں جس کا مسلم لیگ مطالبہ کر رہی ہے؟"

"وائسرائے فوری طور پر گاندھی کے ساتھ اپنی سب سے مشکل سیاسی گفتگو میں الجھ گئے۔ گاندھی اس شام واضح اور دو ٹوک بات نہ کرنے کی انتہا پر تھے۔ گاندھی ایک ایسے روحانی رہنما تھے جو اپنے آشرم میں دانش ضبط نفس، افہام و تفہیم اور کوئی چیز حاصل کرنے سے زیادہ اسے دوسروں کو دینے



کار دے دیتے تھے مگر اس شام انہوں نے خالصتاً ایک کانگریسی سیاستدان کی حیثیت سے گفتگو کی۔  
 وائسرائے لارڈ ویلر نے گاندھی سے کہا، ”مجھے محض اس بات کی گارنٹی دیجئے کہ آپ کینٹ  
 مشن پلان کو قبول کرتے ہیں۔“

گاندھی نے جواب دیا: ”ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہم نے اسے قبول کر لیا ہے۔ مگر ہم اس بات  
 کی گارنٹی دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہم اسے اس طرح قبول کریں گے جیسے اسے کینٹ مشن نے  
 تیار کیا ہے۔ انہوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں ہم ان کی اپنے انداز میں توضیح کرتے ہیں۔“  
 لارڈ ویلر نے کہا ”کیا اس صورت میں بھی جب آپ کی توضیحات کینٹ مشن کے مقاصد سے  
 متصادم ہوں؟“

گاندھی نے جواب دیا: ”بالکل۔ بہر حال کینٹ مشن پلان کے مقاصد ضروری نہیں کہ وہی ہوں جو  
 کینٹ مشن نے سوچ رکھے ہیں بلکہ یہ تو وہ ہوں گے جو عبوری حکومت کے خیال کے مطابق ہوں گے۔“  
 ”ویلر نے نکتہ اٹھایا کہ موجودہ صورتحال میں جبکہ مسلم لیگ نے حکومت کا بائیکاٹ کر رکھا ہے  
 عبوری حکومت کی راتے کانگریس کے حق میں اور مسلم لیگ کے خلاف ہوگی۔ پھر یہ کس طرح غیر متعصب  
 ہو سکتی ہے؟“

”گاندھی نے جواب دیا کہ ان کا تعصب سے کوئی تعلق نہیں۔ انہیں تو بحث کی صرف قانونی بنیاد  
 سے دلچسپی ہے۔ قانونی طور پر اس مسئلے کو عبوری حکومت کو حل کرنا ہے۔ ایک مرتبہ عبوری حکومت  
 برسرِ اقتدار آجائے تو اس طرح کے معاملات مثلاً مسلم لیگ کی خواہشات اور بے جاتشویش وغیرہ پر  
 دو ٹوک کرا تی جاسکتی ہے مگر اس سے پہلے ایسا ممکن نہیں۔“  
 ”مگر کیا آپ نہیں جانتے؟“ ویلر نے غصے سے بھڑک کر کہا۔ ”کہ یہ کانگریس کی حکومت ہوگی۔  
 اور اس میں یقیناً غیر جانبداری کا فقدان ہوگا۔“

اس مرحلے پر پیٹنر نہرو نے مداخلت کی ”آپ کانگریس پارٹی کی تشکیل کو سمجھنے میں غلطی کر رہے  
 ہیں۔ یو۔ اے۔ ایس۔ اور میں پہلی مرتبہ نہیں کہہ رہا ہوں۔ کانگریس ہندوؤں کی حامی یا مسلمانوں کی  
 مخالف نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کی تمام قوموں کے لئے ہے۔ یہ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف کبھی  
 قانون سازی نہیں کرے گی۔“



لارڈ ویول نے جواب دیا ”مگر کس کے مسلمان پنڈت نہرو؟ آپ کے (مسلمان)؟ کانگریس کے مسلمان؟ نام نہاد کٹھ پٹلیاں؟ یا مسلم لیگ کے مسلمان؟ کیا آپ نہیں دیکھ سکتے کہ اس وقت کی ضرورت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو مطمئن کیا جاتے۔ کیا آپ اسے نچا دکھانے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں؟ یہی وہ موقع ہے۔ اور شاید آخری موقع۔ جو ہمیں کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے ملا ہے۔ اور میں آپ سے صرف گارنٹی چاہتا ہوں۔ کیا کانگریس ایک اعلامیہ کی پابندی کرے گی۔ ایک ایسا اعلامیہ جو مسلم لیگ کو مطمئن کر دے اور اس بات کی بھی یقین دہانی کرادے کہ ایک مستحکم اور متحد حکومت اپنا کام جاری رکھ سکے گی؟“ پھر وائسرائے نے اپنی دراز کھولی اور اس میں سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا ”یہ ہے وہ (اعلامیہ) جو میرے ذہن میں ہے۔“

مجوزہ اعلامیہ کی عبارت کچھ یوں تھی: ”فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پیش نظر کانگریس اس بات پر تیار ہے کہ ۱۶ مئی کے بیان (کیبنٹ مشن پلان) کے عزائم کو تیار کر لیا جائے کہ مجوزہ گروپوں میں شامل صوبے اپنا وہ اختیار استعمال نہیں کر سکیں گے جس سے ان کے گروپوں کی (حیثیت سے) رکینٹ متاثر ہوتی ہو۔ یہاں تک کہ بیان کے پیرا گراف ۱۹ (vii) کے مطابق نئے آئینی انتظامات کے بعد نئی مجلس قانون ساز کا قیام عمل میں نہ آچکا ہو، اور اس کے تحت پہلے عام انتخابات منعقد نہ کرائے جاسکے ہوں۔“

گاندھی نے یہ بیان نہرو کے ہاتھ میں دے دیا۔ جنہوں نے اسے پڑھا اور کہا: ”اس کو قبول کرنا کانگریس کو زنجیروں میں جکڑ دینے کے مترادف ہوگا۔“

وائسرائے ویول نے کہا: ”جہاں تک کیبنٹ مشن پلان کا تعلق ہے میرا خیال ہے آپ کو ایسا ضرور کرنا چاہیے۔ جب کانگریس نے اس کو شروع میں قبول کیا تو میں یقین نہیں کر سکتا کہ آپ کو اس کے مضمرات اور اثرات کا علم نہیں تھا۔ اگر ایسا تھا تو آپ نے اسے سرے سے قبول ہی کیوں کیا تھا؟ ملک کو دو گروپوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا جا چکا تھا۔ اب آپ اس سے مخبر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اس (پلان) کے مقاصد کیا تھے۔“

گاندھی: ”کیبنٹ مشن کے مقاصد کیا تھے اور ہم ان کے مقاصد کی جس انداز میں توضیح کرتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ درحقیقت اسی طرح ہوں۔“



لارڈ ویل: ”یہ ویل کی گفتگو ہے۔ میرے ساتھ سادہ انگریزی میں بات کریں۔ میں ایک سادہ سا سپاہی ہوں اور آپ مجھے قانونی دلائل میں الجھا رہے ہیں۔“  
 نہرو: ”اگر ہم ویل میں تو اس میں ہمارا کوئی تصور نہیں۔“

ویل: ”نہیں۔ مگر آپ میرے ساتھ دیانتدار لوگوں کی طرح تو بات کر سکتے ہیں جو ہندوستان کے مستقبل اور فلاح میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ خیر، چھوڑیے اس قصے کو۔ کیبنٹ مشن نے اپنے اغراض و مقاصد کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ یقیناً ہمیں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ہم (اس کی وضاحت کے لئے) عدالت میں جائیں یا قانونی موٹنگائیوں میں الجھتے رہیں۔ ایک سیدھے سادے انسان کی طرح مجھے تو صورتِ حال بالکل واضح دکھائی دے رہی ہے۔ اگر کانگریس مجھے وہ ضمانت فراہم کر دے جس کے لئے میں نے آپ سے کہا ہے تو میرا خیال ہے کہ میں سڑ جانا اور مسلم لیگ کو اس بات کی ترغیب دے سکوں گا کہ وہ عبوری حکومت میں عدم شمولیت کے اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کریں۔ ہمیں حکومت میں ان کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کو ان کی ضرورت ہے۔ اگر آپ خانہ جنگی کے خطرات سے واقعی پریشان ہیں۔ اور میری طرح یقیناً آپ بھی ضرور جانتے ہیں کہ خانہ جنگی کا بڑا خطرہ ہے۔ تو آپ کو بھی ان کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں میرے خیال میں یہ نہ صرف غیر دانشمندانہ بلکہ تباہ کن اقدام ہو گا کہ میں محض کانگریس کو عبوری حکومت قائم کرنے کی اجازت دوں۔“  
 گاندھی: ”مگر آپ پہلے اعلان کر چکے ہیں کہ حکومت بنے گی۔ اب آپ اپنے وعدہ سے منحرف نہیں ہو سکتے۔“

ویل: ”صورتحال بدل چکی ہے۔ کلکتہ میں قتل کے واقعات کے بعد ہندوستان خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کو روکوں۔ کانگریس کو مسلمانوں کے بغیر حکومت بنانے کی اجازت دے کر گویا میں اس کو نہیں روکوں گا۔ پھر وہ (مسلمان) فیصلہ کریں گے کہ ڈائریکٹ ایکشن ہی ان کے لئے واحد راستہ ہے اور پورا بنگال قتل عام کا نشانہ بن جائے گا۔“  
 نہرو: ”دوسرے غظلوں میں آپ مسلم لیگ کے بیک میل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے لئے رضامند ہیں؟“

ویل: ”(انتہائی طیش میں آکر) خدا غوثی کریں، اسے شخص تم بیک میل کی بات کرنے والے



کون ہوتے ہو؟“ (بحوالہ: دی لاسٹ ڈیز آف برٹش راج، صفحہ ۴۲ تا ۴۴)

”برطانوی حکومت نے ۱۶ مئی کے اعلان کی بنیاد پر سمجھوتے کی آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا اور وائسرائے لارڈ ویل کے ساتھ ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے دو دو نمائندوں کے علاوہ سکھوں کے ایک نمائندہ کو بھی لندن آنے کی دعوت دی۔ ۲ دسمبر ۱۹۴۷ء کو لارڈ ویل، نہرو، جناح، لیانٹ علی خان اور سردار بلدیو سنگھ کے ہمراہ لندن پہنچے۔ ان بحثوں کے نتیجے میں دسمبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے کے دوران برطانوی حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ ہندو نہرو کو ۱۶ مئی کے اعلان کے صاف معافی سمجھنے پر آمادہ کرنے کی تمام تر کوششیں بیکار تھیں۔ تعطل مکمل ہو چکا تھا۔“

(بحوالہ: دی ایمر جنس آف پاکستان صفحہ ۹۰)

کانگریس کے بے چارے رویتے نے برطانوی وزیراعظم کو بادلِ سخاوت تقسیم ہندوستان کے امکان پر غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ایک نئی پالیسی کا جائزہ لینا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایسی زبردست شخصیت کی تلاش شروع کر دی گئی جس پر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اعتماد کیا جاسکے۔ لارڈ ویل کے جانشین کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو چنا گیا اور اس نے چند شرائط کے ساتھ یہ پیشکش قبول کر لی۔ ان شرائط میں نئے وائسرائے کو ہندوستان لے جانے کے لئے اپنا شاف خود منتخب کرنے کی اجازت دیتے جانے کے علاوہ برطانوی پارلیمنٹ میں وزیراعظم کے پالیسی بیان کی ماؤنٹ بیٹن سے پیشگی کلیرنس اور وزیراعظم کے ”لیٹر آف انٹرکسٹر“ سے اس کا متفق ہونا وغیرہ شامل تھا۔

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے تقرر کی سرکاری شرائط اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو موصول ہونے والے رازدرا نہ مکمل امر کی نہ صرف منظوری دی بلکہ اس کے زیادہ تر حصے کا مسودہ بھی خود ہی تیار کیا۔ یوں اس نے اپنا پروانہ تقرر عملاً خود ہی تحریر کیا۔“ (بحوالہ: ’وی گریٹ ڈیوائیڈ‘ صفحہ ۱۹۹)

”اور آخر میں اس نے ایک ایسی شرط لگائی جس کی اس سے پہلے کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ یہی اسے اس پالیسی کے نفاذ کے سلسلے میں تمام تر اختیارات حاصل ہونے چاہئیں جس کو نافذ کرنے کا کام اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لندن میں ملک معظم کی حکومت سے مسلسل رجوع کرنے کی پابندی یا ان کی جانب سے مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ سرٹیفیڈ ڈاکرپس نے حیرت سے کہا: آپ برطانوی



وزیر خارجہ سے بالاتر ہونے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا: ”بائیکل“ سر سیٹھ فورڈ کو رپس نے کہا: ”مگر وزیر اعظم اور وزیر خارجہ آپ کو پوری کابینہ کی جانب سے ہدایات بھیجیں گے یقیناً آپ ملک معظم کی حکومت سے غیر ملحد و اخذیارات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا: ”میرا خیال ہے مجھے اس پر اصرار کرنا چاہیے۔ اپنی گردن سے نیچے سانس لینے والی کابینہ سے میں کس طرح بات چیت کر سکتا ہوں؟“ وہ اپنے مطالبے پر اڑ گئے چنانچہ وزیر اعظم مسٹر بیٹن نے ان کی یہ شرط بھی منظور کر لی جو کہ ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات میں دائرہ اسے کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل تھی۔

”چند روز بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان پہنچے۔ پنڈت نہرو نے ان سے پوچھا: ”کیا آپ نے کسی معجزہ کے ذریعہ مکمل ترین اور بالاتر اختیارات حاصل کر لئے ہیں؟“ دائرہ اسے نے کہا: ”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ نہرو نے جواب دیا: ”آپ کا رویہ کسی بھی سابق دائرہ اسے سے مختلف ہے۔ آپ حاکمانہ لہجے میں بات کر رہے ہیں جیسے آپ کو یقین ہو کہ آپ جو کچھ بھی کہیں گے لندن میں ملک معظم کی حکومت کبھی اس کے خلاف عمل نہیں کرے گی۔“ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا: ”فرض کریں میرے پاس غیر ملحد و اختیارات ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑے گا؟“ نہرو کا جواب جوتشی کا سا تھا ”آپ وہاں کس طرح کامیاب ہوں گے جہاں دوسرے تمام ناکام ہو چکے ہیں۔“ (دی گریٹ ڈیوٹائیڈ“ صفحہ ۲۰۱)

وزیر اعظم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تحت کس حد تک کام کرنے پر آمادہ تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو دائرہ اسے کے عہدہ سنبھالنے کے بعد دو ہفتے سے بھی کم عرصے کے دوران پیش آیا۔

”یہ معاملہ جیسا کہ لندن میں اس پر غور کیا گیا ہندوستان کی دولت مشترکہ میں مستقبل کی ذمہ داری سے متعلق تھا جس سے ایک حیران کن واقعہ نے جنم لیا۔ برطانوی حکومت نے دائرہ اسے سے مشورہ کئے بغیر ہندوستان کو دولت مشترکہ کی مشاورتی کمیٹی برائے دفاع کا رکن بننے کی دعوت منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا اور مستقبل میں امپیریل ڈیفنس کالج میں منعقد کئے جانے والے کورسز میں بھارتی افسروں کو شامل نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں ہم اپریل یا اس سے لگ بھگ ہندوستانی محکمہ دفاع کو ایک تار موصول ہوا۔ اس طریق کار کے خلاف لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے



شدید ترین رد عمل کا اظہار کیا۔ فیڈرلشن آف ایک کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کے دوران اس نے اس اقدام کے متعلق ”قطعی حیران کن“ اور ”ناقابل یقین“ کے الفاظ استعمال کئے۔ اگرچہ کمانڈر انچیف نے اس کے عملی اثرات کے بارے میں وائسرائے کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر وائسرائے نے اس بارے میں شدید ترین الفاظ پر مشتمل احتجاجی تادبرہ راست وزیراعظم کو ارسال کیا۔ اس کے جواب میں وزیراعظم ایٹلی نے نہ صرف وائسرائے سے غیر مشروط معذرت کی بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ اس قسم کے واقعہ کا اعادہ نہیں ہوگا کوئی برطانوی وزیراعظم ہندوستان کے گورنر جنرل سے کبھی اس قسم کے فدیہ بانہ الفاظ شاید نہیں کہہ سکتا تھا۔“ (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۴۷-۲۰۵)

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیراعظم نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا جس میں دو نکات بڑی اہمیت کے حامل تھے:-

- ۱۔ ملک معظم کی حکومت واضح کر دینا چاہتی ہے کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کا اقتدار ذمہ دار ہاتھوں میں منتقل کرنے کی غرض سے تمام ضروری اقدامات کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔
- ۲۔ اگر یہ محسوس ہوگا کہ مذکورہ تاریخ تک مکمل طور پر ناکامیہ اسبلی ایسا آئین تیار نہ کر سکی (جیسا کہ کابینٹ مشن نے تجویز کیا ہے) تو ملک معظم کی حکومت کو طور کرنا پڑے گا کہ مقررہ تاریخ کو برطانوی ہندوستان میں مرکزی حکومت کے اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں۔ اور کیا یہ اختیارات مجموعی طور پر برطانوی ہندوستان کی کسی حد تک مرکزی حکومت کو دیتے جائیں یا کچھ علاقوں میں ”موجودہ صوبائی حکومتوں“ کے سپرد کئے جائیں یا پھر کسی اور طریقے سے انہیں منتقل کر دیا جائے جو زیادہ معقول اور ہندوستانی قوم کے بہترین مفاد میں ہو۔

(دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۱۹۹)

ہندوستانی سیاست کے ضمن میں یہ بیان بہر حال کسی نہ کسی شکل میں پاکستان کے قیام کی منظوری دینے کے مترادف تھا۔ (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۰۰)

۱۹۴۷ء کے اختتام سے کافی عرصہ قبل تخلیق پاکستان اور انتقالِ اقتدار کو اصولی طور پر ۲۰ فروری کے بیان میں تحریر کیا جا چکا تھا۔ (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۰۳)

تاہم بیان میں ”موجودہ صوبائی حکومتوں“ کا حوالہ مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے پریشانی کا



باعث تھا۔ پنجاب مستقبل کے پاکستان کا دل اور بنیادی مرکز تھا۔ پنجاب اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود صوبائی حکومت مسلم لیگ کی نہیں تھی۔ وزیر اعلیٰ سر خضر حیات خان مسلمان تھے اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی حمایت کے دعویدار بھی۔ مگر اسمبلی میں وہ منکوحہ حکومت کے سربراہ تھے۔ جسے غیر مسلم ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ انہوں نے صوبے میں مسلم لیگ کی حکومت کے قیام کے لئے مسٹر جناح کی کوششوں کی مزاحمت بھی کی تھی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ صوبے کا نظم و نسق خالصتاً اور محض روزمرہ کی ذمہ داری تھی جسے آئینی مسائل کے ساتھ مربوط نہیں کیا جانا چاہیے تھا جن سے ملک کی سیاسی قیادت نبرد آزما تھی۔ تاہم برطانوی وزیر اعظم کے ۲۰ فروری کے بیان سے مترشح تھا کہ صوبائی حکومتوں یا ان میں سے چند ایک کو شاید آئینی اختلافات میں گھسیٹا جاتے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پنجاب کی صورت حال سے مسلم لیگ کو شدید پریشانی ہو سکتی ہے جس سے مسٹر جناح کی کسی معقول سمجھوتہ کی کوششوں میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔

اس صورت حال میں سپریم کورٹ کے ایک مسلمان جج نے سر خضر حیات خان سے پُر زور اپیل کی کہ وزیر اعظم کے بیان کی روشنی میں سامنے آنے والے امکانات کے بعد ان کے لئے یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ان کی حکومت مستعفی ہو جائے تاکہ ایسی صورت حال کا خاتمہ کیا جاسکے جو سمجھوتے کی جانب پیش قدمی میں بحال ہو سکتی ہے۔ سر خضر حیات خان کا رد عمل مثبت تھا۔ اس نے مذکورہ جج کو لاہور آنے کی دعوت دی تاکہ کسی حتمی اقدام سے پہلے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا جاتے۔ جج نے اس خواہش کی تعمیل کی اور اس کے نتیجے میں سر خضر حیات خان نے کابینہ کے ارکان اور اسمبلی میں اپنی پارٹی کے ارکان کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد اپنی حکومت کا استعفا پیش کر دیا اور گورنر کو مشورہ دیا کہ اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر کو بلا کر حکومت بنانے کی دعوت دی جاتے۔ سر خضر حیات خان کے اس اقدام سے صوبے میں مسلم لیگ کو بڑی قوت ملی اور اس سے سمجھوتے کی گفت و شنید میں مسٹر جناح کے ہاتھ نہایت مضبوط ہو گئے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ملک معظم کی حکومت سے مکمل اختیارات لے کر اور حکومت سے بالاتر ہو کر ہندوستان گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف خود اپنے تقرر کی سرکاری شرائط اور اس سلسلے میں انہیں موصول ہونے والے راز و راء حکمت نامہ کی خود منظوری دی بلکہ اس کے زیادہ تر حصے کا مسودہ بھی



خود ہی تیار کیا گئیوں انہوں نے عملاً اپنا پروانہ تقریر خود ہی تحریر کیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے آئینی مستقبل کے ساتھ ساتھ پچاس کروڑ انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ بھی محض فرد واحد کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ کسی فرد واحد کو ایسا اختیار اور ذمہ داری کا اتنا بڑا بوجھ شاید ہی سونپا گیا ہو۔ وہ کس طور پر ایسے کا آدمی تھا؟ اس کی ترجیحات، اگر کوئی تھیں، تو کیا تھیں؟ اس کے حواری اور مشیر کون تھے؟ اُن کے محرکات کیا تھے؟ اپنے منفرد فرائض کی ادائیگی کے لئے اُس نے خود کو کس طرح تیار کیا؟

یہ امر مسلم ہے کہ وہ غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ ایچ۔ وی۔ ہڈسن کے مطابق :  
 ”لارڈ ماؤنٹ بیٹن میں جرات، ردِ عمل، شخصیت کا سحر، کسر نفسی، دوسروں کو سننے پر آمادگی اور غیر معمولی شخصیت کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔“

”اسی طرح اس میں یقیناً خامیاں بھی تھیں۔ وہ جذباتی تھا اور لارڈ اسمے یا وی۔ پی۔ مینن جیسے مستقبل مزاج مشیروں کے بغیر وہ ایسی غلطیاں کر سکتا تھا جن سے وہ درحقیقت بچا رہا۔ اس کے چند ایک سب سے زیادہ متنازع فیصلے وقتی اشتعال کا نتیجہ تھے جو کہ فیصلہ کرنے کی حیران کن رفتار اور نئے واقعات کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کی تقابلی صفت ہے۔۔۔ دوسرے بہت سب سے بیڈروں کی طرح اس میں بھی ظاہری رکھ رکھاؤ اور تفاخر کا گہرا احساس موجود تھا جس کے باعث وہ خوشامد اور تنقید دونوں سے غیر معمولی طور پر حساس ہو گیا تھا چنانچہ مسٹر جناحؒ اور پنڈت نہرو کے ساتھ اس کے متضاد تعلقات کو دیکھنا مشکل نہیں ہے۔ مسٹر جناحؒ سردا ہدھتوس دلائل رکھتے تھے جبکہ نہرو نیاز مند انہ شخصیت پرستی کا رویہ اپناتے ہوتے تھے۔“

(دی گریٹ ڈیوائیڈ، صفحہ ۵۱۲-۵۱۱)

ایلیں کیمل جانسن ماؤنٹ بیٹن کی ”معمولی کامیابیوں پر احساسِ تفاخر“ (مژن و ماؤنٹ بیٹن صفحہ ۱۱۲) اور اس کی خوشامد پسندی کا ذکر کرتا ہے۔ ”ماؤنٹ بیٹن نے آج کہا نہرو کے بارے میں اس کی تشویش یہ ہے کہ وہ حالات کے دھارے میں بہہ کر ایک خاص سوچ کے تحت خود کو بے مقصد ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور پارہے ہیں حالانکہ انہیں خوشامد اور جھوٹی تعریف سے متاثر کیا جاسکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ وہ خود جانتا ہے کہ یہ خطرہ کیا ہے۔ یہ ان چند



.. وجوہات میں سے ایک تھی جس کے تحت اس نے ایک ماتحت عہدے پر دوبارہ سمندر میں چلے جانے کی خواہش کی تھی۔  
(بحوالہ: "مشن ڈو ماؤنٹ بیٹن"؛ صفحہ ۲۵۶-۲۵۷)

”دراصل لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر نہرو کے درمیان ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان کا آخری برطانوی وائسرائے بن کر آنے سے ایک سال پہلے ہی دوستانہ تعلقات کا آغاز ہو چکا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پنڈت جواہر لال نہرو سے پہلی اور واحد ملاقات کا اثر شاید بعد کے سیاسی واقعات پر ہونے والا تھا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں پنڈت نہرو نے سنگاپور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت وہ ایک عام شہری تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک سرکردہ رکن جس نے چند ماہ پہلے کے عام انتخابات میں غیر مسلم نشست پر بھوپور کامیابی حاصل کی تھی۔ ان کی متوقع آمد سے جنوب مشرقی ایشیا کمان کے سپریم اتحادی کمانڈر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کر دیا گیا، اس کے ساتھ ہی اسے یہ رپورٹ بھی بھیجی گئی کہ ایک قوم پرست ہندوستانی رہنما کے اس غیر اہم دورے کو کمتر اہمیت دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ لہذا پنڈت نہرو کا نہ تو سرکاری طور پر استقبال کیا جاتے اور نہ ہی انہیں ہندوستانی فوجی دستوں سے ملنے کی اجازت دی جاتے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان احکامات کو فوراً بدل دینے کا حکم دیا۔ اس نے کہا: یہاں ایک ایسا شخص آ رہا ہے جو ہندوستان میں گہرا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ ہندوستان جس کے ساتھ آئینی آزادی کا وعدہ کیا جا چکا ہے اور جو درحقیقت آزاد ہندوستان کا پہلا وزیراعظم بن سکتا ہے۔ یہ انتہائی اہم ہے کہ اسے ناراض نہ کیا جاتے۔ بلکہ سیاسی اہمیت کے لحاظ اس کے ساتھ دوستی اور احترام سے پیش آیا جاتے تاکہ اس پر اثر انداز ہو جا سکے چنانچہ جہاں تک ممکن ہو اس دورے کے دوران اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش کیا جلتے تاکہ مسلح افواج کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کئے جا سکیں متعلقہ فوجی اور سول حکام نے وفاداری سے سپریم کمانڈر کی خواہشات پر عمل کیا۔ پنڈت نہرو کے لئے استقبالیے منعقد کئے گئے۔ نہرو نے فوجی اور سول حکام کے بڑے بڑے اجتماعات اور اجلاسوں سے خطاب کیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی دوستانہ ماحول میں گفتگو کی۔“

(”دی گریٹ ڈیو آئیڈ“؛ صفحہ ۲۱۳)

یہ ملاقات بظاہر بڑی دوستانہ رہی۔



”یہ نہایت کامیاب اور پُرسرت ملاقات تھی۔ اس موقع پر میں بھی موجود تھا اور یہ بالکل واضح تھا کہ دونوں حضرات نے ایک دوسرے پر اپنی اپنی شخصیت کے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔“

(مشن وِڈ ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۳۰)

بعد ازاں گورنر جنرل کی حیثیت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پنڈت نہرو کے اس مطالبے کا سامنا کرنا پڑا کہ انڈین نیشنل آرمی کے خلاف مقدمات روک دیتے جائیں اور موجودہ سزائیں منسوخ کر دی جائیں۔ اس مسئلے کے بارے میں :-

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو پنڈت نہرو کے ساتھ ”ابتدائی دور“ کی بات چیت کا فائدہ حاصل تھا جب نہرو نے سنگاپور کا دورہ کیا تھا اور ماؤنٹ بیٹن نے نہرو کو نہر غیب دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ انڈین نیشنل آرمی کی یادگار پر پھول چڑھانے کا خیال ترک کر دیں۔ اُس نے تب نہرو سے کہا تھا ”انڈین نیشنل آرمی اپنے ملک کے لئے لڑنے والے سیاسی لحاظ سے باشعور جاننا زوں پر مشتمل نہیں تھی بلکہ اس میں بزدل اور غرضال تھے جنہوں نے اپنے وفادار دوستوں کو دھوکہ دیا۔ آپ کی مستقبل کی فوج میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو اپنے حلف کے ساتھ وفادار ہیں۔ ورنہ اگر آپ ملک میں مقبول ہو گئے تو غیر وفادار فوج آپ کے خلاف ہو سکتی ہے۔“ پنڈت نہرو اس دلیل سے متاثر ہوئے مگر انہوں نے کہا کہ سیاسی وجہ کی بنا پر انہیں مقدمات روک دینے کا مطالبہ کرنا پڑے گا۔“

(دی گریٹ ڈیو ایڈ: صفحہ ۲۰۵)

جبلارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل کی حیثیت سے ۲۴ مارچ کو پہلی بار مسٹر نہرو سے ملا تو وہ اُن کے خلوص سے متاثر ہوا۔

(دی گریٹ ڈیو ایڈ: صفحہ ۲۳۲)

”پنڈت نہرو مجھے سب سے زیادہ مخلص لگے۔“ (دی گریٹ ڈیو ایڈ: صفحہ ۲۱۴)

”بات چیت کے آخر میں جب نہرو روانگی کے لئے اجازت لینے والے تھے ماؤنٹ بیٹن نے ان سے کہا ”مسٹر نہرو! میں چاہتا ہوں کہ آپ برطانوی راج کی بساط پیٹنے والے آخری والے سراپے سے زیادہ نئے ہندوستان کی راہ دکھانے والے پہلے شخص کی حیثیت سے میرا احترام کریں۔“ نہرو واپس مُڑے، وہ نہایت جذباتی نظر آ رہے تھے، مسکراتے اور کہا ”اب میں جان گیا کہ لوگوں کا مطلب کیا ہوتا ہے جب وہ آپ کی شخصیت کے سحر کو خطرناک قرار دیتے ہیں۔“ (مشن وِڈ ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۴۵)



بھروسوں کے درمیان تعلق استوار ہوتا ہے۔

”اپریل اور اوائل مئی، ۱۹۴۷ء کی گفت و شنید کے دوران ان دونوں کے درمیان ایسا قریبی اور ذاتی تعلق استوار ہوا جو واسطے اور کسی دوسرے ہندو، مسلمان یا سکھ کے درمیان موجود نہیں تھا۔ اور اس افہام و تفہیم نے خاص طور پر پنڈت نہرو کی طرف سے کانگریس سے انتقال اقتدار کا منصوبہ تسلیم کرانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا جس سے ۳ جون اور ۱۵ اگست کے درمیان انتقال اقتدار کے مراحل پر عملدرآمد خاصی آسانی سے ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی آئراؤ ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن کے تقرر اور دوسرے متعلقہ امور کا راستہ بھی ہموار ہو گیا۔ اس پس منظر میں یہ امر یقیناً بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ واسطے نے اپنی ذہنی اقتدار کے باعث پنڈت نہرو کو جو شہد میں اس کے ساتھ ہی بٹھہرے ہوئے تھے، حکومت برطانیہ کی جانب سے تیار کردہ انتقال اقتدار کا اولین ترسیم شدہ منصوبہ بھی دکھا دیا۔ یہ ایسا ڈرامائی واقعہ تھا جس نے قوموں کی تقدیر کو بدل کر رکھ دیا۔“

(دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۲۱۴)

ماہم ہنس کے نہرو کی شخصیت سے متعلق جائزہ سے اتفاق کرنا آسان نہیں ہے کہ ا۔۔۔ انہیں ہمیشہ کسی زیادہ مضبوط شخصیت کی ضرورت محسوس ہو کر تھی جو انہیں اعتماد دے سکے۔ ایک سزاوارتہ زمین یا خود اعتمادی رکھنے والی شخصیت جس کے فیصلے ان کی رہنمائی کریں یا خود ان کے فیصلوں کی توثیق کرے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں یہ شخصیت ان کے والد موتی لال نہرو کی تھی۔ زندگی کے بڑے حصے میں یہ ہاتھ گا ندھی تھے۔ کابینہ اور کانگریس کی سیاست کے اہم دنوں میں یہ کام سردار پٹیل کرتے تھے۔ جب وہ ان سے ناراض نہیں ہوتے تھے۔ اور اب تمام اہم اور بڑے بڑے معاملات میں یہ فریڈن خود ماؤنٹ بیٹن اور کر رہے تھے۔“

(دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۲۱۵)

بطور گواہ ا۔

”... لاؤ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے سٹاف کو بتایا کہ انہیں ان کی ”ذہنی اقتدار“ کہہ رہی ہے کہ انہیں (انتقال اقتدار کا) دوبارہ تیار شدہ مسودہ انتہائی رازداری سے پنڈت نہرو کو دکھا کر ان کا ذاتی عمل جاننا چاہیے، جو واسطے کے پرائیویٹ مہمان کی حیثیت سے شہد کے پہاڑوں پر واقع واسٹریٹس ٹریٹ



مشورہ میں مٹھہرے ہوتے تھے۔ اُس کے سٹاف نے اس بنا پر اس کے خلاف دلائل دیتے کر ایسا کرنا دوسرے پارٹی رہنماؤں کو یکساں طور پر باخبر یا بے خبر رکھنے کے اصول کے خلاف تھا۔ مگر وائسرائے کی ”ذہنی افتاد“ اتنی مضبوط تھی اور جنوب مشرقی ایشیا کمان نے اس کی ”ذہنی افتاد“ کو اس قدر اعتقاد بخشا تھا کہ اُس نے اپنی اسی جس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس شام عین اس وقت جب ان کا ہمان سونے کی تیاری کر رہا تھا وہ اسے ایک طرف لے گئے اور اس کو منصوبے کی ایک کاپی اس خیال کے ساتھ مطالعے کے لئے دے دی کہ وزیرِ اعظم محض ایک دوست کی حیثیت سے اُسے مشورہ دے کہ اسے کانگریس کے لئے کس طرح قابل قبول بنایا جائے۔

(دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۹۵، ۲۹۶)

اگلی صبح:-

”.... پنڈت نہرو کی جانب سے ایک خط موصول ہوا جسے وائسرائے نے ”مباری کا اولین گولہ“ قرار دیا۔ بھارتی وزیرِ اعظم (نہرو) کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کانگریس اس پلان میں شامل تجاویز کو مسترد کر دے گی اور ان سے پھر سے ہندوستان میں بے چینی کی لہر دوڑ جائے گی۔“

(دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۹۶)

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس جواب سے نہ صرف ولازاری ہوئی بلکہ وہ جھٹلا اٹھا۔“

(دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۹۷)

”پنڈت نہرو اور وائسرائے کے درمیان وضاحتی گفتگو اس روز بعد میں ہوئی۔ جب ماؤنٹ بیٹن کو ”بم کا گولہ“ موصول ہو گیا تو اس نے ہاتھ ملنے میں وقت نہیں گزارا۔ یہ دیکھنے کے بعد نہرو کا خط فوری طور پر تار کی صورت میں لندن بھجوا دیا گیا ہے اُس نے ایک اے۔ ڈی۔ سی کو مسٹر وی۔ پی۔ مینن، کمشنر اصلاحات کو بلائے کے لئے بھیجا جو اُس وقت نہرو کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ وائسرائے کے مینن کو شملہ بلوانے کی دُور اندیشی اب رنگ لانے والی تھی۔ خوش قسمت گھڑی نے ایک شخص اور ایک خیال کو یکجا کر دیا تھا۔“

(دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۹۹)

دُور اے کے لئے یہ ترکیب کس نے اختیار کی تھی؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا سٹاف



خود چاہتا تھا۔

”... مشیروں کی اس جماعت میں ایک چیز واضح طور پر نظر انداز کر دی گئی تھی۔ اس میں کوئی ہندوستانی شامل نہیں تھا۔ کسی ہندوستانی کی شمولیت ضروری تھی۔ خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اور وائسرائے کو درپیش مسئلہ پر فرقہ وارانہ چیلنج سے مطلوب تھی۔... لارڈ اسٹورٹ نے وائسرائے کو نشانہ ہی کی بجائے کہ اسے خود ہی پیہم ہندوستانی لیڈروں سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ وہ خالص برطانوی سٹاف رکھنے پر اعتراض نہیں کر سکتے مگر وہ وائسرائے کے سٹاف میں ایسے ہندوستانیوں کی شمولیت پر شدید شکوک و شبہات کا شکار ہوں گے جن کا تعلق ان کے فرقہ سے نہ ہو۔“

(دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۲۰۸)

دہلی میں لارڈ مائونٹ بیٹن نے کسی خاص ہندوستانی ذہن کی ضرورت محسوس کرنا شروع کر دی اور پوچھا کہ کون میسر آ سکتا ہے (دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۲۰۹)

پرائیویٹ سیکرٹری سر جارج ایبل نے کہا اصلاحات کمشنر سٹورٹ پی مینن ہندوستانی ہے۔ مگر وہ ہندو ہے اور اس کے کانگریسی لیڈر سردار ولجہ بھائی پٹیل سے خصوصی تعلقات ہیں۔ (ایضاً؛ صفحہ ۲۰۹) لارڈ مائونٹ بیٹن نے ”وی۔ پی مینن کو چاہتے پر بلایا اور اس کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس کی مینن کے لئے پسندیدگی برٹھتی گئی اور ایک سے زائد مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وائسرائے نے مینن کو بغیر پیشگی اطلاع کے اپنے مطالعہ کے کمرے یا خواہ گاہ میں گفتگو کے لئے بھی بلا بھیجا۔ یہاں تک کہ پلان کا پہلا مسودہ تیار ہونے سے کچھ عرصہ قبل اسے روزمرہ کی سٹاف بحث میں بھی شامل کیا جانے لگا۔ لارڈ مائونٹ بیٹن اسے متنی میں شملہ لے گئے جب وہ لیڈر اسٹورٹ کو پلان کا مسودہ دے کر لندن بھجوا چکے تھے۔ اور یہ سب لیڈی مائونٹ بیٹن کی طرف سے اثر انداز ہوتے بغیر نہیں ہوا۔ اس کے بعد صف اول کے تین چار سیاسی رہنماؤں کو چھوڑ کر یہ مینن ہی تھا جس نے نئی قوم کی تعمیر میں کسی بھی دوسرے ہندوستانی سے زیادہ حصہ لیا۔“

(دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۲۰۹)

”تاہم کوئی بھی اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا کہ وہ ہندو تھے اور اس وجہ سے مسلمان انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سردار ولجہ پٹیل کی وساطت سے اس کے کانگریس سے قریبی تعلقات کا علم بھی سب کو تھا اور وائسرائے کے نزدیک اگرچہ یہ بات زیادہ معنی نہیں رکھتی



تھی مگر اس سے اُس کی غیر جانبدار پوزیشن پر اثر پڑا۔ خاص طور پر بعد ازاں جب آئینی منصوبے پر اتفاق ہو گیا اور حکومت ہندوستان عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ تاہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس کی اہمیت سے واقف ہو چکا تھا اور مینن اس وقت پلٹا جب پنڈت نہرو کی جانب سے اس کا پلان پوری قوت کے ساتھ مسٹر دیکھا جا چکا تھا اور تب ہی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔“

مینن نے مسئلے کا کیا حل پیش کیا تھا؟ اس کا مرکزی نکتہ دو خود مختار ریاستوں کو جلد اقتدار منتقل کر دینا تھا۔

مینن کے دماغ میں اچانک کوئی خیال نہیں ابھرا تھا۔ ڈومینن ٹیٹس کی بنیاد پر فوری انتقال اقتدار سر دار پٹیل کے نزدیک عبوری حکومت کو درپیش بحران کا حل تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اپریل میں اسی قسم کے پلان کے حق میں اپنی راتے ظاہر کر چکا تھا۔ ۵ اپریل کو اس کی فیلڈ مارشل آکٹن ایک کے ساتھ گفت و شنید ریکارڈ پر موجود ہے۔ ”تب میں نے فیلڈ مارشل کو ہندوستان کے مستقبل کے ڈھانچے کے بارے میں موجود کئی متبادل خیالات میں سے ایک خاکہ سنایا جو میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ اس سکیم کا ایک پہلو ہندوستان کو فوری طور پر ڈومینن یا کامن ویلتھ ٹیٹس دے دینا تھا۔“

”۱۹ اپریل کو روزانہ کی سٹاف ٹیننگ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے چھ اصول یا مقاصد پیش کئے جن کا جائزہ لے کر سٹاف کے ارکان کو انتقال اقتدار کے پلان کے لئے دائرہ اس کے کی رہنمائی کرنا تھی اور اُسے نئے خیالات پیش کرنا تھے۔ ان میں سے ایک جسے دائرہ اس نے ”سب سے اہم سوال“ قرار دیا وہ جن قدر جلد ممکن ہو سکے ہندوستان کو ڈومینن جیتیت دینا تھا۔ اور اس کے اگلے ہی روز اس نے حکم دیا۔

”بڑے فیصلے کے لئے تیاریاں جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ غالباً جنوری ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو ڈومینن جیتیت دینے کے لئے منصوبہ بندی کی جائے۔“

”دی گریٹ ڈیو آئیڈ“ صفحہ ۳۰۵

۲۲ اپریل کو اس کی مسٹر دی کے کرشنا مینن کے ساتھ طویل بات چیت ہوئی۔



”میں نے گزشتہ بار اس کی جانب سے پیش کئے گئے خطوط پر یعنی جون ۱۹۴۸ء سے قبل ڈومینین چینیٹ دینے کے بارے میں اسے ایک حل پیش کیا تاکہ ہمارے جانے کے بعد کوئی اعلامیہ جاری کرنے کی ضرورت نہ رہے اور اس طرح ہندوستان دولت مشترکہ کے اندر رہے۔ میری تجویز بھی کہ... پاکستان اور ہندوستان کو آزاد ڈومینین قرار دے دیا جاتے۔ ایک مرکزی دفاعی کونسل ہو۔ ایک ہی فوج ہو (تقسیم کو ملتوی کرنے ہوتے) اور میں آئینی بنیاد پر مرکزی دفاعی کونسل کا سربراہ اور دونوں ڈومینین کا گورنر جنرل رہوں۔“ (ڈی گریٹ ڈیوائیڈ“ صفحہ ۲۴۲، ۲۴۴) وی۔ پی۔ مینن کے پلان پر عملدرآمد :

”اُس رات مینن نے واٹسراٹے کے ساتھ کھانا کھایا مگر اس سے پہلے وہ سردار ولجہ بھائی پٹیل کے ساتھ اپنا پرائیویٹ ذریعہ مواصلات استعمال کر چکا تھا۔ اس اثناء میں لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن کی خوش مزاجی اور خود اعتمادی بحال ہو چکی تھی۔ کیونکہ پنڈت نہرو اسے بنا چکے تھے کہ دن کے دوران مینن نے انتہائی عجلت میں جو پلان تیار کیا تھا وہ کانگریس کے لئے ناقابل قبول نہیں ہو گا۔ مینن کو دوپہر کے کھانے کے وقت پلان کا مسودہ تیار کرنے کی ہدایت کی گئی تھی اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ مسودہ شام چھ بجے تک تیار ہو جانا چاہیئے جس پر ہندوستانی میں برطانوی سلطنت کے اختتام کا طرہ مدار تھا۔ اگلی صبح دہلی میں سردار پٹیل اور شملہ میں نہرو کے درمیان ٹیلی فون پر نہایت اہم گفتگو ہوئی۔ اصل گفتگو مسٹروی۔ پی۔ مینن اور پٹیل کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹروی شنکر کے درمیان ہوئی (کیونکہ لائن میں کچھ خرابی تھی اور نہرو اور پٹیل خود گفتگو کرنے سے قاصر رہے تھے۔ پنڈت نہرو اس بات پر آمادہ تھے کہ ڈومینین سٹیٹس پلان قابل قبول ہے مگر وہ اسے کانگریس سے منظور کرانے کے متعلق پریشان تھے جس پر پٹیل نے فوراً جواب دیا ”یہ مجھ پر چھوڑیں یہ میرا کام ہے۔“ (ڈی گریٹ ڈیوائیڈ“ صفحہ ۳۰۸، ۳۰۹)

ولجہ بھائی پٹیل نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

اس کا مقصد کیا تھا؟ یہ صرف مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ محاذ آرائی تھا۔ اس کے پیش نظر ”گٹا چٹا اور کرم خوروہ“ پاکستان ایسی عجلت اور افراتفری میں قائم ہوئے دینا تھا کہ حالات کی تیز رفتاری پیدا کرنے کے ساتھ ہی جس کا گلا گھونٹ دے۔ اس طرح مسلم لیگ کو مجبور کر دیا جاتے



کہ وہ ہندوستان کی شرائط پر اس کے ساتھ دوبارہ الحاق کی درخواست کرے۔

ہندوستانی سیاست کا بیج ہمیشہ سے تصور پاکستان کے خلاف راتے رکھنے والوں سے پڑ رہا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اکثر مسلم لیگ کے مطالبہ کو ”یہ پاگل پاکستان“ کہا کرتا تھا۔

”۱۹۴۷ء میں برطانوی لوگوں کی اکثریت کی نظر میں اور ہندوستانیوں کی اکثریت کی نظر میں بھی برصغیر کی تقسیم سلطنت ہندوستان کا امن و سناک انجام یعنی ہندوستان کی وحدت تاریخ کے کسی بھی ہندوستانی راج کے مقابلے میں زیادہ مکمل اور محفوظ تھی اور یہی برطانیہ کے لئے بجا طور پر غر کا باعث تھی۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت قانون کی حکمرانی کا ایک نظام، مواصلات کا جال، اقتصادیات کا مربوط نظام، منظم فوج اور دوسری عسکری تنظیمیں، محفوظ سرحدیں اور ان کے اندر امن و اصول کی حکمرانی — یہی وہ عظیم تخلیقات تھیں جو برطانیہ میراث کے طور پر ہندوستانی جمہوریت کو دینا چاہتا تھا۔ آخری ٹکوں تک — جب چند ہفتوں کے دوران اس ”پاگل پاکستان“ کے بارے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن تقدیر کا فیصلہ لکھنے والا تھا اور تقسیم ہندوستان متعلقہ انگریزوں کی اکثریت کو ایک لازمی بُرائی کے طور پر نظر آرہی تھی، ان کی خواہش تھی کہ اگر ممکن ہو تو اس سے گریز ہی کیا جاتے۔“ (دی گریٹ ڈیو ایڈ: صفحہ ۵۲۳)

”تک معظم کی حکومت کی پالیسی بھی اس سلسلے میں اسی قسم کے دو غلے بن اور ذہنی انتشار کا شکار تھی۔ ان کی دوسری شخصیت کسی حد تک سیکرٹری آف سٹیٹ اور سرسٹیفورڈ کرپس اور دوسری جانب وائسرائے لارڈ ویول کے رویوں سے ظاہر ہوتی تھی۔ لندن میں موجود برطانوی وزراء جن کے مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کے ساتھ زیادہ ذاتی نوعیت کے تعلقات تھے، جن کی نظریاتی وابستگی جمہوریت اور اکثریت کی حکومت کے ساتھ تھی اور جنہیں ہندوستان میں اپنے مشکل مشن کی تقریباً کامیابی کا یقین ہو چلا تھا جس کو مسلم لیگ نے حقارت کے ساتھ مسترد کر کے ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا تھا ان کے خیال میں کانگریس کے تعاون کو ترجیح دی جانی چاہیے تھی۔ اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ کتے کتے وعدوں کو اسی پلان کی چھتری کے زیر سایہ پورا کیا جانا چاہیے تھا۔“ (دی گریٹ ڈیو ایڈ: صفحہ ۱۸۳)

یہاں تک کہ اپنے تقرر سے پہلے ہی وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندو نواز اور مسلم لیگ



مخالف ہونے کی شہرت رکھتا تھا۔ اس کے تقرر کے اعلان کے بعد لارڈ واسے نے کہا ”اُسے چرچل (منظر پر موجود) نظر تو آ رہا ہے مگر اس بات کی زیادہ امید نہیں ہے کہ اُسے مطمئن کیا جاسکے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ہندو نواز اور مسلم لیگ کے مخالف کی حیثیت سے ماقونٹ بیٹن کی نامزدگی سے نیا تقیہ کھڑا ہونے کا اندیشہ ہے۔“ (مشن وڈ ماقونٹ بیٹن، صفحہ ۲۳)

”... لارڈ ماقونٹ بیٹن قبل آزادی کے ہندوستان کے متعلق برطانوی باشندوں کی اکثریت کی اس سوچ سے اتفاق رکھتا تھا کہ ہندوستان کی وحدت کو توڑنا، جو کہ برطانوی راج کا طرہٴ امتیاز رہی ہے، ایک انوسناک انجام کی حیثیت رکھتا ہے جس کو وقت کی ضرورت نے اس پر مسلط کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک سیاسی اقدام تھا جس کی اپنی خوبیاں تھیں۔“

(دی گریٹ ڈیوائس، صفحہ ۳۹۵، ۳۹۶)

وزیراعظم کا دائرہ اسے کے نام ہدایات (لیٹر آف انسٹرکشنز) ان الفاظ سے شروع ہوتی ہیں :

”ملک معظم کی حکومت کا عزم ہمیں ہے کہ برطانوی ہندوستان اور ہندوستان ریاستوں کے لئے دولت مشترکہ کے اندر آئین ساز اسمبلی کے ذریعے وحدانی طرز حکومت حاصل کیا جاتے جسے کینٹ مشن پلان کے تحت قائم کر کے چلایا جا رہا ہو۔ آپ کو اپنے اختیارات کے اندر رہتے ہوئے اس بات کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ تمام جماعتوں کو اس مقصد کے حصول کے لئے مل کر کام کرنے کی ترغیب دیں۔ اور ملک معظم کی حکومت کو اس پیش رفت کی روشنی میں مشورہ دیں کہ مزید کیا اقدامات کئے جائیں۔“ (دی گریٹ ڈیوائس، صفحہ ۵۴)

مگر کینٹ مشن پلان کو مسٹر نہرو اور کانگریس نا قابل تلافی نقصان پہنچا چکے تھے۔ لارڈ ماقونٹ بیٹن کے سوال کا جواب مسٹر لیاقت علی خان نے یوں دیا :-

”جمہوری حکومت میں کانگریس ارکان کے ساتھ اپنے معاملات کے آغاز سے میں نے محسوس کیا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کام کرنا بالکل ناممکن ہے کیونکہ ان میں سمجھوتے یا مثبت طرز عمل کا جذبہ بالکل نہیں ہے۔۔۔ اگر یوہ ایک ایسی مسلم لیگ کو صرف صبر اسے سندھ دینے کی پیشکش کریں تو میں اُسے قبول کرنے اور ان حالات میں الگ مسلم مملکت کے حصول کو اس پر ترجیح دوں گا کہ کانگریس کے



ساتھ معاہدہ کر کے اور بظاہر زیادہ مراعات کے ساتھ کام جاری رکھوں۔  
 (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۲۴)

مسٹر جنرل نے بھی یہی بات کی۔  
 ”کینٹ مشن پلان کی تمام تر بنیاد یہ تھی کہ اس پر تعاون اور باہمی اعتماد کے جذبے کے ساتھ کام کیا جاتے گا۔ اب ایک برس کے بعد فضا شدید خراب ہو چکی ہے اور یہ واضح تھا کیونکہ کانگریس نے کسی بھی صورت میں پلان پر اس کی اصل روح کے مطابق عمل کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ ہندوستان کسی بھی ایسے مرحلے سے آگے بڑھ چکا ہے جہاں سمجھوتے پر یعنی کسی صل کے قابل عمل ہونے کا امکان ہو۔“  
 (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۲۵)

اس بات کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر میں لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن نے کینٹ مشن پلان میں مذکور خطوط پر کسی حد تک اتحاد کے لئے کوشش کی مگر جوں جوں اس کی کوشش بڑھتی گئی یہ واضح ہوتا گیا کہ مسئلے کا یہ حل ختم ہو چکا ہے۔  
 (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۲۷)

کانگریسی قیادت نے اب ایک اور پتہ پر ابد لا۔ مسٹر ٹیل نے واٹسرا تے کو بتایا کہ مسٹر جنرل: ”... صرف اس صورت میں کینٹ مشن پلان قبول کریں گے جب حالات کا دباؤ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ کھلا نہ چھوڑے۔ برطانیہ نے بار بار غلطیاں کر کے جنرل کو بچانے کا کوئی نہ کوئی راستہ کھلا چھوڑے رکھا اس کے خیال میں واٹسرا تے جو نہی تقسیم بنگال کا اعلان کرے گا تو بنگالی اپنے صوبے کو متحد رکھنے کے لئے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لیں گے۔ اور شاید پنجاب میں بھی ایسا ہی ہوگا چنانچہ سردار پٹیل نے سوچا کہ اس صورت میں یقیناً ایسا موقع ہے کہ جنرل یا تو ان کی شرائط مان لیں گے یا لیگ میں ان کی جگہ کوئی اور لے لے گا۔“  
 (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۲۵)

مولانا ابوالکلام آزاد واٹسرا تے کو بتا چکے تھے کہ اگر وہ تقسیم بنگال کا اعلان کر دے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ بنگال کے مسلمان مسلم لیگ سے الگ ہو جائیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ اس کا امکان نسبتاً کم ہے مگر ایسا ہی پنجاب میں بھی ہو گا۔  
 (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۲۵)



”مسٹر جیو رام نے خیال ظاہر کیا جسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت ”سب سے دانشمندانہ خیال“ قرار دیا کہ اگر مسلمانوں کو ان کے مرضی کے مطابق کام کرنے دیا جائے۔ خاص طور پر اگر ان کی منزل کو بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے محدود کر دیا جائے تو وہ از خود پاکستان کو ناقابل عمل پائیں گے اور رضا کارانہ طور پر ہندوستانی یونین میں شامل ہو جائیں گے۔“

(”دی گریٹ ڈیو ایڈ“ صفحہ ۲۴۵)

اس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناحؒ اور مسلم لیگ کو تقسیم ہندوستان سے باز رکھنے کے لئے ”کرم خوردہ“ پاکستان کی دھمکی دی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے زور دیا کہ اگر :-

”.... وہ پورے ہندوستان کی تقسیم کے لئے دیئے جانے والے دلائل کو تسلیم کر لے تو

منطقی طور پر وہ خود کو اس پر مجبور پاتا ہے کہ ان دلائل کو پنجاب اور بنگال پر بھی لاگو کیا جائے۔

مسٹر جناحؒ نے اس ظاہری منطق سے اتفاق کیا مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ

انہیں ”کرم خوردہ“ پاکستان نہ دیا جائے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کانگریس کی جانب سے محض ایک

جیلہ طرازی تھی تاکہ مسٹر جناحؒ کو خوفزدہ کر کے مطالبہ پاکستان سے باز رکھا جاسکے مگر انہیں اتنی

آسانی سے خوفزدہ نہیں کیا جاسکا۔ انہوں نے کہا ”واستراے کانگریس کے پلان میں چھٹن کرانٹونال

غلطی کریں گے۔“ (”دی گریٹ ڈیو ایڈ“ صفحہ ۲۲۶، ۲۲۷)

واستراے نے لکھا ”مجھے اندیشہ ہے کہ میں نے بوڑھے شریف آدمی کو واقعی پاگل بنادیا ہے۔“

(”دی گریٹ ڈیو ایڈ“ صفحہ ۲۲۷)

”مسٹر جناحؒ نے واستراے سے دوبارہ اپیل کی کہ انہیں ”کرم خوردہ“ پاکستان نہ دیا جائے۔

اور انہیں واستراے کے اصرار سے دوبارہ مایوسی ہوئی کہ تقسیم کی منطق اگر ہندوستان پر نافذ کی

گئی تو اسے صوبوں یعنی بنگال اور پنجاب پر بھی نافذ کیا جائے گا۔“

(”دی گریٹ ڈیو ایڈ“ صفحہ ۲۲۵)

یہ منطق آگے پیچھے سرکاتی جاتی رہی۔ مسٹر جناحؒ نے پوری شدت کے ساتھ بنگال اور پنجاب

کی تقسیم کو مسترد کر دیا مگر ایسا کرنے کے اندیشے کو ختم نہ کیا جاسکا۔

(”دی گریٹ ڈیو ایڈ“ صفحہ ۲۳۱)



چنانچہ مینن کے شملہ پلان میں دونوں ملکوں کے لئے ڈومینین سٹیٹس نیا عنصر نہیں تھا۔ سردار پٹیل اس سچتر یقین کے ساتھ فوری انتقالی اقتدار پر اصرار کر رہا تھا کہ اس کا نتیجہ ایک مردہ پاکستان کی صورت میں نکلے گا۔ قبل ازیں گفت و شنید کے دوران لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو سے پوچھا تھا:۔۔۔ ”اگر مسٹر جناح کو بتا دیا جائے کہ انہیں ان کا پاکستان دے دیا جائے گا — تو کیا یہ بات انہیں حقائق کے قریب تر نہیں لے آئے گی؟ نہرو نے اتفاق کیا کہ تقسیم کی ٹیمیں کے لئے میسر وقت کی کمی کی وجہ سے مسٹر جناح کو خوفزدہ کر کے تعاون کے لئے آمادہ کرنا ممکن ہے۔“

(دی گریٹ ڈیوی آئیڈ، صفحہ ۲۳۲)

یہ مختصر وقت، جون ۱۹۴۸ء تک تھا۔ مسٹر پٹیل کے اصرار کے مطابق اگر اس عرصہ کو محض دو ماہ تک محدود کر دیا جائے تو دھمکی کس حد تک زیادہ متاثر ثابت ہو سکتی تھی۔ وی۔ پی۔ مینن کے مطابق:۔۔۔ ”جمہوری خاکہ یہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو ہندوستان سے جدا کر دیا جائے اور ڈومینین حیثیت کی بنیاد پر بھارت اور پاکستان کی دو مرکزی حکومتوں کو اقتدار منتقل کر دیا جائے اور ان دونوں کا اپنا اپنا گورنر جنرل ہو۔ وائسرائے نے کہا جہاں تک اس کا تعلق ہے اسے یہ معاملہ کافی آسان محسوس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ یونین آف انڈیا کو ڈومینین سٹیٹس کی بنیاد پر قبل از وقت انتقالی اقتدار کی صورت میں کچھ عرصہ کے لئے پاکستان میں کوئی حکومت نہیں ہوگی جسے اقتدار منتقل کیا جاسکے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس صورتحال سے کوئی ایسی مشکل پیدا نہیں ہوگی جس پر تاب نہ پایا جاسکے۔ اور یہ کہ ہم اس کا بھی حل نکال سکتے ہیں نہرو۔۔۔۔۔ نے کہا زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ڈومینین سٹیٹس کی بنیاد پر جلد از جلد اقتدار منتقل کر دیا جائے۔“

(دی ٹرانسفر آف پاؤر ان انڈیا، صفحہ ۲۶۰)

”۔۔۔۔۔ بعد ازاں شملہ میں اُسے (وی۔ پی۔ مینن کو) ڈومینین سٹیٹس قبول کرنے کے متعلق پٹیل کی شرط پیش کرنے کا موقع ملا۔ شرط یہ تھی کہ انتقالی اقتدار دو ماہ کے عرصہ میں مکمل ہو جائے۔“

(مہاتما گاندھی، دی لاسٹ فیئر، جلد دوم، صفحہ ۱۵۴)

ستمبر ۱۹۴۹ء میں بھارتی آئین ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے سردار پٹیل نے کہا:۔۔۔ ”میں تقسیم پر آخری چارہ کار کے طور پر راضی ہوا۔۔۔۔۔ مسٹر جناح لگا بھٹا پاکستان نہیں چاہتے



تھے مگر انہیں اس پر راضی ہونا پڑا۔ میں نے ایک اور شرط لگائی کہ دو ماہ کے عرصہ میں انتقال  
اقتدار کر دیا جانا چاہیے۔ (ان ڈومی ٹیبل سروراء: صفحہ ۱۲۴)

لارڈ ڈاؤنٹ بیٹن نے خود اس بات کی تعریف کی کہ مینن کا منصوبہ پاکستان کے لئے تباہ کن  
ثابت ہو سکتا ہے۔ ۹ مئی ۱۹۴۷ء کو اپنی ایک سٹاف میٹنگ کے دوران تقسیم ہندوستان میں  
درپیش انتظامی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے:-

”اس نے اس بات کو پسند کیا کہ خاص طور پر پاکستان کے لئے بہت سی مشکلات تھیں مگر  
وہ تو حالات کی میراث تھیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ انتظامی لحاظ سے کوئی مستقل  
عمارت بنانا اور ایک چیمبر کھڑا کرنا یا خیمہ نصب کرنا بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا  
تعلق ہے ہم محض ایک خیمہ نصب کر رہے ہیں۔ ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔“  
(مشن وڈاؤنٹ بیٹن: صفحہ ۸۷)

مارچ ۴ء کے اوائل میں برطانوی دارالعوام میں لیبر حکومت کے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کے بیان پر  
ایک بحث میں حصہ لیتے ہوئے مسٹر چرچل نے کہا: ”اس حکومت نے اپنے تازہ ترین عمل کے ذریعے  
پندرہ ماہ کی پابندی لگا کر نئے وائسرائے کو معذور کر کے رکھ دیا ہے یہاں تک کہ ایجنڈا میں  
شامل امور کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے امکان کو بھی ختم کر دیا ہے۔“ انہوں نے مزید کہا: ”کم از کم  
ہمیں یوں شرمناک طریقے سے قبل از وقت اور جلد بازی میں بھاگ کھڑے نہیں ہونا چاہیے۔ یا  
کم از کم ہمیں شرمندگی کے اس دردناک احساس کو نہیں بڑھانا چاہیے جو ہم میں سے کئی محسوس  
کرتے ہیں۔ ایک ایسا احساس جو بددیانتی اور داغدار دامن کی وجہ سے محسوس کیا جا رہا ہے۔“  
(مشن وڈاؤنٹ بیٹن: صفحہ ۸۷)





## ۳

۲ جون ۱۹۴۷ء کو وزیراعظم ایٹلی نے تقسیم ہندوستان کی سکیم کا اعلان کیا۔ سانچہ تیار کیا جا چکا تھا۔ ہندوستان کو دو ڈومینین کی صورت میں آزادی دی جانے والی تھی۔ مگر تقسیم کس طرح عمل میں آنے والی تھی؟

بنگلہ اور پنجاب کے صوبوں کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کیا جانا تھا۔ ملحقہ مسلم اکثریتی آبادی والے علاقے پاکستان میں اور ملحقہ غیر مسلم آبادی والے علاقے ہندوستان میں شامل کئے جانے تھے۔ سرحدوں کے تعین میں ”دوسرے عوامل“ کا بھی خیال رکھا جانا تھا جن کی تشریح منہیں کی گئی تھی۔ بنگال اور پنجاب کے لئے دو باؤنڈری کمیشن تشکیل دیئے جانا تھے۔ جن میں سے ہر ایک کو ہائی کورٹ کے چار چار ججوں پر مشتمل ہونا تھا۔ چار میں سے دو جج مسلم اور دو غیر مسلم ہوتے۔ تعطل کی صورت میں، جوناگڑہ، تھانا، ایک متفقہ ثالث فیصلہ دے گا جس کی پابندی فریقین پر لازمی ہوگی۔ بعد ازاں یہ طے پایا کہ ایک برطانوی وکیل سر سیرل ریڈ کلف ثالث ہوگا۔

کیا دونوں ڈومینین کے لئے آغاز میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل رکھا جانے والا تھا؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ ایک ہفتہ بعد اس کی مسٹر گاندھی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ اس ملاقات میں مسٹر گاندھی نے ”کام کی بات کرنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔۔۔ ہم دوستی کی راہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔“

(دی گریٹ ڈیوائنڈ؛ صفحہ ۲۲۰-۲۲۱)

وہ اگلے روز پھر سے اور مسٹر گاندھی نے آئینی مسئلے کے بارے میں اپنا حل پیش کیا۔ ”انہوں نے ایک اور تجویز پیش کی جس پر وائسرائے اور جی حیرت زدہ رہ گیا کہ اُسے یعنی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو آزاد ہندوستانی قوم کے سر پر غیر معتد اعزہ کے لئے ”ہندوستان کے خادم“ کی حیثیت سے موجود رہنا چاہیے۔“



اس خوشامد خراج تحسین پر وائسرائے اس پیشکش کو قبول کرنے اور ذاتی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گیا مگر اس نے اپنے بحریہ کے کیرئیر اور ذاتی مجبوریوں کی آڑ لی۔ مسٹر گاندھی نے محسوس کیا کہ جب وقت آئے گا تو وہ اپنی سوچ بدل لے گا۔ (بحوالہ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“؛ صفحہ ۲۲۲)

مسٹر گاندھی کا خیال درست تھا۔ انہوں نے بیج بو دیا تھا۔ اور وہ نہایت تیزی سے پھلنے پھولنے لگا۔ صرف تین ہفتے کے بعد لاڈ مارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر کرشنا میٹن کو مسئلے کا ایک حل پیش کیا جس کے مطابق اقتدار دو آزاد ڈومینین کو منتقل کیا جاتا اور وہ خود آئینی بنیاد پر دونوں کا مشترکہ گورنر جنرل ہوتا۔ (بحوالہ: ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“؛ ۲۴۳، ۲۴۴)

کانگریس نہ صرف اس بات پر آمادہ تھی بلکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ دونوں آزاد مملکتوں کا مشترکہ گورنر جنرل بنے۔ اور اگر اس میں ناکامی ہو تو وہ آزاد ہندوستان کا گورنر جنرل ضرور ہو۔ ایسی صورت میں اس بات کا شدید امکان موجود تھا کہ یہ سمجھوتہ ہندوستان کے فائدے اور پاکستان کے خلاف تعصب کے لئے استعمال کیا جاتا۔ گزشتہ صفحات میں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی دکھا جا چکا ہے کہ خود مسٹر نہرو براہ راست اور سردار پٹیل وائسرائے کے آئینی مشیر دی۔ پی۔ مینن کے ذریعہ ہمیشہ وائسرائے کے اندرونی مشیر بنے ہوتے تھے۔ نئے حالات کے مطابق گورنر جنرل کو ہندوستان کے معاملے میں نئے وزیراعظم مسٹر نہرو کے مشورے پر چلنا ہوتا اور اس سلسلے میں کوئی مشکل پیش آنے کا امکان نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی موجود تھی ہر ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوتے اپنے تعلقات کی بنا پر طاقت اور حمایت حاصل کر سکتا تھا۔

پاکستان کے معاملے میں یہ انتظام کس طرح کام کرے گا؟ ماؤنٹ بیٹن کے پاکستان کا گورنر جنرل ہونے کی صورت میں مسٹر جناح پاکستان کے وزیراعظم ہوتے یا جب گورنر جنرل خود دہلی میں ہوتا تو مسٹر جناح قائم مقام گورنر جنرل ہوتے۔ (دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۳۳۱)

لاڈ مارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر جناح کے درمیان کیے تعلقات تھے؟  
دونوں کی پہلی ملاقات ۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو ہوئی۔ لاڈ مارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پہلا ردِ عمل یہ تھا: ”میرے خدا۔ وہ سردمزا ج ہیں۔ گفتگو کا زیادہ تر حصہ ان کی سردمزا جی کی برف پگھلانے میں گزر گیا۔“ (بحوالہ: مینن و ماؤنٹ بیٹن؛ صفحہ ۵۶)



اُس رات مسٹر جناحؒ اور ان کی ہمیشہ ماؤنٹ بیٹن کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ ڈیزاگی رات پر ملتوی کر دیا کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ ”وہ اسی روز ان کے ساتھ دوسری نشست منعقد کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔“ (بحوالہ ”مشن و ماؤنٹ بیٹن“)

”اس ابتدائی ملاقات کے بعد اپنے تاثرات لکھتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناحؒ کو ”سرمزاج، جارح طبع اور احساس تفاخر میں مبتلا“ شخص قرار دیا تاہم اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناحؒ کو اشتغال انگیز پایا تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسٹر جناحؒ بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اتنا ہی مشتعل ہوتے ہوں گے۔“ (بحوالہ ”دی گریٹ ڈیلو ایڈ“؛ صفحہ ۲۱۶)

”ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر جناحؒ کے ”اہم نظر آنے کے جذبہ“ کے متعلق لکھا :  
 ”اور کبھی کبھی ان کے ہاں اقتدار کا بے پناہ اظہار جنوں کی حد تک نظر آتا.... وہ اکثر محسوس کرتا کہ اس نے جناحؒ کو سیاسی دلائل میں شکست دے دی ہے مگر اسے اپنی بہترین ترغیب استعمال کرنے کے باوجود ایک انچ بھی آگے بڑھنے کا موقع نہ ملتا۔ اس طرح کوئی پیش رفت نہ ہو پاتی۔  
 دوسری طرف جب قانونی اور آئینی نکات پر دلائل کا تبادلہ ہوتا تو جناحؒ ہمیشہ درست بات کہتے... آخر میں دونوں کے درمیان اندرونی تعلق صرف ایک مقابلے کا ہوتا۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیلو ایڈ“؛ صفحہ ۲۱۸)

”... بعد ازاں دونوں کے درمیان تعلقات میں ایسی کوئی بات نہ بھتی جس کی مثال دی جا سکے۔  
 کہ وہ خیر خواہانہ ڈیلو میسی جس کو ماؤنٹ بیٹن مہنایت و ذہانت کے ساتھ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اسے وہ (فائدہ اٹھانے والی) اہم شخصیت پر خصوصی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنے کی توقع رکھے بیٹھا تھا۔ درحقیقت یہ خود وائسرائے کے اُس دور کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گفتگو کے دوران اکثر ایک دوسرے کو تھکا دیتے تھے اور کبھی چپقلش کا شکار نہ ہونے کے باوجود ان کے درمیان باہمی اہتمام و تقسیم کی بنیاد موجود نہیں ہوتی تھی۔“ (بحوالہ ”دی گریٹ ڈیلو ایڈ“؛ صفحہ ۲۱۵، ۲۱۶)  
 پھر بھی مسٹر جناحؒ نے ایک مصالحتی صل پیش کیا جو ماؤنٹ بیٹن کے پیش کردہ آئینی بنیاد پر دونوں مملکتوں کے لئے مشترکہ گورنر جنرل کے خیال سے زیادہ عملی اور حقیقت پسندانہ تھا۔ اس قسم کا گورنر جنرل صرف متعلقہ کابینوں کے مشوروں پر ہی عمل کر سکتا تھا اور اسے مسلسل دونوں نئی مملکتوں



کے درمیان اختلاف کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا جس سے ٹھٹھنے کے لئے اس کے پاس کوئی اختیار نہ تھا۔ اس کی ناشکی کی کوششیں کسی بھی فریق کے بے چلک رویہ کے باعث ناکام بناتی جا سکتی تھیں۔  
 ”والسراے کا ذہن مشترکہ گورنر جنرل کی صورت میں ایک سپریم آئینی اختیاری کے قیام کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دونوں مملکتوں کے درمیان ناگزیر طو پر پیدا ہونے والے اختلافات کے خاتمہ کے لئے پُل کا کام دینے کے علاوہ ثالث کی حیثیت سے انہیں منظم سکے۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیوائس“ صفحہ ۳۲۹)

”مسٹر جناح زور دے رہے تھے کہ اُسے یقیناً عبوری دور میں نگرانی کے لئے دو مملکتوں کے مشترک سربراہ کی حیثیت سے برقرار رہنا چاہیے۔“ (بحوالہ ”مشن و دوائس بیٹن“ صفحہ ۱۱۵)  
 ”ڈوائس بیٹن کا اولین مفروضہ یہ تھا کہ مسٹر جناح کے ذہن میں بھی ایک مشترکہ گورنر جنرل کا خیال موجود تھا اگر جب وہ لندن میں تھے تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ مسٹر جناح تین گورنر جنرل چاہتے تھے۔ ایک ہندوستان کے لئے، دوسرا پاکستان کے لئے اور تیسرا خود ڈوائس بیٹن جو دونوں مملکتوں کے اوپر سپریم ثالث کی حیثیت سے موجود ہوتا۔ تاکہ آٹاؤں کی تقسیم کی جاسکے جن میں سے بیشتر ہندوستان میں تھے۔“ (بحوالہ ”مشن و دوائس بیٹن“ صفحہ ۱۱۸)

اسے ”برطانوی حکومت نے ناقابل عمل قرار دے کر فوراً مسترد کر دیا۔“ (ایضاً صفحہ ۱۱۵)  
 یہ سمجھنا دشوار ہے کہ اگر اس قسم کے انتظام پر فریقین راضی ہو جاتے تو اسے کیوں اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سپریم سربراہ کی ناشائستگی کو کسی بھی تنازعہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے آئینی اختیار کی کثرت پناہی حاصل ہوتی۔ صرف اس حقیقت کے باعث کہ اس کے پاس ایک موثر اختیار موجود ہے، بہت سے معاملات میں اس کے استعمال کی ضرورت ہی نہ پیش آتی تاہم لاڈو وائٹ بیٹن یہ اختیار خود نبھانے کے خیال سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے مسٹر جناح کے ساتھ تبادلہ خیال کیا:  
 ”... پوری قوت کے ساتھ مصالحتانہ حل کے لئے کوشش کی کہ جب بھی مشترکہ گورنر جنرل پاکستان میں نہ ہو جو کہ سال کے بیشتر حصے میں نہیں ہو گا کیونکہ وہ دہلی میں تقسیم ہندوستان کا کام اس کی سرپرستی میں جاری رہے گا۔ تو اس کی عدم موجودگی میں ایک قائم مقام گورنر جنرل ہونا چاہیے۔ جو غالباً مسٹر جناح ہی ہوں گے۔ یہ ترکیب بل کے مسودہ میں شامل کرنے کے بعد وہ مشورہ کے لئے



کھس گیا اور یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو گیا کہ اس تجویز کو کانگریسی رہنماؤں کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔ مگر سٹر جناحؒ نے اسے ماننے سے کیسرا انکار کر دیا۔ دو روز بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی وزیر خارجہ کو اس بات چیت کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اسے ”بم شیل“ قرار دیا۔ وہ اپنے زخم دکھانے اور مخالفانہ ردِ عمل کا دوسروں کے سامنے اظہار نہ کرنے میں ناکام رہا۔

”جناحؒ نے صدقِ دل سے مجھے یقین دلایا کہ وہ مشترک گورنر جنرل کی تجویز ترک کرنے کے تمام تر نقصانات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کی خواہش تھی کہ میں وائسرائے یا سپریم گورنر جنرل کی حیثیت سے کام کرتا رہوں تاکہ تقسیمِ کامِ خوبی کے ساتھ انجام پاتے ہوئے ۱۵ اگست کو پاکستان کے گورنر جنرل کے علاوہ کوئی دوسرا عہدہ قبول کرنے پر تیار نہ رہے۔

”میں نے ان سے پوچھا: کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو اس کی کیا قیمت دینا پڑے گی؟ انہوں نے غماں لہجے میں کہا: ”مجھے اثاثوں کی صورت میں شاید کروڑوں روپے قیمت ادا کرنی پڑے۔“ جس پر میں نے کسی قدر تیر لہجے میں کہا: ”شاید آپ کو اس کی قیمت تمام اثاثوں اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔“ پھر میں اٹھا اور کمرے سے نکل آیا۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“؛ صفحہ ۲۲۱)

”قبل ازیں برطانوی وزیر خارجہ کے نام لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک خط میں اپریل تا وسط اگست ۱۹۴۷ء کے وائسرائے آفس کے فرائض نبھانے کے سلسلے میں دہلی میں سٹر جناحؒ کے ساتھ ہونے والی اپنی پہلی گفت و شنید کے متعلق لکھا تھا: ”یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس کے پاس اس تمام ضرورتِ حال کی چابی ہے۔ یہ بالکل صحیح تھا اور اسے مان لینا بالکل درست تھا۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“؛ صفحہ ۲۱۵)

”اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ دونوں ملکوں میں سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا دل کہاں دھڑکتا تھا۔ روزمرہ کی سیاست میں اس کے قریبی ترین تعلقات پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کے ساتھ تھے نہ کہ سٹر لیاقت علی خان اور سٹر جناحؒ کے ساتھ۔ اُس کے ساتھ ان لوگوں کے سوا کوئی اور ذاتی دوستی اور بے تکلفی کے ذوقِ تعلقات استوار کر سکا تھا اور نہ ہی کوئی اس کی حکومت کا رکن تھا۔ اس کے سرکاری ہندوستانی مشیر جن پر وہ بھروسہ کرتا تھا وہ بھی تمام ہندو تھے جبکہ اس کا بڑا مسلمان دوست



اور رسانی رکھنے والا شخص نواب آف بھوپال پاکستان کا ستون ہونے کی بجائے ہندوستان میں زیادہ تر ایک پرابلم ہی تھا۔ مہاتما گاندھی کے لئے آخری دائرے کے دل میں خاص محبت تھی۔ اس قسم کے ذاتی تعلقات کسی بھی شخص کا سیاسی رویہ بدل کر رکھ دیتے ہیں۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیرائیڈ“ صفحہ ۳۹۵)

وزیراعظم اینڈی لے جولائی ۱۹۴۷ء میں انڈین انڈی پنڈنس بل کی دوسری خواندگی کے موقع

پر کہا:-

”ہمیں بتایا گیا تھا کہ تمام متعلقہ فریقوں کے لئے یہ بات آسانی کا باعث ہوگی کہ ابتدا میں کچھ عرصہ کے دوران دونوں مملکتوں کے لئے ایک ہی گورنر جنرل ہو۔ اس لئے ہم کچھ عرصہ تک اسی مفروضہ کے تحت کام کرتے رہے۔ تاہم حال ہی میں یہ واضح ہوا ہے کہ مسلم لیگ پاکستان کے لئے ایک الگ گورنر جنرل کا تقرر چاہتی ہے۔“ (بحوالہ ہانسرڈ، ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء، کالم ۲۲۴۹)

اور کچھ دیر بعد کہا:-

”دونوں نئی مملکتوں کے مشترک گورنر جنرل کی حیثیت سے اس کے (ماؤنٹ بیٹن) تقرر سے پورا براعظم ہندوستان مستقبل کے عظیم تر فوائد سے بہرہ مند ہوتا۔ تاہم ایسا نہ ہو سکا۔“

(ہانسرڈ، ۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء، کالم ۲۴۵۰)

جبرت ہوتی ہے کہ ایک بڑے ملک کے وزیراعظم کے ذمہ دار عہدے پر فائز شخص صورتحال سے اس قدر بے خبر کسی طرح ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب اُسی روز بل پر بحث کے دوران لارڈ جان ہوب نے فراہم کر دیا۔ اُس کا باپ مارکوٹس آف ہلنگھام ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۳ء تک ہندوستان کا وائسرائے رہ چکا تھا اور وہ خود بھی کئی بار ہندوستان کا دورہ کر چکا تھا۔ اس طرح اسے وہاں کے حالات کا وزیراعظم سے زیادہ بہتر طور پر علم تھا جس نے ۱۹۲۷ء-۱۹۲۸ء میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور جس کے بعد اس کے ہندوستان کے بارے میں ذرائع معلومات محض سرکاری مکتوبات اور کانگریسی رہنماؤں کے پراپیگنڈا خطوط تک محدود تھے۔ ہندوستانی معاملات پر اس کا سب سے قریبی مشیر سر شیفرڈ ڈکرسن تھا جو کانگریس کا کٹر حامی تھا۔ مشترک گورنر جنرل کے سوال پر لارڈ جان ہوب نے کہا:-



”... میرے خیال میں یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ دو ملکوں کے لئے ایک گورنر جنرل مقرر نہیں کیا جا رہا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر کس طرح اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک طرف تو ہندوستانی وزیروں سے مشورہ لے گا اور دوسری جانب پاکستان میں مسلم لیگ کے وزیروں کے اسی موضوع پر بالکل مختلف مشوروں پر عمل کر سکے گا۔۔۔“

(ہانسرڈ: ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء، اکالم ۲۵۲، ۲۵۳)

مسٹر ایٹلی نے مسٹر جناح کی درخواست اپنی نامزدگی کو اپنا پسند ہی کا ایک نمونہ قرار دیا۔

(دی گریٹ ڈیبر ایٹس: صفحہ ۳۳۵)

بعض مواقع پر کچھ پاکستانی اس مفروضہ میں ملوث نظر آتے ہیں کہ پاکستانی جن مشکلات کے ساتھ معروض وجود میں آ رہا تھا اگر مسٹر جناح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مجوزہ انتظام سے اتفاق کر لیتے تو ہندوستان کے ساتھ محاذ آرائی کی صورت میں پیش آنے والی مزید مشکلات سے بچا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کنگرہ رہنا اس بات کے بے ثباتی سے خواہش مند تھے کہ تقسیم کا عمل ہموار انداز میں مکمل ہو اور وہ مسائل جنہیں انہوں نے لازماً اٹھانا تھا، وہ جہاں تک انسانی استطاعت میں تھا مشترک گورنر جنرل کی موجودگی میں انہی کے مفاد کے مطابق طے پانا تھے۔ انہوں نے اس کے اقدام کو پہلے ہی سے قبول کر لیا تھا اور اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد بھی نہیں تھا۔ مندرجہ ذیل پیرا اس حقیقت کو اور واضح کرتا ہے۔ وہ پاکستان کے لئے معاملات کو آسان بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان کے عزائم اس کے قطعی برعکس تھے:

”اُن دنوں تمام اعظم کی تقریروں میں پاک و ہند دوستی کی حقیقی خواہش جھلکتی تھی جو کہ یقیناً چھوٹے ملک کے مفاد میں تھی۔ اور فرقہ وارانہ جھگڑے کے خاتمہ پر زور دیا جاتا تھا جس سے نئی قوم کا وجود خطرے میں پڑ سکتا تھا اور ہندوستان میں رہ جانے والی بڑی مسلمان اقلیت کی زندگیوں کو خدشہ لاحق ہو سکتا تھا۔ مگر تقسیم کی صحیح ہندوستانی قوم پرستوں کے ساتھ ساتھ پاکستانیوں کے لئے بھی رنج و الم کی تصویر بن کر آتی تھی۔ انہیں پاکستان تو مل گیا تھا مگر یہ وہی ”گرم خوردہ“ پاکستان تھا جسے جناح ناپسند کرتے تھے۔ یہ پاکستان بنگال اور پنجاب کی تاریخی مسلم فرمانروائیوں کے لئے ہوتے وجود کی قیمت پر حاصل ہوا تھا۔ یہ نقشے پر دو فاصلوں پر وجود میں آیا تھا۔ یہ تقسیم کے نئے خطوط پر فطری سرحدوں کے بغیر،



تیار دار حکومت سے محروم، قومی حکومت کے ساز و سامان اور اسے چلانے کے لئے درکار تجربہ کار افراد سے عاری، ایک کمزور اور ناتواں بچے کی حیثیت سے اور ایک گلا خشک کر دینے والے رومانی خواب کے انجام کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ اس حال میں بھی ہندوستان اور ہندو اس کے ساتھ دوستی کی بجائے اُسے تعصب کے ساتھ دبا کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کی موت کی امید رکھتے بیٹھے تھے اور اسے ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانے کے ذریعے تھے۔ برطانوی ہندوستان میں رہ جانے والے پاکستان کے مالی اور ساز و سامان کی صورت میں آٹاٹوں کے حصول کی جنگ بھی نامکمل رہ گئی تھی۔ بے انتہادی کے ان جذبات اور خوف کے درمیان کوئی ایسی بنیاد نہیں بچی تھی جس پر سمجھوتے کی فضا پروان چڑھ سکتی۔“ (دی گریٹ ڈیوائیڈ، صفحہ ۴۰۲)

وہ انتظام جسے ماقونٹ بیٹن نے اتنی شدت کے ساتھ نافذ کرنا چاہا تھا اگر سڑ جانا اُسے منظور کر لیتے تو وہ ایک ہیمنے کے اندر ٹوٹ جاتا۔ ثبوت کے طور پر دیکھیے کہ فیلڈ مارشل آکن لیک سپریم کمانڈر پر کیا گزری!

۲۶ ستمبر کو لارڈ ماقونٹ بیٹن نے فیلڈ مارشل آکن لیک کو ایک خط لکھا جو اس کے بقول شاید کسی کو اس کی جانب سے لکھا جانے والا اس کی زندگی کا سب سے صبر آزما اور مشکل خط تھا: ”جیسا کہ آپ جانتے ہیں میری ہمیشہ سے یہ راستہ رہی ہے کہ یہ ہندوستان اور انگریز دونوں کے مفاد میں ہے کہ آپ نہ صرف انتقالِ اقتدار بلکہ مسلح افواج کی تنظیم نو کے مکمل ہونے تک فوجی معاملات کے سربراہ رہیں۔ آپ قوت کا مینار ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کسی بھی جانب سے آپ پر کب جانے والی تنقید کے خلاف بیڈاچی پوری قوت کے ساتھ آپ کی لڑائیاں لڑنے کی کوشش کی ہے۔“

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں یہ جاننے کے لئے بے تاب تھا کہ انتقالِ اقتدار کے بعد آپ کی پوزیشن کیا ہوگی جب مشترکہ دفاعی کونسل نے میری یہ تجویز منظور کر لی کہ آپ کو سپریم کمانڈر بنا کر سپریم ہیڈ کوارٹر کا انچارج بنادیا جائے تو میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ملکوں کی اس خواہش کو پورا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ ۱۵ اگست سے مسلح افواج ان دونوں ملکوں کے آپریشنل کنٹرول میں ہوں گی۔ سپریم ہیڈ کوارٹر اس کے ساتھ ہی اس بات کی یقین دہانی بھی کرتے گا کہ تنظیم نو کے دوران برصغیر ہندوستان



میں تمام مسلح افواج پر اس کا مرکزی انتظامی کنٹرول ہوگا۔ مجھے خاص طور پر امید تھی کہ آپ کی اپنی پوزیشن اس حقیقت کے بعد محفوظ ہوگئی ہے کہ آپ کے پاس افواج کا آپریشنل کنٹرول نہیں رہا تھا اور انتظامی شعبہ میں بھی آپ کو محض مشترک دفاعی کونسل کی طرح ہدایات ہی پر عمل کرنا ہے۔

”افسوس۔ میری امیدیں جلد ہی ختم ہوگئیں....

”میرے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستانی وزراء اس حقیقت پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں کہ سپریم میڈیکل کوارٹر کے سربراہ کے عہدے پر آپ جیسا اعلیٰ رینک کا آدمی ہونا چاہتے جس کی ذاتی حیثیت میں عظیم شہرت اور وقار ہو۔ جو کہ ان خوبیوں کے اعتبار سے اُن کے اپنے مائنڈ رانچیف سے بھی برتر ہو۔ میں ایک اچھا دوست نہیں ہوں گا اگر میں اس ناراضگی کا ذکر نہ کروں جو ابتدائی طور پر آپ کی پوزیشن کے خلاف تھی اور ناگزیر طور پر اب آپ کی ذات کے خلاف چلی گئی ہے۔

”میں نے ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ آپ کے کیس پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ میں نشاندہی کر چکا ہوں کہ دونوں میں سے کسی بھی ملک کی افواج کی آپریشنل کمان آپ کے پاس نہیں ہے۔ اور لاک ہارٹ، ایمرسٹ اور ہال مکمل طور پر بھارتی کابینہ کو جوابدہ ہیں۔ میں واضح کر چکا ہوں کہ انتظامی شعبہ میں آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ مشترک دفاعی کونسل کی منظوری کے تابع ہے۔ میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آپ ہندوستان میں متعین برطانوی افسروں اور واپسی کے منتظر برطانوی دستوں کے معاملے میں ملک معظم کی حکومت کو جوابدہ ہیں۔ میں نے انہیں آپ کی ہندوستان اور ہندوستانی فوج کے لئے بے مثال خدمات اور وہ ذاتی احترام بھی یاد دلایا ہے جو وہ آپ کی ذات کا ماضی میں کرتے رہے ہیں۔

”میں افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میں انہیں قائل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہوں۔ اور اب وہ مقام آگیا ہے جہاں پر میں انہیں مشترک دفاعی کونسل کو ایک سرکاری تجویز بھجوانے سے مزید نہیں روک سکتا کہ سپریم میڈیکل کوارٹر کو ختم کر دیا جاتے....

”مشترک دفاعی کونسل میں اس قسم کی تجویز پر بحث نہایت افسوسناک ہوگی....

”مگر مائی ڈسٹرکلاڈ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آپ کا عظیم نام کسی تلخ تذکرہ کا



موضوع بن جاتے تو میں اس بحث میں شریک ہونا پسند نہیں کروں گا جس کے دوران آپ سے کچھ باتیں منسوب کی جاتیں جو کہ صریحاً ناروا ہوں اور جن سے آپ کی شہرت اور وقار پر حرف آنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت حال سے ہر قیمت پر بچنا چاہیے۔ مجھے اس الجھن سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ دکھائی دیتا ہے۔

”میری تجویز یہ ہے کہ آپ چیئرمین مشترک دفاعی کونسل کی حیثیت سے مجھے ایک خط لکھیں جس میں تجویز کریں کہ بڑے بڑے یونیٹوں کے متعلقہ نئی مملکتوں میں تبادلے کے فوراً بعد سپریم ہیڈ کوارٹرز توڑ دیا جائے اور اس کی جگہ کم اہمیت کی حامل نئی تنظیم قائم کر دی جائے جس کے سربراہ بڑی حد تک کم تر عہدے کے حامل ہوں۔۔۔“ (دی گریٹ ڈیوائیڈ : صفحہ ۸-۵ تا ۵۱)

فیلڈ مارشل کے نام اپنے الوداعی خط میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لکھا :

”.... زندگی بھر کے فوجی کیرئیر کے دوران کسی نے ہندوستان کے لئے اتنا کام نہ کیا ہوگا اور نہ ہی کسی نے (مستے کے) پُر امن اور قابل قبول حل کے لئے ایسا کردار ادا کیا ہوگا۔ مجھے امید ہے آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ بہت سے ہندوستانیوں کے نزدیک غیر جانبداری اب قابل احترام نہیں رہی ہے۔ اس سے آپ کو یہ محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ آپ ناکام رہے ہیں۔ تاریخ اس کے برعکس ثابت کرے گی۔“

(دی گریٹ ڈیوائیڈ : صفحہ ۵۱۱)





۴

سر سیرل ریڈ کلف کے فیصلوں کے بارے میں پیدا ہونے والی تنازعہ صورتحال کے پیش نظر اس بات کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دونوں باؤنڈری کیشنوں کے چیئرمین کی حیثیت سے اس کا تقرر کیسے ہوا۔

”لارڈ ڈائونٹ بیٹن نے سرحدوں کے تعین کے سلسلے میں کیشن کے قیام کے لئے دو متبادل انتظامات پر سیاسی رہنماؤں سے بات چیت کی۔ مسٹر جنلج نے دراصل اقوام متحدہ سے ہر کیشن کے لئے تین تین ارکان کی نامزدگی کی درخواست کی حمایت کی جن کے ساتھ ہندوستانی ماہرین بھیڑ جاتے۔ پنڈت نہرو نے دلیل دی کہ اس طریق کار میں ناقابل برداشت تاخیر ہو جائے گی اور کمشنروں کا انتخاب آخر میں غیر موزوں ہو سکتا ہے۔ بالآخر دوسری مجوزہ سکیم پر سمجھوتہ ہو گیا۔ کہ ہر کیشن کا ایک آزاد چیئرمین اور چار ارکان ہوں گے۔ جو ہائیکورٹ کے جج ہوں گے اور ان میں دو کو کانگریس اور دو کو مسلم لیگ نامزد کرے گی۔ چیئرمین کے تقرر میں اختلاف راستے کی صورت میں دونوں سیاسی پارٹیوں کے سربراہ دائرہ کے ذریعے ملک معظم کی حکومت سے نامزدگی کی درخواست کریں گے۔ سر سیرل ریڈ کلف کا نام جو اس سے قبل نالشی ٹریبونل کے چیئرمین کی حیثیت سے تجویز کیا جا چکا تھا، مکمل طور پر منظور کر لیا گیا۔ اور مسٹر جنلج کے ایام پر اسے دونوں کیشنوں کا چیئرمین مقرر کر دیا گیا۔“

(بحوالہ: ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“ صفحہ ۳۴۶)

یہ احوال پوری طرح مکمل نہیں ہے۔ مسٹر جنلج نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ ”برطانیہ سے پریوی کونسل سے تین جج صاحبان باؤنڈری کیشن کے غیر جانبدار اراکین مقرر کیا جاتے۔ اس پر انہیں یہ جواب دیا گیا کہ پریوی کونسل کے جج صاحبان معتبر حضرات ہیں جو کہ ہندوستان کے موسم گرما کی بے پناہ شدت کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔۔۔ اگر انتقالِ ائمہ کا مکمل دو ماہ کے اندر مکمل



کرنے کی مجبوری نہ ہوتی تو قائد اعظمؒ اس تجویز کے منظور کئے جانے پر ضرور اصرار کرتے۔ اس صورتحال میں ماؤنٹ بیٹن نے انہیں ایک انگریز وکیل کو قبول کر لینے کی ترغیب دی۔

(بحوالہ: "دی ایمر جنس آف پاکستان" صفحہ ۲۰۴)

چنانچہ واضح ہے کہ اس نامزدگی کی منظوری بظاہر ملک متعظم نے دی تھی مگر عملاً یہ ماؤنٹ بیٹن کا انتخاب تھا اور حسب معمول وہ اس پر عمل کر گزرا۔

سر سیرل ریڈ کلف کے سپرد ایک مشکل پیچیدہ اور نازک مہم کی گئی تھی۔ اُسے اس کا علم کم تھا اور وہ اس کی پیچیدگیوں سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھا جو دونوں طرف کام کر سکتی تھیں۔ اسے اس کام پر کھلے اور غیر جانبدار دماغ کے ساتھ کام کرنا تھا۔ مگر ایک کھلا اور خالی دماغ چاہے گا کہ اسے بھردیا جائے اور وہ ذریعہ یا ذرائع جن سے اسے بھرا گیا وہ اسے بھٹکانے میں ناکام نہیں رہے۔

"دونوں باؤنڈری کمیشن ۲۰ جون کو قائم کر دیئے گئے۔ سر سیرل ریڈ کلف ۸ جولائی کو ہندوستان پہنچا۔ دہلی میں چند روز قیام کے بعد اس نے کلکتہ اور لاہور کا دورہ کیا جہاں کمیشنوں کے ارکان پہلے ہی کام کا آغاز کر چکے تھے۔ بیک وقت منعقد ہونے والی دونوں کمیشنوں کی سرکاری نشستوں میں شرکت ممکن نہ ہونے کے باعث وہ کسی بھی کمیشن کے اجلاس میں موجود نہ ہوتا تھا بلکہ ان کی کارروائی کے روزمرہ ریکارڈ اور دوسرے مواد کا مطالعہ کرنے پر اکتفا کرتا تھا جو اسے باقاعدگی سے بھیجا جاتا تھا۔ اس کا قیام وائسرائے کی اسٹیٹ نیوہی کے ایک مکان میں تھا۔ وائسرائے نے فیصلہ کیا تھا کہ کمیشن کے چیرمین کے لئے یہ نامناسب ہو گا کہ وہ وائسرائے کے گھر میں ٹھہرے جہاں اس کے متعلق خیال کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ وائسرائے کے زیر اثر ہے۔"

(دی گریٹ ڈیوائس: صفحہ ۲۴۷)

آخری جیلے کی سادگی ملاحظہ ہو۔

"سر سیرل کا خیال تھا کہ بنگال میں سرحدوں کے تعین کا انحصار کچھ بنیادی سوالات کے جواب پر ہے جس کا اس نے حوالہ دیا۔ ان میں سے تین سب سے اہم سوال مندرجہ ذیل تھے:-

۱۔ کلکتہ دونوں میں سے کس مملکت کو دیا جائے یا یہ ممکن ہے کہ اسے دونوں کے درمیان تقسیم



کر دیا جاتے؟

۲۔ اگر کلکتہ مکمل طور پر ایک مملکت کو دے دیا جاتا ہے تو علاقہ شمال مغربی علاقہ دیاتی نظام کے بارے میں جس پر شہر اور بندرگاہ کی زندگی کا انحصار تھا، دوسری مملکت کے ناگزیر دعوے کیا ہیں؟

۳۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کس کے سپرد کئے جائیں جہاں پر مسلمان اقلیت میں تھے مگر طبعی اور اقتصادی لحاظ سے یہ علاقہ مشرقی بنگال سے ملحق تھا۔ (دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۳۴۸)

کیا ان سوالات کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کی کوئی رائے تھی؟ ۲۵ اپریل کو اس کی ٹاف میٹنگ میں دوسرے نکات کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے کلکتہ کے مستقبل کے متعلق قیاسی اڑتیاں بھی شامل تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کلکتہ کے بارے میں مسلمان راتے شمار کا مطالبہ کریں گے اور اس کی تعمیر کا فیصلہ ایک بڑا مسئلہ بن سکتا ہے۔ تاہم یہاں حتیٰ خواہ مخیری کا ذکر نہیں کیا جاتے گا کیونکہ اس کا جواب غلط ہی آئے گا۔ (میشن وڈ ماؤنٹ بیٹن؛ صفحہ ۷۱-۷۲)

یہ واضح ہے کہ کلکتہ کا پاکستان کو مل جانا وائسرائے کے خیال میں "غلط جواب" تھی تھا کہا جاسکتا ہے کہ یہ حقیقت جسے وائسرائے نے محسوس کیا کہ اسے سرسیر کی راہ میں اس طرح نہیں کھڑے ہونا چاہیے جو آزادانہ طور پر اس کے الٹ بیچو پر پہنچ رہا تھا۔ اور اس کا یہ فیصلہ کرنا کہ کلکتہ ہندوستان کو ملے گا اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ دو ذہین و ماہر متوازی خطوط پر کام کرتے ہوئے ایک ہی فیصلہ پر پہنچ رہے تھے۔ بد قسمتی سے معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں لارڈ اسے حکومت برطانیہ کی منظوری کے لئے تقسیم کا مکمل پلان لندن لے گئے۔ اس پلان کے تحت "مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب پاکستان کو ملنا تھے اور مغربی بنگال (بشمول کلکتہ) اور مشرقی پنجاب ہندوستان کو جانا تھے۔"

(میانرز) - از - لارڈ اسے؛ صفحہ ۲۴۰)

... لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے کلکتہ ہندوستان کو دیتے جانے کے اہم ترین پلان کے متعلق مسلم لیگ کو بالکل اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ درحقیقت ماؤنٹ بیٹن بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ تقسیم کا ایک ایسا پلان جس میں کھلے عام کانگریس کی اس شرط کو شامل کر لیا گیا تھا کہ کلکتہ ہندوستان کو ملے گا اسے مسلم لیگ کی جانب سے قبول کئے جانے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ مسلم لیگ کو صرف



یہ بتایا گیا تھا کہ کلکتہ کا مسٹر باؤنڈری کمیشن طے کرے گا۔

(دی ایمر جنس آف پاکستان؛ صفحہ ۲۰۸)

۱۳ جنوری ۱۹۵۰ء کو بنگال نیشنل جیمبر آف کامرس، انڈین جیمبر آف کامرس اور بنگال جیمبر آف کامرس نے سردار پٹیل کو مشترکہ خطاب کی دعوت دی۔ استقبالیہ کے جواب میں سردار پٹیل نے کہا: ”ہم تقسیم پر اس لئے راضی ہوئے کیونکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ متبادل اس سے بھی بدتر تھا۔ اس لئے ہم اس پر راضی ہو گئے مگر اس کے ساتھ ہی ہم نے شرط عائد کر دی کہ ہم تقسیم پر صرف اُسی صورت میں راضی ہوں گے اگر ہمیں کلکتہ ہاتھ سے نہ کھونا پڑے۔“ (بحوالہ ”دی سٹیشن“؛ ۱۴ جنوری ۱۹۵۰ء۔ ”دی ہندو“؛ ۱۴ جنوری ۱۹۵۰ء۔ ”ٹرانسفر آف پاؤر“ شائع کردہ؛ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل انیفرز ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۹۱) سردار پٹیل کی بابت لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رائے تھی کہ ”وہ قابلِ احترام شخص تھا جو اپنے وعدے کا پکا تھا۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیولائیڈ“؛ صفحہ ۳۵۰)

کیا اس سلسلے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ کلکتہ ہندوستان کو دیئے جانے کا وعدہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا اور سر سیرل ریڈ کلف نے اپنے ایوارڈ کے ذریعے اس وعدے کو پورا کر دکھایا یہاں یہ نہیں کہا جا رہا کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کو بتایا کہ اسے کیا کرنا چاہیے، درحقیقت اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی جیسا کہ اس انسوسٹنک کہانی کے کھل کر سامنے آنے سے واضح ہو جاتا ہے۔

سر سیرل ریڈ کلف ۱۴ جولائی کو لاہور پہنچا اور اس نے فریقین کے نمائندوں اور پنجاب باؤنڈری کمیشن کے ارکان سے کہا کہ وہ ۱۵ جولائی کو صبح گیارہ بجے اُس سے طے ملاقات کے دوران اس نے انہیں اس طریق کار کا خاکہ بتایا جس پر عمل کیا جانے والا تھا کمیشن کے ارکان کو بتایا گیا کہ وہ اپنی تحریری شہادتیں ۱۸ جولائی کی دوپہر تک داخل کرادیں اور ۲۱ جولائی کو زبانی شہادتیں قلم بند کرانے کے لئے تیار رہیں۔ وہ خود کمیشن کے ساتھ نہیں بیٹھے گا مگر فریقین کی تحریری شہادتیں اور زبانی بیانات کا ریکارڈ جو جہتی تیار ہو جائے تو اسے روانہ کر دیا جائے جس کا وہ احتیاط کے ساتھ مطالعہ کرے گا جب فریقین کے نمائندے چلے گئے تو سر سیرل نے کمیشن کے ارکان سے کہا کہ وہ



اگلی صبح متعلقہ علاقے کا فضائی سروے کرے گا۔ کمر کے سینئر رکن نے پوچھا کہ کیا کمیشن کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ مجوزہ فضائی سروے نے اس کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں؟ سر سیرل نے تجویز کیا کہ کمیشن کے دو ارکان اس کے ہمراہ فضائی سروے پر جاسکتے ہیں۔ جب یہ پارٹی اگلی صبح ہوائی اڈے پر جمع ہوتی تو انتہائی گرد آلود موسم کے باعث سفر ملتوی کرنا پڑا۔ کمیشن کے مسلمان رکن کے پوچھنے پر کہ ان کا پروگرام کیا ہے، جہاز کے پائلٹ نے بتایا کہ ہدایات کے مطابق اسے مشرق میں پٹھانکوٹ کے بالکل پیچھے جانا تھا جہاں دریا تے راوی پہاڑوں سے نکل کر کھلے میدانوں میں داخل ہوتا ہے اور پھر دریا کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب ضلع لاہور میں ایک خاص مقام تک جا کر بائیں جانب مڑتے ہوئے جنوب مغرب کی سمت نہیں جاتا تھا۔ فیروز پور کے ایک بار اوپر جا کر اسے دائیں کو مڑنا تھا اور لاہور واپس آ جانا تھا۔

یہ اطلاع کمیشن کے رکن کے لئے بڑی تکلیف کا باعث بنی۔ یہ عام فضائی سروے نہیں تھا بلکہ یہ ایک حتمی سرحدی لائن کا معائنہ تھا۔ لاہور واپسی پر وہ کمیشن کے سینئر مسلمان رکن کے پاس گیا اور اسے یہ اطلاع پہنچائی جس نے اسے بھی اتنا ہی پریشان کیا۔

ان کی پریشانی کی وجہ نہایت معقول تھی۔ مجوزہ فضائی سروے کا مقصد کیا تھا؟ سر سیرل ۸ جولائی کو دہلی پہنچا تھا جہاں وہ محض چند روز کے لئے رکا تھا۔ پھر وہ کلکتہ گیا اور اس کے بعد ۱۴ جولائی کو لاہور پہنچ گیا۔ فریقین نے اپنے دعوے ابھی تک کمیشن کو پیش نہیں کئے تھے۔ ان کے تحریری بیانات ۱۸ جولائی کو داخل کر اتے جانے تھے اور ذرائع شہادتیں ۲۱ جولائی کو پیش کی جانی تھیں۔ سر سیرل ابھی تک فریقین کے دعووں سے آگاہ نہیں تھا۔ پھر اس نے مجوزہ فضائی سروے کا خیال کہاں سے اخذ کر لیا تھا؟ اس کی اہمیت کیا تھی؟ اسے کس نے بریف کیا تھا؟

اگر مہی سرحدی لائن تھی تو ضلع گورداسپور کی تحصیلیں پٹھانکوٹ، بٹالہ اور گورداسپور ہندوستان میں رہ جاتیں گی۔ گورداسپور مسلم اکثریتی ضلع تھا مگر انتظامی مقاصد کے نام پر کی جانے والی وقتی تقسیم کی رو سے اسے مغربی پنجاب میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اگر ملحقہ علاقے کے تعین کا یونٹ ضلع کی بجائے تحصیل تھا تو پھر بھی گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلیں مسلم اکثریت پر مشتمل تھیں۔ ان کو ہندوستان میں شامل کرنا ضابطے کے خلاف تھا۔



انہوں نے فیصلہ کیا کہ کمیشن کے سینئر رکن کو فوراً دہلی جاکر مسٹر جناحؒ کو اس صورتحال سے آگاہ کرنا چاہیے اور انہیں مشورہ دینا چاہیے کہ وہ فضا کی سرورے اور اس کے لئے منتخب کئے جانے والے علاقوں کے متعلق دریافت کریں۔ اگر کوئی تسلی بخش وضاحت سامنے نہ آتی تو دونوں مسلم اراکین باؤنڈری کمیشن سے مستعفی ہو جائیں۔ مسٹر جناحؒ کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے کمیشن کے مسلمان اراکان کو مستعفی ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور باؤنڈری کمیشن نے اپنی بے مقصد کارروائی جاری رکھی۔

مسلم لیگ کی جانب سے یہ دلیل دی گئی کہ مسلم اور غیر مسلم طبقہ علاقوں کی نشاندہی کے لئے واحد اور قابل عمل یونٹ تحصیل ہونی چاہیے۔ اگر اس پیمانے کو قبول کر لیا جاتا تو ضلع گورداسپور کی گورداسپور اور بٹالہ تحصیلیں، ضلع امرتسر کی اجنالہ تحصیل، ضلع فیروزپور کی زیرہ اور فیروزپور تحصیلیں اور ضلع جالندھر کی نگودرا اور جالندھر تحصیلیں جو تمام مسلم اکثریتی تحصیلیں تھیں اور پاکستان میں شامل کئے جانے والے مسلم اکثریتی علاقوں سے ملتی تھیں۔ یہ تمام پاکستان میں شامل کی جانی چاہیے تھیں۔

”۸ اگست ۱۹۴۷ء کو میں ایک روز کے لئے دہلی سے کراچی گیا تاکہ قومی قرضے کے بارے

میں قائد اعظمؒ اور لیاقت علی خان سے صلاح مشورہ کیا جاسکے۔ کراچی سے دہلی کے لئے روانگی سے قبل لیاقت علی خان نے مجھے بتایا کہ قائد اعظمؒ کو پنجاب کی سرحدوں کے تعین خصوصاً ضلع گورداسپور کے بارے میں باؤنڈری کمیشن کے ممکنہ فیصلے کے متعلق پریشان کن اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں واپس دہلی جاکر لارڈ اسسے سے ملاقات کروں اور اسے قائد اعظمؒ کی جانب سے پیغام دوں کہ اگر پنجاب میں وہی سرحد متعین کی گئی جس کے متعلق پیشگی رپورٹیں مل رہی ہیں تو اس سے پاکستان اور برطانیہ کے باہمی تعلقات پر نہایت بُرے اثرات مرتب ہوں گے جس کا اس مسئلے میں حسن ظن اور وقار ملوث ہے۔ دہلی پہنچنے پر میں سیدھا وائسرائے ہاؤس گیا جہاں لارڈ اسسے کام کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ لارڈ اسسے سریرل ریڈ کلف کے ساتھ پرائیویٹ کمرے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کے فارغ ہونے تک انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب میں ان سے ملا تو میں نے انہیں قائد اعظمؒ کا پیغام پہنچا دیا۔ اس کے جواب میں اسے نے سرحدوں کے تعین کے بارے میں ریڈ کلف کے خیالات سے



یکسر لاطینی کا اظہار کیا اور کہا کہ نہ تو اس نے اور نہ ہی ماؤنٹ سیٹن نے کبھی اُس کے ساتھ اس سوال پر بات کی ہے۔ ریڈ کلف کو مکمل طور پر خود ہی فیصلہ کرنا ہے۔ اور اسے کسی بھی قسم کا مشورہ نہ پہنچے دیا گیا ہے نہ آئندہ دیا جائے گا۔ جب میں نے اسے کو اُن تمام اطلاعات کی تفصیل بتائی جو ہمیں ملی تھیں تو اس نے کہا کہ وہ میری بات بالکل نہیں سمجھ سکا۔ کمرے میں ایک نقشہ لگا ہوا تھا۔ اور میں نے نقشے کی جانب اشارہ کیا تاکہ اس کی مدد سے اُسے اپنی بات سمجھا سکوں۔ پنجاب کے نقشے پر منسل سے ایک لائن لگی ہوتی تھی۔ وہ لائن اُسی سرحد کے مطابق تھی جس کے متعلق قائد اعظم کو رپورٹ ملی تھی۔ میں نے کہا میرے لئے وضاحت کرنا بیکار ہے کیونکہ نقشے پر پہلے ہی سے کھینچی ہوئی لائن اُس سرحد کی نشاندہی کر رہی ہے جس کے متعلق میں ابھی بات کر رہا تھا۔ اسے کاریگ پیلار لگایا اور وہ گھبراہٹ میں بولا۔ میرے نقشے کے ساتھ کون گڑ بڑ کرتا رہا ہے؟

(بحوالہ ”دی ایمر جنس آف پاکستان“، صفحہ ۲۱۹-۲۱۸)

”اگست کے اوائل میں لیاقت علی خان کی جانب سے لارڈ اسے کو سخت الفاظ پر مشتمل تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر پنجاب کے شمال میں واقع ضلع گوردواپور یا اس کا کوئی بڑا حصہ ہندوستان کو الٹ کیا گیا تو قائد اعظم اور حکومت پاکستان کی جانب سے اسے سنگین معاملہ تصور کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہوگا کہ یہ فیصلہ منصفانہ کی بجائے سیاسی ہو تو اس سے باہمی اعتماد کو ایسا شدید دھچکا لگے گا جس سے پاکستان اور برطانیہ کے مستقبل کے تعلقات خطرے میں پڑ جائیں گے۔۔۔۔۔ لارڈ اسے نے جواب دیا کہ وائسرائے کا باؤنڈری کمیشن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔“

(بحوالہ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“، صفحہ ۳۴۹)

”دی گریٹ ڈیوائیڈ“ کے صفحہ ۳۵۲ پر دی ایمر جنس آف پاکستان کا حوالہ دیا گیا ہے مگر اول الذکر تصنیف کے مصنف نے لارڈ اسے کے کمرے میں لگے ہوتے نقشے پر کھینچی ہوئی لکیر کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ ان ہدایات کی نشاندہی کرتی ہے جو کہ جہاز کے پائلٹ کو ریڈ کلف کے ۱۶ جولائی کے فضائی سروے کے سلسلے میں جاری کی گئی تھیں۔

۸ اگست کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سر جارج ایبل نے گورنر مغربی پنجاب سراہون جنکنز کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر ایبٹ کو خط لکھا جس میں پنجاب سرحدی ایوارڈ کے



بارے میں پیش گوئی کرنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ وہ انتظامات کی منصوبہ بندی کر سکے۔  
خط کا متن یوں تھا:-

”میں ایک نقشہ ارسال کر رہا ہوں جس میں اُن سرحدوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو سرسیرل ریڈ کلف اپنے ایوارڈ میں تجویز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے ہمراہ وضاحت کے لئے کرسٹوفر بیوٹ کا ایک نوٹ بھی منسلک ہے۔ اس سرحد میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوگی مگر ضلع لاہور میں اُسے گاؤں اور ذیل کی سرحدوں تک بالکل ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرنا ہوگی۔

”ایوارڈ اگلے ۲۸ گھنٹوں میں متوقع ہے۔ اور بعد میں میں آپ کو اس کے اعلان کے متوقع وقت کے بارے میں مطلع کر دوں گا۔ اگر عزت مآب گورنر کے اس بارے میں کچھ دیکار کیں ہوں تو آپ مجھ سے فون پر بات کر سکتے ہیں۔“ (دی گریٹ ڈیوائیڈ صفحہ ۲۵۲)

دی گریٹ ڈیوائیڈ کے مصنف نے تبصرہ کیا ہے کہ ہندوستان میں یہ عام طریقہ تھا کہ صوبوں کو ایسی رپورٹوں کے مندرجات یا امکانی مندرجات سے پیشگی مطلع کر دیا جاتا تھا جن سے بد امنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ (بحوالہ ”دی گریٹ ڈیوائیڈ“ صفحہ ۲۵۲)

اس خط و کتابت کے ایک دو پہلو قابل غور ہیں۔ سر ایون جنکینز نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سے رابطہ قائم کیا کہ اس سے اسے رازداری کے ساتھ ایوارڈ کے بارے میں پیشگی اطلاع مل سکے گی۔ صوبے کی مشرقی اور مغربی حصوں میں نام نہاد اور فزنی انتظامی تقسیم کے بعد سر ایون جنکینز مغربی پنجاب کا گورنر تھا جبکہ مشرقی پنجاب کا گورنر ایک ہندو سر چند لال تردیدی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ بھی ایوارڈ کے سلسلے میں پیدا ہونے والی انتظامی منصوبہ بندی کے بارے میں یکساں طور پر متفکر تھا۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ”عام طریق کار“ کے عین مطابق سر ایون جنکینز کو دی جانے والی پیشگی اطلاع سر چند لال تردیدی کو بھی دی گئی ہوگی۔ دونوں گورنر حکومت ہندوستان کے انتظامی کنٹرول میں تھے جس کے سربراہ مسٹر نہر تھے۔ ابھی پاکستان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

مسٹر ایبٹ کے نام سر جارج ایبل کے خط سے منسلک نقشہ اسی سرحد کی نشاندہی کے مطابق ہوگا جو لارڈ اسے کے کمرے میں آویزاں نقشے پر موجود تھی سوائے اس کے کہ ضلع لاہور



میں گاؤں اور ذیل کی سطح پر بھی سرحدوں کی نشاندہی کی جانی تھی۔ ایوارڈ اگلے ۸ مہینوں میں متوقع تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا اعلان کم از کم ۱۰ اگست تک کئے جانے کی توقع تھی۔ مگر اسے دلتراٹے کو پیش کرنے میں ۱۳ اگست تک تاخیر کی گئی اور یہ ۱۴ اگست سے پہلے شائع نہیں کیا جاسکا۔ ۸ سے ۱۳ اگست کے دوران آخر اس میں سے کیا اہم چیز — اگر واقعی کوئی ایسی چیز تھی — معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔

۸ اگست سے پہلے سرسیرل ریڈ کلف نے پنجاب باؤنڈری کمیشن کے ارکان کے ساتھ مشملہ میں الگ الگ گفت و شنید کی تھی۔ مسلم ارکان کے مطابق اگرچہ اس نے گورداسپور کو پاکستان میں شامل کئے جانے کے متعلق ان کے دلائل کو انتہائی صبر اور شائستگی کے ساتھ سنا تھا مگر اس کے اپنے خیالات کیا تھے، اس کے متعلق اس نے یقین کے ساتھ کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔ لہذا کمیشن کے مسلم ارکان کا خیال تھا اور جیسا کہ ریڈ کلف نے ۱۴ جولائی کو فضائی جازے کے موقع پر اپنے مجوزہ پلان میں ظاہر کیا تھا، کہ گورداسپور ضلع کا بڑا حصہ شاید ہندوستان کو دے دیا جائے گا۔ جب انہوں نے فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان کو الاٹ کئے جانے کا سوال اٹھایا تو انہیں فوجی اہلکاروں نے کہا کہ اس کے لئے دلائل کی کوئی ضرورت نہیں۔ مرکزی مسلم بلاک سے ملحق مسلم اکثریتی علاقے ہونے کی حیثیت سے کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا بلکہ انہیں پاکستان میں لازمی طور پر شامل کیا جانا ہے۔ چنانچہ ۸ اگست تک ایوارڈ لاڈلہ اسے کے کمرے میں آویزاں نقشے کے مطابق تیار کیا جاتا رہا۔

آخری مرحلہ دہلی میں شروع ہوا۔ ڈرامے کے اصل کردار کون تھے؟ سرایون جنکٹنر، گورنر مغربی پنجاب صوبے کی تعینم کا شدید مخالف رہ چکا تھا مگر اسے اس پر راضی ہونا پڑا۔ (دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۲۱۰) ۳ مارچ کو جب سر خضر حیات خان نے استعفا دے دیا تو مسلم لیگ کے لیڈر کی حیثیت سے نواب ممدوٹ کو حکومت بنانے کی دعوت دینے کے موقع پر برٹین کار کے مطالعہ کے دوران گورنر سرایون جنکٹنر شش ۹۳ تک جا پہنچا۔ (ایضاً؛ صفحہ ۲۷۲)۔ یعنی اس نے صوبے کی ایڈمنسٹریشن خود سنبھال لی۔

”۱۴ اپریل کو سرایون جنکٹنر نے گورنر ذیل کی کانفرنس میں بتایا کہ سر خضر حیات خان



نے انتخابات (جو گورنر کے خیال کے مطابق مسلم لیگ کی معمولی اکثریت پر فتح ہوتے) کی شورش سے بچنے کے لئے پیشکش کی تھی کہ وہ یونینٹ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں لے جا کر اسے حکومت بنانے کی پوزیشن میں لے آئیں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر ایون کی متفقہ رائے تھی کہ فرقہ وارانہ حکومت معاملات کو بدتر بنا دے گی اس لئے شق ۹۳ کے تحت صوبے کا نظم و نسق جاری رکھا جانا چاہیے۔“

(دی گریٹ ڈیوائیڈ؛ صفحہ ۲۷۳)

سر ایون سکھوں کو صوبے کی تقسیم پر اصرار کے تباہ کن نتائج سے بچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے وائسرائے کو لکھا:-

”مجھے یقین ہے کہ سکھوں کے دعویٰ بڑی حد تک درست ہیں۔۔۔ مغربی پنجاب میں نہری آبادیوں میں حصہ کے سلسلے میں اور گیانی کا یہ خیال کہ ضلع منٹگری مشرقی پنجاب کو الاسٹ کر دیا جائے درحقیقت کسی بھی لحاظ سے اتنا مضحکہ خیز نہیں ہے جتنا کہ یہ بظاہر نظر آتا ہے۔“

(”دی ایمر جنس آف پاکستان“؛ صفحہ ۲۱۲)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اپنی بہمدیاں بھی سکھوں کے ساتھ تھیں مگر اُس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ صوبے کی تقسیم کا صورت میں سکھوں کی بکھیتی کیسے قائم رکھی جاسکتی ہے۔ م۔ رجون کو ایک پریس کانفرنس کے دوران ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ تقسیم کے منصوبہ میں سکھ قوم کی بکھیتی کو برقرار رکھنے کے لئے بھی کوئی انتظام کیا گیا ہے اُس نے کہا:-

”.... وہ چاہتے ہیں کہ پنجاب کو مسلم اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ میں نے بعینہ وہی کیا ہے جو سکھوں نے کانگریس کی وساطت سے چاہا ہے۔ یہ درخواست میرے لئے شدید دھچکے کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ میں سکھوں کو پسند کرتا ہوں۔ اُن سے پیار کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ اچھی طرح سے رہیں۔ میں نے ان کے لئے ایک فارمولے پر غور کرنا شروع کیا تھا مگر میں کوئی جادوگر نہیں ہوں۔“ (سبحوالہ ”دی ایمر جنس آف پاکستان“؛ صفحہ ۲۱۰)

ڈرامے کا ایک اور کردار میجر بیٹی شارٹ کی صورت میں سکھوں کی مدد کرنے کو حاضر ہوا۔ ”میجر شارٹ گیارہ سکھ رجمنٹ کا سرورس میں دوبارہ طلب شدہ آفیسر اور سکھوں کا نہایت خیر خواہ تھا۔ جس کی قسمت میں آنے والے چند برسوں کے دوران سکھوں کے نصب العین کے



لئے ناکام جدوجہد کرنا لکھا تھا۔ وہ مسلح افواج کے سکھ عناصر میں بد امنی کے ان ہیوم واقعات کے نتیجے میں ۱۹۴۰ء کی گرمیوں میں پنجاب آیا تھا جو اپریل ۱۹۴۰ء میں منٹرل انڈیا ہاؤس کی سکھ سکیورٹن کی طرف سے ممبئی سے مشرق وسطیٰ کے لئے بحری جہازوں میں سوار ہونے سے انکار پر منتج ہوئے تھے۔ آئی بیڈ گارڈز میں اس صورتحال پر گہری تشویش پائی جا رہی تھی.... میجر شارٹ کے تجویز پر اسے اور کئی دوسرے افسروں کو جنہیں سکھوں کے بارے میں خصوصی تجربہ حاصل تھا، خاص طور پر منتخب کیا گیا.... پھر انہیں سول اور فوجی حکام کی جانب سے سکھوں کے شکوک و شبہات دور کرنے کی مسلسل اور باہمی کوششوں میں تعاون کرنے کے لئے فوجی بھرتی کے مرکزی علاقوں میں تعینات کر دیا گیا۔ تاکہ جنگ اور بھرتی کے متعلق سکھوں میں صحت مند رویہ پیدا کیا جاسکے۔ میجر شارٹ انہی سول رابطہ افسروں میں سے ایک تھا.... وہ لاہور میں متعین تھا۔ اور لاہور میں رہتے ہوئے امرتسر اور وسطی پنجاب کے اضلاع کے علاوہ سکھوں کی ریاست پٹیالہ میں اپنے با اثر دوستوں کی مدد سے اہم حیثیت رکھتا تھا.... اس نے پورے جوش و جذبہ کے ساتھ خود کو اپنے کام کے لئے وقف کر رکھا تھا چنانچہ جلد ہی اسے سرکردہ سکھوں اور اکالیوں نے سکھوں کا دوست اور خیر خواہ تسلیم کر لیا۔

(ڈیوائیڈ اینڈ کوٹ: صفحہ ۳۲-۳۳)

چنانچہ بحران کے اس دور میں جس کا سکھوں کو سامنا تھا ایک سکھ رہنما اور عبوری حکومت میں پنڈت نہرو کے شریک کار بلدیوسنگھ نے میجر شارٹ کو تار بھیجا جو ان دنوں برطانیہ میں تھا اور اس سے کہا کہ ”وہ آگے آتے اور معاملات کو سنوارنے میں مدد کرے“

(ڈیوائیڈ اینڈ کوٹ: صفحہ ۸۶)

سکھوں کے نصب العین کا ایک اور حامی اور ان کی مدد کرنے پر کمر بستہ لارڈ اسے جولائی کو ایلن کیمپبل جانسن کے ہمراہ لندن گیا ہوا تھا۔ وہ ۲۰ جولائی کو دہلی واپس پہنچا۔ واپسی کے سفر کے دوران ہم میجر بیٹی شارٹ کو ہمراہ لے کر آ رہے تھے جس کا سکھوں پر بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ کینیڈا مشن کے ساتھ وابستہ رہ چکا تھا اور گزشتہ دسمبر میں وہ بلدیوسنگھ کا دست راست تھا۔ وہ وائسرائے کے شاف کارکن تو نہیں ہو گا مگر اسے لارڈ اسے کو مشورہ دینے پر مامور کیا جاتے گا جو پنجاب میں سکھوں کے رد عمل کے بارے میں قوی اندیشے رکھتا تھا۔ (اشن وڈاؤنٹ



بٹن صفحہ ۱۳۹) ایسے جُملے کہ بچارے سکھ۔ ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ اُنکے بارے میں لارڈ اسے اور  
 داسرا تے ماؤنٹ بیٹن کے سٹاف کے دوسرے ارکان کے ساتھ کئی مرتبہ گفتگو ہوتی ....

(دی ایمر جنس آف پاکستان: صفحہ ۲۱۲)

”میں نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ مارچ کے واقعات کا خوفناک انتقام لینے کے لئے سکھ  
 مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر دھاوا بول دیں گے۔۔۔۔۔ بد دیوانہ کی مدد کو پہنچنے کی درخواست کے  
 جواب میں میجر شارٹ میرے قیام کے دوران ہی لندن سے دہلی پہنچا۔ اس نے فوراً ہی محسوس کر  
 لیا کہ مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے قیام کا وقت گزر چکا ہے۔ اب وہ سکھوں  
 کے لئے صرف یہ کر سکتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو تقسیم پنجاب کی لکیر کو زیادہ سے زیادہ مغرب کی طرف  
 لے جاتے تاکہ کچھ نوآبادیہ منیوں کو ہندوستان میں شامل کیا جاسکے سکھوں کے ساتھ اپنی تمام تر ہمدردیوں  
 کے باوجود میں نہیں سمجھتا کہ ایسا کیا جاسکے گا۔ ہندوستان میں پنجاب کی نوآبادیوں کو شامل کرنے کے لئے  
 مغرب کی جانب اس قدر آگے بڑھنا ہوگا کہ شہر لاہور اور صوبے کے دوسرے وسیع حصے جن میں  
 مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے انہیں بھی ہندوستان میں شامل کر دیا جائے۔ طے شدہ بنیادوں کے  
 مطابق تقسیم کی سرحد لاہور اور امرتسر کے درمیان کہیں واقع ہونا تھی۔ دہلی میں دی۔ پی۔ مینن اور  
 شارٹ کے ساتھ گفتگو کی کئی نشستوں کے بعد یہ میری پختہ رائے تھی مینن جانتا تھا کہ سرحد کے  
 تعین میں کوئی کمی بیشی کرنے سے فسادات کا اندیشہ کم کیا جاسکتا تھا؛ میرا خیال تھا کہ ایسا نہیں ہو سکے  
 گا۔ میں نے کہا کہ مارچ کے واقعات کے بعد سکھ اس بات پر تڑپ چکے تھے کہ جہاں بھی انہیں مسلمانوں پر  
 عدوی برتری حاصل تھی وہ مسلمانوں پر ضرور حملے کریں گے اور تقسیم کی لائن کو سکھوں کی حمایت میں بدل  
 دینے سے وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آئیں گے۔“

(رڈیو اسٹیڈ اینڈ کوٹسٹ: صفحہ ۹۴ تا ۹۶)

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دو تحصیلوں کے مسلم اکثریتی علاقوں سے ملتی ہونے کے  
 علاوہ ان کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ ان میں دادی تلے کے آبی منصوبوں کے ہیڈ ورکس بھی شامل  
 تھے جن سے پنجاب کے دو دریاؤں راوی اور بیاس کے پانیوں کی تقسیم کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اس  
 ہیڈ ورکس سے بہنے والا ۸۳ فیصد پانی پاکستان میں وسیع و عریض رقبے کو سیراب کرتا تھا جبکہ بقیہ



۱۴ فیصد پانی ریاست بریکانیر میں استعمال ہوتا تھا جو پاکستان اور بھارت دونوں سے ملتی تھی جس کے حکمران پاکستان یا ہندوستان میں شمولیت کا فیصلہ بڑی حد تک اس حقیقت پر مبنی ہو سکتا تھا کہ اس ہیڈ ورکس سے نکلنے والی نہر بریکانیر میں آبپاشی کا واحد ذریعہ تھی۔ کیا یہ حقیقت سٹرمنہرو کی جانب سے کسی رد عمل کا باعث بنے گی کہ ہیڈ ورکس کا کنٹرول پاکستان کے پاس ہو؟

سر جارج ایبل نے ۸ اگست کو سٹر ایبٹ کو جو نقشہ اور "ایوارڈ" ارسال کیا تھا اس میں اختلافی مسئلہ ضلع فیروز پور کی انہی دو تحصیلوں کے اندیا کو منتقل کئے جانے سے متعلق تھا۔ ۱۱ اگست کو یا اس کے ننگ جگ سرایون جنگلر کو خفیہ تحریر میں ایک تار موصول ہوا جو نمایاں کو الگ کر دو" کے الفاظ پر مشتمل تھا۔ اُس نے اس تار کو صحیح طور پر فیروز پور کے علاقے سے متعلق سمجھا۔ اُس کے خیال میں مذکورہ دونوں تحصیلیں کسی بڑی اہمیت کی حامل نہ تھیں مگر بعد ازاں یہ پاکستان کے لئے دفاعی اور آبپاشی کے ضروریات کے لحاظ سے نہایت اہم ثابت ہوئیں۔

(دی گریٹ ڈیوائس؛ صفحہ ۳۵۳)

یہاں دو تبصرے ضروری ہیں۔ سرایون جنگلر کے خفیہ تار کے دو انگریزی الفاظ "نمایاں کو الگ کر دو" بالکل صحیح طور پر سمجھ لینے کی بنیاد کیا تھی کہ ان سے مراد فیروز پور ہی کا علاقہ ہے۔ سوائے اس کے کہ ۸ اگست کو اسے سر جارج ایبل کا مراسلہ مل چکا تھا جس میں فیروز پور کے علاقے کا حوالہ دیتے ہوئے اسے "نمایاں" قرار دیا گیا تھا۔

دوسرے اس خیال سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے کہ اُس کے نزدیک مذکورہ دونوں تحصیلوں کی کوئی بڑی اہمیت نہیں تھی۔ اس علاقے میں دوسری بہت سی چیزوں کے علاوہ فیروز پور کے ضلعی دفاتر اور ذیلی ضلعی ہیڈ کوارٹر زیرہ کے دفاتر ہی اسے اہمیت کا حامل بنانے کے لئے کافی تھے۔ لیکن اگر یہ بھی یاد رکھا جائے کہ اس علاقے میں صوبے کے آبپاشی کے چند بڑے منصوبوں میں سے ایک ہیڈ ورکس بھی شامل تھا جس پر مغربی پنجاب کے بڑے حصے کی خوشحالی کا دار و مدار تھا تو اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ درحقیقت باؤنڈری لائن میں کی جانے والی تبدیلی صرف عمومی اہمیت کی حامل نہیں تھی بلکہ اگر ہندوستان کے آزادی کے بعد کے رویے کو ہمیشہ نظر رکھا جائے تو یہ نہایت اہم تھی جسے اس ترمیم کے ذریعے ممکن بنایا گیا تھا۔

تقریباً اسی وقت جب سرایون جنگلر کو خفیہ تحریر میں "نمایاں کو الگ کر دو" والا موصول



ہوا، سرپینڈل ٹون کو مہجر شارٹ کی جانب سے ایک نار مل جو ابھی تک دہلی ہی میں تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے: ”وہ تمہاری سرحد میں شامل ہے۔“ اس سے مجھے علم ہو گیا کہ باؤنڈری لائن کہاں ہوگی اور یہ یقین دہانی بھی مل گئی کہ لاہور پاکستان کے حصے میں آئے گا۔“

(ڈیوائیڈ اینڈ کوٹ، صفحہ ۹۶)

اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سیاق و سباق کے بغیر اس تاریک پیغام سے جو مہجر شارٹ کی جانب سے موصول ہوا، سرپینڈل ٹون اس امر کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ لاڈاسے کے کمرے میں آویزاں نقشے پر موجود باؤنڈری لائن کو لاہور اور منٹنگری کے اضلاع ہندوستان میں شامل کرنے کے لئے مغرب کی طرف مزید آگے نہیں سرکا یا جاتے گا مگر اس لائن کے مطابق فیروز پور ضلع کی قبل انہیں پاکستان میں شامل دو تحصیلیں ہندوستان میں شامل کر دی گئی تھیں۔ کانگریس کے دباؤ کے تحت سمجھوتے کی تقسیم پر اصرار کیا تھا۔ حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کا مطلب ان کے فرقے کو منتشر کر دینا تھا۔ پھر انہوں نے ایسے ذرائع اور سرکاری استعمال کرنا شروع کر دیں جن سے خود ان کے اپنے ہی مطالبے کے مفتر نتائج کو ختم کیا جاسکے۔ انہوں نے مغربی پنجاب کے ان اضلاع میں سے جو آبپاشی کے نظام سے حال ہی میں آراستہ کئے گئے تھے بعض مسلم اکثریتی علاقوں کی الاٹمنٹ کا مطالبہ کیا اس مفہم کے خیر مطالبہ کو جیسا کہ یہ باوقی النظر میں محسوس ہوتا ہے، سرایون جنکشن نے قابل غور نہیں سمجھا اور اسے دائرہ راستے تک پہنچا دیا۔

تقسیم سے بہت پہلے ۸ اپریل ہی کو سرچارلز ایبل نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا تھا۔ ”اہم سوال یہ ہے کہ کیا کینٹ مشن پلان ختم ہو چکا ہے؟ جناح کو بتائے کہ اگر وہ اس کو مسترد کرتے ہیں تو انہیں کیا ملے گا؟ اس وضاحت کے بغیر ان کی بات معقول نظر نہیں آسکے گی۔“

(مشن و دماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۵۸)

۲۵ جون کو ڈاؤنٹ بیٹن کی سینتالیس سالگرہ منانے کے لئے ایک فیملی ڈنر منعقد کیا گیا۔ می وی نے انتہائی یقین کے ساتھ مجھ سے کہا کہ گورنر جنرل کے تقرر کے مسئلے پر دوسری تمام وجوہ کے علاوہ تعطل کا باعث جناح کی جانب سے عدم احترام کا رویہ ہے جو ہمیشہ ابھام پسندانہ کردار ادا کرتے ہیں اور یوں پریشان کن حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ (مشن و دماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۱۴۳)



لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سر طحان کو دونوں ملکوں کے لئے مشترک گورنر جنرل کے تقرر پر راضی کر لینے میں ناکامی کے بعد ۲ جولائی کو اُن سے کہا: "اس کی قیمت شاید آپ کو اپنے تمام اثاثوں اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں ادا کرنی پڑے، اس کے بعد وہ اٹھا اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔"

دی گریٹ ڈیو آئیڈ کا مصنف لکھتا ہے کہ "اس کا باعث ماؤنٹ بیٹن کی دونوں ملکوں کا مشترک گورنر جنرل بننے کی دیرینہ امید کو جناح کی جانب سے ناکام بنایا جانا تھا جو ان ملکوں کی آزادی کے ابتدائی اور تشکیل پذیر دنوں میں ان کی مشترک تقدیر پر اُسے مسلط کر دیتی" (صفحہ ۳۹) اگست کے دوسرے ہفتے میں ڈرامہ اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں تک پنجاب کی سرحد کے تعین کا تعلق تھا وہی میں ہر کوئی اور پنجاب میں سرایوں جنگلنر اس بارے میں سکھوں کے متعلق پریشان تھا۔ کیا اس صورتحال کا تدارک ممکن تھا؟

مجوزہ باؤنڈری لائن کے بارے میں بتاتے جانے کے بعد کیا سرایوں جنگلنر نے "نمایاں" فیروز پور کو حذف کر کے فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان سے تجارت کو منتقل کرنے کی ترمیم تجویز کی تھی؟

کیا یہ میجر شارٹ کا خیال تھا جو ابھی تک غیر مطمئن موڈ میں لارڈ اسے کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کیونکہ وہ سکھوں کے لئے واقعی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ (ڈیو آئیڈ اینڈ کوٹ؛ صفحہ ۹۶) کیا سر پینڈل مون نے یہ خیال اس کے دماغ میں ڈالا تھا؟ جب میجر شارٹ، لارڈ اسے کے ساتھ سکھوں کے رد عمل کے متعلق مشیرین کر آیا تھا تو مون اس وقت دہلی ہی میں تھا۔

اگر پنجاب کے مجوزہ سرحد کے متعلق سر چند لال ترویدی نے سرٹنہرو کو مشورہ دیا تھا جس کا غالب امکان ہے، تو اس کے متعلق سرٹنہرو کا رد عمل کیا تھا؟

دونوں ملکوں کے وجود میں آجانے اور سرحدوں کے تعین کے لئے باؤنڈری ایوارڈز کا اعلان کئے جانے کے بعد اثاثوں کی تقسیم کے لئے ایک ٹریبونل تشکیل دیا گیا تھا جس میں پاکستان اور بھارت کا ایک ایک نمائندہ شامل تھا۔ اس کا چیئرمین سر (بعد میں لارڈ) پیٹرک سپنس تھا جو آزادی تک ہندوستان کا چیف جسٹس رہا جسے دونوں فریق اثاثوں کے ٹریبونل



کے لئے نہایت موزوں چیزیں سمجھتے تھے۔

آٹاٹوں کے ٹریبونل کے سامنے جہاں بہت سے دوسرے معاملات پیش کئے گئے وہاں ان میں ایک دعویٰ ہندوستان کی جانب سے معاوضہ دلانے کے لئے بھی کیا گیا جس کی بنیاد اس مفروضے پر قائم کی گئی تھی کہ پنجاب میں آبی وسائل کی ترقی اور انہیں بروئے کار لانے میں کہیں زیادہ کام کیا گیا تھا جو کہ اب مغربی پنجاب پر مشتمل ہے اور پاکستان کا حصہ بن چکا ہے، بہ نسبت مشرقی پنجاب کے جو کہ ہندوستان میں شامل کیا گیا ہے۔ دعویٰ میں کہا گیا کہ چونکہ آبپاشی کے نظام کی ترقی کا کام صوبے کے مشترک وسائل سے کیا گیا تھا اس لئے مغربی پنجاب میں مشرقی پنجاب کی نسبت صوبے کے دونوں حصوں کی مناسب سا جھداری کے لحاظ سے جس قدر زیادہ کام کیا گیا ہے مشرقی پنجاب (ہندوستان) مغربی پنجاب (پاکستان) سے اس کے معاوضے کا حق دار ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ معاوضہ کا تعین آٹاٹوں کی اُس وقت کی قیمت کی بجائے جب یہ کام کیا گیا تھا، تقسیم کے وقت کی قدر و قیمت کے لحاظ سے کیا جاتے۔ ٹریبونل کے سامنے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے دونوں ملکوں کے اٹارنی جنرل تھے۔ دونوں نے ٹریبونل سے اس مسئلے کو حل کرنے کی درخواست کرتے ہوئے اپنی اپنی حکومتوں کی جانب سے یقین دلایا کہ پانی کی موجودہ فراہمی بغیر کسی رکاوٹ یا مداخلت کے جاری رہے گی۔ ٹریبونل نے فریقین کے دعوے اور ان کی تائید میں دلائل سنے اور ہندوستان کے موقف کو درست قرار دیتے ہوئے اس کی روشنی میں آٹاٹوں کے تعین کا کام جاری رکھا۔ ٹریبونل کے فیصلے کے بالکل اگلے روز ہندوستان نے فیروز پور ہیڈ ورکس سے پاکستان کو ملنے والا تمام پانی اس دعوے کے ساتھ بند کر دیا کہ دریا کے بالائی حصے میں واقع ملک ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے علاقے میں بہنے والے تمام تر پانی کا مالک ہے اور یہ کہ ہندوستان کو اپنے ہیڈ ورکس سے پاکستان کو ملنے والا تمام پانی بند کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔

ہندوستان کے اس یکطرفہ اقدام سے جو اس کی جانب سے ٹریبونل کو کرائی جانے والی یقین دہانی کے سراسر منافی تھا، مغربی پاکستان میں نہایت سنگین صورتحال پیدا ہو گئی۔ پاکستان کے احتجاج پر بھارتی وزیراعظم نے فیروز پور ہیڈ ورکس سے عارضی طور پر پانی کی فراہمی جاری



کر دینے کی پیشکش کی بشرطیکہ پاکستان ہندوستان کے مقرر کردہ کسی ملک میں اُس کی مرضی کے مطابق طے کردہ ایک خاص رقم ہر سال پانی کے معاوضے کے طور پر جمع کرتا رہے۔ یہ انتظام فریقین کی قانونی پوزیشن سے بالاتر ہو کر ہونا تھا مگر اس سے پاکستان کو مجبور کر دیا گیا کہ ہندوستان کی جانب سے فیروز پور ہیڈ ورکس سے پانی کی فراہمی میں مزید کمی کے امکان کے پیش نظر وہ اپنے مغربی دریاؤں سے پانی حاصل کرنے کے متبادل ذرائع تلاش کرے۔ پاکستان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس پیشکش کو قبول کر لے جو ۴ مئی ۱۹۴۸ء کے معاہدہ کی صورت میں سامنے آئی۔

اس معاہدہ کی شرائط سے واضح تھا کہ یہ مسئلے کے حل کی ایک عارضی کوشش تھی اور فریقین گفت و شنید کے ذریعے اپنے قانونی حقوق منوانے کے لئے کوششیں جاری رکھیں گے جس میں ناکامی کی صورت میں کسی تیسرے فریق سے دوستانہ خیر سگالی، ثالثی یا پھر عدالتی فیصلے کے ذریعے یہ مسئلہ حل کیا جائے گا۔ پاکستان نے بھارتی وزیراعظم کی جانب سے طے کردہ رقم کی ادائیگی کے بعد ہندوستان کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ اس مسئلے سے متعلق قانونی امور کو حل کرنے کا کوئی طریقہ وضع کر لیا جائے۔ پاکستان کے لئے ہندوستان کا یہ جواب انتہائی حیرت انگیز تھا کہ معاہدہ ۴ مئی ۱۹۴۸ء نے سارا معاملہ طے کر دیا ہے اور اس مسئلے کے بارے میں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال برقرار نہیں رکھی جاسکتی تھی معاہدہ فریقین کے قانونی حقوق کو الگ رکھ کر عارضی حل کے طور پر طے پایا تھا۔ فریقین کے قانونی حقوق کے حتمی تعین کے بغیر ہر سال پانی کے معاوضہ کی رقم ہندوستان کو ادا نہیں کی جاسکتی تھی اور نہ ہی یہ پاکستان کو واپس مل سکتی تھی۔ ہندوستان کا موقف یہ تھا کہ پاکستان کو اپنی ضرورت کے پانی کا متبادل تلاش کرنا چاہیے کیونکہ ہندوستان فیروز پور ہیڈ ورکس سے پاکستان کو فراہم کئے جانے والے پانی میں بتدریج کمی کرتا جاتے گا تاکہ اس کے بعد وہ سیاح اور بیاس دونوں دریاؤں کا تمام تر پانی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکے۔ دوسری کئی تجاویز کے علاوہ پاکستان نے ہندوستان کو یہ پیشکش بھی کی کہ قانونی امور کے فیصلے کے لئے اس معاملے کو بین الاقوامی عدالت انصاف میں پیش کر دیا جائے۔ ہندوستان نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ دریا کے بالائی علاقے میں واقع ملک کی حیثیت



سے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ چونکہ یہ دریا اس کے علاقے میں بہتے ہیں اس لئے وہ ان کا تمام تر پانی استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ لہذا اس مسئلے سے متعلق کسی قانونی سوال کو حل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

تقریباً انہی دنوں مسٹر ڈیوڈ لائیونگسٹون کو جوٹنسی ویلی اتھارٹی کے چیئرمین رہے تھے اور اس وقت امریکہ کے ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین تھے۔ برصغیر میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے وادی سندھ کے اوپر پرواز بھی کی جو ان دونوں ملکوں کے درمیان تنازعہ کی وجہ سے متاثر ہونے والی تھی۔ امریکہ واپسی پر اس نے وادی سندھ کے اوپر پرواز کے دوران پیدا ہونے والے خیالات کو ایک مضمون کی شکل دی جو "سیکر ڈے ایوننگ سٹار" میں شائع ہوا۔ اس نے خبردار کیا کہ اگر دونوں ملکوں کے درمیان یہ جھگڑا مزید چند سال جاری رہا تو مغربی پاکستان کے وسیع علاقے صحرا بن جائیں گے۔ مغربی پاکستان کی معیشت تباہ ہو جائے گی اور اس کی آبادی کا بڑا حصہ مصائب و آلام کا شکار ہو جائے گا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ انٹرنیشنل بینک فار ری کنسٹرکشن ری بیلیٹیشن کو اپنے تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے تکنیکی ماہرین کی خدمات اس کام کے لئے پیش کرنی چاہئیں بشرطیکہ دونوں ملکوں کی حکومتیں تصفیہ کے لئے مندرجہ ذیل بنیادی باتوں پر رضامند ہوں۔

(الف) (پانی کے) موجودہ استعمالات کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔

(ب) دریا تے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے پانی سے وادی سندھ کی مزید ترقی کے لئے ڈیم، آبی ذخائر اور دوسری معاون نہریں تعمیر کی جائیں گی جن کی لاگت دونوں ممالک کی حکومتیں ان سے حاصل ہونے والے فوائد کے تناسب سے ادا کریں گے۔

بینک نے مسٹر لائیونگسٹون کی تجاویز کے مطابق دونوں حکومتوں سے رابطہ قائم کیا اور بعض یقین دہانیوں اور دیگر شرائط کے پورا کھانے کے بعد دونوں حکومتیں بینک کی سرپرستی میں مجوزہ منصوبے پر کام کرنے پر متفق ہو گئیں۔ تکنیکی اور سائنٹیفک تحقیقات میں جن میں دونوں فریقوں نے بینک کے ماہرین کے ساتھ شرکت کی اور جن کی ہر ہر مرحلہ پر جانچ پڑتال کی گئی انہی میں کئی برس گزر گئے۔ بالآخر مختلف امور پر معاہدہ ہو گیا جن کی بنیاد پر ایک حتمی تصفیہ ہونا تھا۔



اس پر اتفاق ہوا کہ بھارت دونوں دریاؤں کے پانی کی مقررہ مقدار بتدریج اپنی طرف موڑ لے گا لیکن اسے پاکستان کو نہروں اور سیڈ وکس وغیرہ کی تعمیر کے لئے رقم ادا کرنی ہوگی جو پانیوں کے بھارت کی طرف موڑے جانے کے متبادل کے طور پر پاکستان کو اپنے مغربی علاقوں میں بھندو لے دریاؤں سے ملک کے مشرقی علاقوں تک پانی کی بہم رسانی کے منصوبوں پر خرچ کرنا پڑے گی۔ یہ آبی منصوبے اس طرح ڈیزائن کئے جائیں گے کہ ان سے پاکستان کی آبپاشی کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کیا جاسکے مگر اس پر آنے والی اضافی لاگت خود پاکستان کو ادا کرنا ہوگی۔

اس سلسلے میں بینک اور اس کے ماہرین بے حد تالش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انتہائی صبر، استقلال اور انہدام و تفہیم کے جذبے سے سرشار ہو کر کام کیا۔ اور کسی بھی مرحلے پر کسی ایک یا دوسرے فریق یا دونوں کے رویوں کے باعث جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اختیار کیا۔ اپنے بنیادی مقصد پر آپریشن نہیں آنے دی۔ اگر بینک کے ماہرین فریقین کے نقطہ نظر کو مناسب اور انصاف پسندی کے ساتھ قبول نہ کرتے تو بینک کی کوششوں کا مقصد ہی ختم ہو کر رہ جاتا۔ ان کوششوں کے تقریباً نقطہ عروج پر ایک ایسی مشکل پیش آتی جس سے سارے کئے کراتے پر پانی پھر نظر آنے لگا۔ جب پاکستان کو ملک کے مغربی حصے سے بہنے والے دریاؤں سے پانی کی مشرقی حصوں تک بہم رسانی کے لئے لاگت کے تعین کا سوال آیا، جن میں بہنے والے دریاؤں کا پانی بھارت کو اپنی طرف موڑ لینا تھا تو بھارت نے معاہدہ کی شرائط کے مطابق لاگت کی ادائیگی سے معذوری ظاہر کر دی۔ اس مرحلے پر بینک نے دلچسپی رکھنے والے اور ہمدرد مالک سے رجوع کیا جنہوں نے بینک کے ساتھ مل کر قرضوں اور امداد کا ایک نظام وضع کیا جس کی مدد سے بھارت اپنا فرض ادا کر سکتا تھا اور جو بھارت کے لئے قابل قبول بھی تھا۔ چنانچہ معاہدہ پر عملی کام شروع ہو گیا اور اس کی مختلف شقیں جن میں ڈیم، آبی ذخائر، معاون نہریں اور سیڈ وکس وغیرہ کی تعمیر شامل تھیں ان پر تیزی کے ساتھ کام کیا جانے لگا۔

اس طرح اس بات کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے کہ سر ایون جیکسنز جو کہ پنجاب کا سول حکمران اور سید امیر خاں سرسبھار جات تھا اور جو انتظامی معاملات کا وسیع تجربہ اور صلاحیت بھی رکھتا تھا اس کے نزدیک منافع فیروز پور کی دو تحصیلیں پاکستان سے نکال کر بھارت کو دے دینا آخر کسی خاص



اہمیت کا حامل کیوں نہ تھا۔ ۱۱ اگست کے خفیہ ٹیلی گرام کے الفاظ ”نمایاں کو الگ کر دو“ اس بات کی بڑی مضبوط شہادت ہے کہ سر جارج ایل کے ۸ اگست کے خط کے بعد جس کے ساتھ سرحدوں کے تعین کا ایک نقشہ بھی منسلک تھا جسے سر سیرل ریڈ کلف نے نافذ کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور جس سے کسی ”بڑے انحراف“ کا پروگرام نہیں تھا، سر ایون جنگل نے تجویز کیا تھا یا اسے سرحد کے تعین میں تبدیلی کی تجویز پیش کی گئی تھی تاکہ فیروز پور ضلع کی دو تحصیلیں پاکستان سے نکال کر بھارت کو دی جاسکیں۔ اسی تجویز کو ”نمایاں کو الگ کر دو“ کا نام دیا گیا۔

پنجاب کی تقسیم کے حوالے سے لاکھوں لوگوں پر ڈھاتے جانے والے غیر انسانی مظالم اور تشدد کا احاطہ کرنا بے سود ہو گا۔ مسلمان اور ہندو دونوں کی اکثریت اچانک اس مصیبت میں گرفتار ہو گئی اور انہیں بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھ بڑے منظم تھے اور انہوں نے پیشگی منصوبے بنا رکھے تھے اور تیاریاں بھی کر رکھی تھیں۔ چنانچہ اس آفت میں وہ سب سے کم متاثر ہوتے اور اس کا سبب زیادہ تر وہی ہے۔

تقسیم ہند کے دگاتے ہوتے زخم وقت گزرنے کے ساتھ مند مل نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے بعض ناسور بن چکے تھے۔ وادی سندھ کے پانیوں کی تقسیم کا طریق کار وضع کرنے میں بارہ برس لگ گئے جبکہ اس کا نفاذ ایک مسلسل عمل ہے۔







مسئلہ کشمیر نے پاکستان اور بھارت دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر رکھا ہے۔ دونوں ملکوں کی فوجیں تین مرتبہ صف آرا ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود مستقبل قریب میں اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ گزشتہ ربع صدی کے دوران اس مسئلے نے دونوں ملکوں کے درمیان براہ راست یا بالواسطہ دشمنی کے تمام مراحل کو موادی ہے۔

برطانوی ہندوستان کی تقسیم مسلم اور غیر مسلم طوقہ علاقوں کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ مگر اس کا اطلاق ہندوستانی ریاستوں پر نہیں ہوتا تھا۔ انڈین انڈی پیڈنٹس ایکٹ مجریہ ۱۹۴۷ء کی دفعہ (ب) کے مطابق :-

”ب) ملک معظم کا ہندوستانی ریاستوں پر اقتدار ختم ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ملک معظم اور ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان نافذ شدہ تمام معاہدات اور سمجھوتے بھی اس ایکٹ کے منظور کئے جانے کی تاریخ سے کالعدم ہو جائیں گے۔ ہندوستانی ریاستوں کے متعلق ملک معظم کے تمام احکامات جو اس تاریخ تک (جاری کئے گئے ہوں) ہندوستانی ریاستوں یا ان کے حکمرانوں کے متعلق ملک معظم کے تمام فرائض جن کا تعلق اس تاریخ تک ہو۔ اور اقتدار، حقوق، اختیار یا نفاذ قانون جس پر ملک معظم کا اس تاریخ تک اختیار تھا یا جس کا تعلق کسی معاہدہ، گرانٹ، استعمال، اجازت نامہ یا کسی دوسری صورت میں ہندوستانی ریاستوں سے ہو۔۔۔“ (سب کے سب اختتام کو پہنچ جائیں گے)۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ برطانوی بادشاہ کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد کوئی ریاست نوآزاد ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر سکتی تھی یا آزاد رہ سکتی تھی۔ اس بات کی تصدیق برطانوی دارالامراء میں ہندوستانی کی آزادی کے بل پر کی گئی درج ذیل بحث سے کی جاسکتی ہے :



واتی کاؤنٹ ٹپس وڈ۔۔۔۔۔ اب میں تیسرے سوال کی طرف آتا ہوں جس کو میں نمٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اور جس کا تعلق برطانوی اور ہندوستانی ہندوستان کے باہمی تعلقات سے ہے۔ یعنی ریاستوں کے ہندوستان سے۔ اُس ہندوستان سے جو برصغیر ہندوستان کے ایک تہائی رقبہ پر مشتمل ہے اور جس میں ہندوستان کی کل آبادی کا ایک چوتھائی آباد ہے۔ دارالامراء کے اس طبقے کی جانب سے ہم نے ہمیشہ ہندوستانی ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں پوری ہمدردی کے ساتھ توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ ریاستوں کے مسئلے میں ہم پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ملکی ضرورت کے مواقع پر ہندوستانی ریاستوں نے ہماری بار بار مدد کی ہے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ایک اور وجہ سے بھی ان کے متعلق ہم پر بڑی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

”ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں ہندوستانی ریاستوں کو اس مسئلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ انہیں ایک مملکت یا دوسری میں شمولیت اختیار کرنی چاہیے۔ اور دونوں مملکتوں میں سے ہر ایک بنیادی طور پر فرقہ واریت پر مبنی ہے۔ تاہم عام طور پر ہندوستانی ریاستیں بڑی حد تک فرقہ واریت کی تلخی سے ستر ہیں یہاں میں نوبل لارڈز کو یاد دلانا چاہوں گا کہ جب ۱۹۲۰ء میں ان ریاستوں نے وفاق ہندوستان میں شمولیت کا یہ مشکوک کی تھی تو یہ پورے ہندوستان کے وفاق کی بات تھی اور اس وقت یہ تصور کیا گیا تھا کہ پورے ہندوستان کے وفاق کے قیام کی ضرورت میں فرقہ واریت کوئی زیادہ اہم عنصر نہیں ہو گا۔ مگر آج کے حالات بالکل مختلف ہیں جبکہ انہیں دو میں سے کسی ایک مملکت میں شمولیت کے لئے کہا جا رہا ہے جن کی بنیاد فرقہ واریت پر رکھی گئی ہے میرے خیال میں یہ کہنا کہ ہم پر ان کے معاملے میں ایک یقیناً فرقہ واری عائد ہوتی ہے کہ ہم پوری ہمدردی کے ساتھ ان کو اپنی بہترین خدمات پیش کریں اور ان کے لئے اس بات کو آسان تر بنائیں کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک مملکت میں شمولیت کا فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہیں۔ اور یہ کہ جب ان کے پاس فیصلہ کرنے کے لئے مناسب وقت موجود ہے نہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔“

”اس موضوع پر (برطانوی) وزیراعظم نے کسی اور موقع پر جو کچھ کہا تھا میں اس سے بڑی حد تک مطمئن ہوں۔ انہوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ (ریاستیں) اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی



فیصلہ کرنے میں پوری طرح آزاد ہیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ نے آج پھر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس سلسلے میں ریاستوں پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتے گا۔ ان کی تقریر کے اس حصے تک میں بالکل مطمئن تھا مگر جب انہوں نے بعد ازاں پاسپورٹوں کے سوال پر بات کی تو انہوں نے ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے میرے دل میں قدرے بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ اگر میں انہیں درست سمجھا ہوں تو انہوں نے کہا ہے کہ ”ہم ریاستوں کو بین الاقوامی حقیقتیں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“ میں پوچھنا چاہوں گا کہ آیا یہ بیان صرف اس محدود عرصہ کے لئے ہے جب تک پاسپورٹوں سے متعلق پیچیدگیاں وغیرہ موجود ہیں یا اسے حکومت (برطانیہ) کی طرف سے ایک مستقل اعلان سمجھا جائے؟

’ارل آف لسٹوول‘: کیا عالی قدر ذاتی کاؤنٹ اس سوال کا بھی جواب چاہتے ہیں؟  
 ذاتی کاؤنٹ ٹیل ڈوڈ: ”مہربانی فرما کر جواب دیجئے۔“

ارل آف لسٹوول: ”میں اس وقت حکومت کی پالیسی کے مطابق ہی بیان دے رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ عالی قدر ذاتی کاؤنٹ اب مجھ سے کسی ایسے سوال کے جواب کی توقع نہیں کریں گے جس کے جواب کا انحصار واقعات پر منحصر ہے جن کے متعلق کوئی بھی اس وقت پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔“

ذاتی کاؤنٹ ٹیل ڈوڈ: ”پھر میں سمجھتا ہوں عالی قدر اہل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تسلیم کرنے کا سوال مستقبل کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ابھی جو کچھ کہا گیا ہے اُس کا اس کے سوا کوئی اور مطلب بھی ہو سکتا ہے۔“

ارل آف لسٹوول: ”ہم یقیناً اس صورتحال پر اس وقت غور کریں گے جب ریاستیں نوآزاد مملکتوں میں سے کسی کے ساتھ اپنے مستقبل کے تعلق کے متعلق فیصلہ کر لیں گی۔ یہ تمام مسائل اُس وقت زیر غور آئیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ عالی قدر ذاتی کاؤنٹ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس مرحلے پر میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

ذاتی کاؤنٹ ٹیل ڈوڈ: ”میں عالی قدر اہل کو پریشان کرنا نہیں چاہتا مگر میں اس معاملے کو صاف کر لینا چاہتا ہوں کیونکہ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ میں حکومت (برطانیہ) پر ابھی اور اسی وقت



دباؤ ڈال کر کوئی ایسا بیان جاری کروانا نہیں چاہتا کہ کسی ایسی ہندوستانی ریاست کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی جس کے لئے دونوں (نہ آزاد ملکوں ہندوستان اور پاکستان) میں کسی میں بھی شمولیت ممکن نہ ہو۔ مگر میں اس معاملے میں وضاحت چاہوں گا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جاتے تو کیا اس سوال پر اُس کے استحقاق کے مطابق غور کیا جاسکے گا؟ کیا واقعی ایسا ہی کیا جاسکے گا؟

ارل آف بسٹویل نے اثبات میں جواب دیا۔

والی کاؤنٹ ٹیلر وڈ: ”پھر مجھے اطمینان ہے۔۔۔“

(بحوالہ ٹائمز: برطانوی دارالاکرام میں ہندوستان کی آزادی کے بل پر بحث: مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۴۷ء، کالم: ۸۲۳ تا ۸۲۵)  
اگرچہ آئینی نقطہ نظر سے صورت حال یہی تھی مگر ہر متعلقہ شخص اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ اسے عملی صورت نہیں دی جاسکے گی۔ ہر ریاست کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک مملکت میں شمولیت کا فیصلہ کرے۔

اور اس فیصلے کا بڑی حد تک انحصار اُس ریاست کی جغرافیائی صورت حال اور اس میں عوام کے فرقہ وارانہ تناسب سے تھا۔ شمال کے طور پر فرض کر لیا گیا تھا کہ ہندوستان سے ملحقہ غیر مسلم اکثریتی آبادی والی ریاست ہندوستان میں شامل ہوگی اور پاکستان سے ملحق مسلم اکثریتی آبادی والی ریاست پاکستان میں شامل ہو جائے گی۔ دانشمندی کا راستہ یہی تھا۔ مگر بعض ریاستوں کے معاملے میں پیچیدگی یہ بھی کہ حکمران ایک فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور عوام کی اکثریت کا تعلق دوسرے فرقے سے تھا۔ مثال کے طور پر بھوپال اور جونا گڑھ کے حکمران مسلمان تھے مگر وہاں کی آبادی کی اکثریت غیر مسلم تھی۔ حیدرآباد کی صورت حال بھی یہی تھی۔ تینوں ریاستیں نہ صرف ہندوستان سے ملحق تھیں بلکہ ان کا پاکستان کے ساتھ براہ راست کوئی جغرافیائی رابطہ نہ تھا۔ البتہ ساحلی ریاست ہونے کی وجہ سے جونا گڑھ کی سمندر کے راستے پاکستان تک رسائی ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف کشمیر کا حکمران غیر مسلم تھا جبکہ اس کی آبادی کی بھاری اکثریت مسلمان تھی۔ اس کی سرحدوں کا بیشتر حصہ بھی پاکستان سے ملحق تھا۔ اس سے نکلنے والے دو دریا پاکستان میں بہتے ہیں۔ اس کی دو بڑی سرزمینیں اور واحد ریلوے لائن پاکستان سے منسلک تھی۔ سرسرنل ریڈ کلف ایوارڈ سے کسی حد تک ہندوستان کی کشمیر میں



رسانی ہوگی۔ ریاست کشمیر کے جزائے کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ مشرق اور شمال میں پہاڑی سلسلوں کے ذریعے اس کی سرحدیں ثبت اور چین سے جاملتی ہیں۔

ان ریاستوں کے حکمرانوں میں سے بھوپال کے حکمران نے الحاق کی شرائط کی وضاحت کی کہ کشمیر کے بعد ہندوستان میں شمولیت اختیار کر لی جو ناگزیر کے حکمران نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ حکومت ہندوستان نے دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ اس بنا پر بھی احتجاج کیا کہ پاکستان کی جانب سے جو ناگزیر کے الحاق کو تسلیم کرنا متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی تھی کیونکہ پاکستان میں صرف مسلم اکثریتی علاقے شامل ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ اس اصول پر کاربند رہے گا کہ جہاں ریاستی حکمران ایک فرقے سے اور عوام کی اکثریت دوسرے فرقے سے تعلق رکھتی ہو وہاں الحاق کا فیصلہ ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق کیا جائے گا۔ بعد ازاں ہندوستان نے اپنی فوجیں جو ناگزیر میں اتار دیں اور ریاست پر فوجی غلبہ کے دوران ایک نام نہاد وراثے شماری کروا کے جو ناگزیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔

نظام حیدر آباد کے ساتھ اس سوال پر گفت و شنید ہوتی رہی کہ کیا وہ حیدر آباد کا ہندوستان کے ساتھ تعلق معاہدے کے تحت برقرار رکھنے پر آمادہ ہے یا اپنی شرائط پر اسے ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کے لئے پیش کی گئی تھیں۔ نظام الحاق کا دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہندوستان نے اس آئینی مسئلے کا حل یہ نکالا کہ حیدر آباد پر فوج کے ذریعے قبضہ کر لیا۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب سکھوں سے پنجاب کا علاقہ چھین لیا تو جموں کے راجہ گلاب سنگھ نے جس نے درپردہ سکھوں کے خلاف برطانیہ کی مدد کی تھی کمپنی سے اپنی گراں قدر خدمات کے صلے کا مطالبہ کیا جب اس سے پوچھا گیا کہ اسے کیا چاہیے تو اس نے دیراتے راوی اور سندھ کے درمیان واقع تمام پہاڑی علاقے کا مطالبہ کیا۔ اسے بتایا گیا کہ سکھوں کے خلاف فوج کشی کے اخراجات میں سے اسے اپنے حصے کی رقم کمپنی کو ادا کرنا ہوگی۔ بالآخر ایک سودا طے ہو گیا جسے ۱۸۴۶ء کے معاہدہ امرتسر کا نام دیا گیا۔ کمپنی کی طرف سے اس پر گورنر جنرل



ہندوستان لارڈ لارنس نے دستخط کئے۔ اس کی رو سے یہ وسیع و عریض علاقہ برطانیہ نے پچھتر لاکھ روپے کے عوض راجہ گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔

بعد ازاں خود لارڈ لارنس نے اس سودے کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا :  
 "... ایک نہایت کاہل باز پرس پالیسی فیصلے کے ذریعے جس کا پہلے ہی سے انتظام کر لیا گیا تھا اور جس کے ذریعے خوش باش کشمیریوں پر ہمیشہ کے لئے بے شمار مصائب لاد دیتے گئے۔ ہم نے کشمیر ڈوگرہ راجپوت گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ اس نے ہمیں اس کی قیمت کمشت نقدی کسی صورت میں اُس خزانے سے ادا کر دی جو اس نے لاہور کے دربار سے لوٹا تھا۔"

(بحوالہ ایوان سیکورٹی کونسل آفیشل ریکارڈ، پٹنڈر ڈائر۔ نمبر ۱۔ ۱۵ صفحہ ۳۲۷)

ذرا بعد لارڈ لارنس نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا :

"یہ ایک انتہائی غیر منصفانہ انتظام تھا جس کے تحت کشمیر اور اس کے بد قسمت باسیوں کو اُن کی مرضی کے خلاف گلاب سنگھ کو منتقل کیا جانا تھا۔ ڈوگرہ راجپوت، جس کا کشمیریوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہ تھا۔"

۷ جنوری ۱۸۴۸ء کو لارڈ لارنس نے گلاب سنگھ کو لکھا :

"میرے دوست ! میں جلد یورپ روانہ ہونے والا ہوں۔ ہندوستان چھوڑنے سے قبل میں ایک ایسے دوست کی حیثیت سے یوڈر ہائیٹس سے مخاطب ہونا چاہتا ہوں جسے آپ کی خوشی عزیز ہے اور دوسری تمام وجوہ کے علاوہ مجھے ان لوگوں کی خوشی عزیز ہے جنہیں میں نے آپ کے اختیار میں اُس وقت دے دیا تھا جب میں نے مارچ ۱۸۴۶ء میں ایک معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ یوڈر ہائیٹس اُس اصول سے بخوبی آگاہ ہوں گے جس کے تحت برطانوی حکومت مشرقی و ایشیائی ریاست کے ساتھ تعلقات قائم رکھتی ہے جہاں پر علاقوں کے قبضے کے سوال کا تعلق ہو۔ تو (برطانوی حکومت) جہاں اپنے اتحادی کی دل و جان سے امداد کرتی ہے وہاں وہ کبھی اس بات پر رضامند نہیں ہو سکتی کہ شہزادے کے اختیار میں دیئے جانے والے لوگوں کے لئے اس کو (برطانوی حکومت کو) بالواسطہ طور پر تشدد کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتے۔ اگر نا انصافی کے باعث کسی والٹی ریاست کے لئے لوگوں کی ناپسندیدگی اتنی عام ہو جاتے کہ لوگ اس



کے زوال کے خواہاں ہو جائیں تو برطانوی حکومت کسی بھی لحاظ سے اس امر کی پابند نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو زبردستی اس حکمران کے سامنے جھکنے پر مجبور کرے جو اپنے غلط طرز عمل کے باعث خود کو عوام کی وفاداری سے محروم کر چکا ہو۔

”اگر پڑوسی و اہلیان ریاست کے ساتھ اپنے معاہدوں اور سرحدوں پر اپنی افواج کے تعین کے قریب کے باعث برطانوی حکومت والی کی اس حد تک حفاظت کر سکتی ہے کہ اُسے اپنی رعایا کو دبانے کے قابل بنایا جاسکے تو اس قسم کی صورت حال بھی برطانوی حکومت کے جذبات کے خلاف ہوگی۔ کیونکہ اس سے بالواسطہ طور پر لوگوں کو آواز اٹھانے اور ان کی حکومت کی غلطیوں کا ازالہ کرنے میں رکاوٹ پڑے گی۔

”لہذا برطانوی حکومت کسی بھی حالت میں ایک حکمران کی جانب سے اپنے عوام کے خلاف نا انصافی میں آلہ کار نہیں بنے گی۔ اور اگر اس کی دوستانہ تنبیہوں کے باوجود شکایات کا ازالہ نہ ہو سکا تو براہ راست مداخلت کا نظام اختیار کرنا پڑے گا۔ اور یورپاتی نیس یقیناً آگاہ ہوں گے کہ ایسی صورت میں حکمران کے وقار میں کمی آجائے گی اور حکمران کی آزادی کو بھی کم کر دیا جائے گا۔“  
(ایضاً: صفحہ ۳۲۸-۳۲۹)

مظالم کے واقعات میں سے ایک جو بعد ازاں حکومت ہند کے علم میں آیا اس کا اظہار ۱۶ مئی ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں کیا گیا ہے جو حکومت ہند کے قائم مقام انڈر سیکریٹری نے حکومت پنجاب اور اس کے ماتحت علاقوں کے سیکریٹری کے نام لکھا۔ اس دستاویز کا نمبر ۴۱۴ ہے اور اس میں کہا گیا ہے:-

”سرا مجھے یہ درخواست کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ راولپنڈی کے کمشنر کے ساتھ کیا جانے والی اُس خط و کتابت کی ایک نقل کونسل میں گورنر جنرل کے ملاحظے کے لئے روانہ کی جائے جس میں جموں کی ایک خاتون کا ذکر ہے جس کی زبان کاٹ ڈالی گئی تھی۔ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ میں لیفٹیننٹ گورنر کی کارروائی کے خلاصہ میں اس واقعہ کا اندراج نمبر ۲۶ ہے اور یہ ۶ مئی کو ختم ہونے والے ہفتے میں شامل ہے۔“

”سلامتی کونسل شاید یہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہو کہ آخر اس عورت کا جرم کیا تھا۔ اُس غریب



عورت کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے ایک گائے کو مارا تھا۔ چنانچہ عورت کو حکمران کے روبرو پیش کیا گیا جس نے عورت کی زبان کاٹنے کے ساتھ ساتھ بال مونڈنے اور تمام پانچوں اعضاء میں پھرانے کا حکم صادر کیا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ (ایضاً صفحہ ۳۴۰)

یہ علاقہ اپنے خُن کے لئے مشہور ہے۔ کشمیر کے لوگ بھی دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ریشم، اُون، کندہ کاری اور چاندی کے ظروف جیسی خوبصورت اور نادر مصنوعات میں جو دنیا بھر میں معروف ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔

”مگر جس چیز سے دنیا بے خبر ہے وہ کشمیریوں کے مصائب کی شدت ہے جس کا وہ گزشتہ ایک صدی سے شکار بنے آ رہے ہیں۔ ڈوگرہ راج کے جبر و استبداد کی انتہا کے سامنے یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک کشمیری کی زندگی مشکل ہے یا موت۔ اکثر موت ہی کشمیری کو مصائب، آرام اور مسلسل پریشانیوں کا نہ ٹوٹنے والی بنخیروں سے نجات دلاتی ہے۔ ان مصائب کا آغاز مہد سے ہوتا ہے اور یہ صرف قبر میں پہنچ کر ہی ختم ہوتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۶۲-۶۵)

ہندوستان کی تقسیم کے موقع پر منہزہ، گلگت اور بعض دوسری پڑوسی وادیاں جن کا کشمیر کی حکومت کے ساتھ تعلق برائے نام تھا اور جن کی آبادیوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی کشمیر سے الگ ہو کر پاکستان کا حصہ بن گئیں۔ ان تک عدم رسائی ہی ان کی حفاظت کے لئے ڈھال بنی اور وہ عملاً کشمیر سے الگ ہو گئیں۔

الحاق کے سوال پر بہار راجہ (کشمیر) کو فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے وزیر اعظم سٹرام چندر کاک نے جوینڈت نہرو ہی کی طرح کشمیری برہمن تھا، اسے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ دیا مگر گاندھی جنہوں نے انہی دنوں بہار راجہ سے ملاقات کی تھی اس کے وزیر اعظم کے متعلق شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بہار راجہ کشمیر جو پنجاب کے ضلع کانگڑہ سے تعلق رکھتی تھی اس نے بہار راجہ پر زور دیا کہ وہ سٹرام کاک سے نجات حاصل کر کے اس کی جگہ سٹرام چند بہار راجہ، جج مشرقی پنجاب ہائی کورٹ کو ریاست کا وزیر اعظم مقرر کرے۔ بہار راجہ پنجاب ہاؤنڈری کمیشن کا ہندو رکن تھا اور اس کا تعلق ضلع کانگڑہ سے تھا۔

ہندوستان کے بار بار دہرائے گئے ان پر زور دعووں کے ضمن میں کہ اُس نے الحاق کے



مسلے پر ہمارا جے کشمیر پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کی ہرگز کوشش نہیں کی، مسٹر مہر چند ہاجن کے بحیثیت وزیر اعظم کشمیر تقرر کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپی کا حامل ہوگا:

”میں نے یہ کہتے ہوئے پیشکش قبول کر لی کہ جو نہیں مجھے حکومت ہندوستان نے فارغ کیا اور مجھے ریاست کی خدمت کرنے کے لئے چھٹی اور اجازت ملی تو میں واپس آکر وزیر اعظم کا عہدہ سنبھال لوں گا۔ اس کے بعد میں دہلی روانہ ہو گیا۔

”دہلی میں ہندوستانی وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کے ہمراہ میں نے ۱۹ ستمبر کو وزیر داخلہ سردار پٹیل سے ملاقات کی۔ اُس نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مجھے علم حکم دیا کہ میں اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے فداؤ سہی نگر روانہ ہو جاؤں۔ اُس نے کہا کہ وہ مجھے آٹھ ماہ کی رخصت دے دے گا جس کا میں مستحق تھا۔ مجھے کشمیر میں ملازمت کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی جو اس کے خیال میں اُس وقت کے حالات میں ہندوستان کے مفاد میں تھی۔

”میں ہندوستانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملا اور میں نے ان نکات اور شرائط کا ذکر کیا جن کی بنیاد پر ہمارا جے چاہتا تھا کہ میں ہندوستان کے ساتھ بات چیت کروں۔ ہمارا جے ہندوستان کے ساتھ الحاق اور ریاست میں انتظامی اصلاحات کرنے پر بھی تیار تھا۔ تاہم وہ چاہتا تھا کہ انتظامی اصلاحات کا سوال بعد میں اٹھایا جاتے۔ پنڈت جی ریاست کے اندرونی انتظام میں فوری تبدیلی چاہتے تھے چنانچہ جب میں نے ہمارا جے کے خیالات اُن تک پہنچاتے تو وہ کسی قدر ناراض نظر آ رہے تھے۔ پنڈت نہرو نے مجھ سے بھی کہا کہ میں خیال رکھوں کہ شیخ عبد اللہ کو رٹا کر دیا جاتے۔

”مجھے ہاتھ گا ندھی سے ملنے کا مشورہ دیا گیا اور میں نیاز مندی کے اظہار کے لئے ان سے ملنے چلا گیا۔ میں نے ان سے ایک گھنٹہ تک گفتگو کی۔ وہ ہمارا جے کو کشمیر کی حکمرانی سے الگ کرنے یا انہیں نقصان پہنچانے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ اگر ممکن ہو تو کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ انتظامیہ کا ڈھانچہ جمہوری نوعیت کا ہونا چاہیے۔ میں نے پنڈت نہرو کی خواہشات ہمارا جے کو پہنچا دیں اور دیگر بھارتی لیڈروں کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے خلاصہ سے بھی اُس کو آگاہ کر دیا۔



”میں دہلی سے امرتسر روانہ ہو گیا جہاں میں نے مشرقی پنجاب کے بیج کی حیثیت سے اپنے  
فرائض دوبارہ سنبھال لئے۔۔۔“

”امرتسر پہنچ کر میں نے چیف جسٹس کی وساطت سے گورنر کو آٹھ ماہ کی رخصت اور دوسری  
جگہ ملازمت کرنے کی باضابطہ اجازت دینے کے لئے درخواست ارسال کی لگتا تھا کہ سر چند ولال  
ترویدی کو بظاہر اس کا فیصلہ کرنے کی جلدی نہیں تھی شاید اُسے معلوم نہیں تھا کہ حکومت اس معاملے  
میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس دوران ہمارا جہ مجھ پر فوراً وزیراعظم کشمیر کا عہدہ سنبھالنے کے لئے زور  
دے رہا تھا کیونکہ ریاست میں صورتحال دن بدن پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی۔“

”۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نصف شب کے وقت جب میں بستر میں لیٹا ہوا تھا کہ سردار پٹیل بھائی  
پٹیل کا نہایت تاکید یافتہ آیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ اب تک سری نگر کیوں نہیں گئے۔ آپ کو فوراً  
سری نگر جانا ہو گلا۔ میں نے انہیں بتایا کہ گورنر کی جانب سے مجھے رخصت دیتے جانے اور دوسری  
جگہ ملازمت کرنے کی اجازت ملنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ ایسا لگتا ہے کہ سردار پٹیل نے اُسی  
وقت گورنر (سر چند ولال ترویدی) کو فون کیا اور اُس سے کہا کہ انہیں رخصت اور دوسری  
جگہ ملازمت کرنے کی اجازت دی جاتے۔ سردار پٹیل نے رات ایک بجے مجھے دوبارہ فون کیا۔  
اور مجھے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے جہاز میں جو اُس روز امرتسر میں تھا فوراً دہلی پہنچنے کے لئے کہا  
۔۔۔۔۔ علی الصبح گورنر کی جانب سے فون پر پیغام ملا جس کے مطابق مجھے ۱۰ اکتوبر سے آٹھ ماہ کی  
رخصت اور ریاست میں ملازمت کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک تار  
موصول ہوا۔“

”آپ کو ایک ہندوستانی ریاست میں ملازمت کرنے کے لئے آٹھ ماہ کی رخصت اور اجازت  
۱۱ اکتوبر سے دی جا رہی ہے۔ یہ سوال کہنا بے لگے کہ کیا رخصت الاؤنس دیتے جائیں گے یا نہیں تو اس کا  
فیصلہ بعد میں کیا جائے گا۔ گورنر۔“

لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے کمال بھرائی سے مجھے اپنے طیارے میں دہلی تک سفر کرنے کی اجازت دے دی میں دہلی  
گیا کہ پہنچا۔ وہاں میں سردار پٹیل، پنڈت جواہر لال نہرو، ہاتھکانڈھی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا لارڈ ماؤنٹ بیٹن  
سے میری ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اُس نے مجھے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ میری پوزیشن



غیر منقصب تھی اور وہ نہیں جانتا کہ مجھے ہمارا جو کیا مشورہ دینا چاہیے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہمارا جو  
 کے روسیہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جب اُس کے دورہ کشمیر کے دوران ہمارا جو نے الحاق کے  
 سوال پر اُس کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے امانہ لگایا کہ اُس کے خیال کے  
 مطابق کشمیر کے لئے پاکستان کے ساتھ الحاق کے سوا کوئی متبادل راہ نہیں تھی۔ اگرچہ اُس نے کہا کہ  
 ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اُسے خوشی ہوگی اگر میں ہمارا جو کو ہندوستان کے ساتھ  
 الحاق کرنے کا مشورہ دوں۔ اُس نے مجھے سٹر مینن سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا جس پر اُسے  
 بے حد اعتماد تھا۔ اُس نے اپنے اے ڈی سی سے کہا کہ وہ مجھے سٹر مینن کے پاس لے جاتے جو  
 اُس وقت سٹر شام پر شاؤد کرجی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ان دونوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی بھی طرح  
 ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی راہ ہموار کروں۔ ”(گلنگ نیک: صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۸)

مارچ ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتے میں کشمیر کے وزیراعظم کی حیثیت سے اپنے عہدے کی میعاد  
 پوری کرنے کے بعد سٹر مہاجن نے ریاست بیکانیر کے وزیراعظم کا عہدہ قبول کرنے پر رضامندی  
 ظاہر کر دی۔ سردار پٹیل نے ”مجھے کہا کہ وہ مجھے وقتی طور پر ریاست بیکانیر کی سرورس اختیار کرنے  
 کی اجازت دے دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے مجھے وارننگ دی کہ اب مجھے راجستھان  
 کے ایک حکمران سے معاملہ طے کرنا ہوگا اور یہ کہ مجھے ریاست بیکانیر کے معاملات درست کرنے  
 میں بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔“ (گلنگ نیک: صفحہ ۱۷۹)۔ اس کی مشرقی پنجاب  
 ہائی کورٹ سے رخصت ہونے کے ابتدائی پندرہواڑے میں ختم ہونے والی تھی۔

ہمارا جو (بیکانیر) چاہتا تھا کہ میں کم از کم مزید چھ ماہ تک بیکانیر کے وزیراعظم کی حیثیت  
 سے کام کرتا رہوں مگر سردار پٹیل نہیں چاہتا تھا کہ میں جون ۱۹۴۸ء میں اپنی رخصت ختم ہونے کے  
 بعد وہاں رہوں۔ ۱۸ مئی ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل نے ہمارا جو کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

”سٹر جسٹس مہاجن کے بارے میں آپ کے ۱۲ مئی ۱۹۴۸ء کے تحریر کردہ خط کے لئے شکریہ۔  
 مگر اس سوال کا بنیادی طور پر تعلق مشرقی پنجاب کی حکومت سے ہے اور ہائی کورٹ کے کسی جج  
 کے لئے بھی کافی معیوب لگتا ہے کہ وہ کسی دوسری ریاست میں کام کرنے کے لئے اتنے طویل  
 مدت تک اپنی ڈیوٹی سے دُور رہے۔ پچھلی مرتبہ بھی حکومت پنجاب بادلِ سخاوت اُس کے کشمیر جانے



پیر زمانہ ہوتی تھی۔ مجھے شہر ہے کہ اب وہ اس تجویز کو قبول نہیں کرے گی۔ مزید برآں اسے کشمیر کی فوجی اور جنگی اہمیت کی بنا پر وہاں منتقل کیا گیا تھا جس کے لئے عام قواعد و ضوابط کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ آپ کے کہیں میں میں اسی قسم کی وجہ کو یاد کرانے میں کامیاب ہو سکوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس تجویز کی سرپرستی کرنے کے ضمن میں آپ میری مشکلات کو سمجھیں گے۔ تاہم اگر مہاجن حکومت مشرقی پنجاب کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جائے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن مہاراجہ کا بہت گہرا دوست تھا۔ چنانچہ میرے بیکانیر میں قیام کے دوران مہاراجہ نے دو مرتبہ پھر میرے قیام میں توسیع کے لئے اس کی وساطت سے سردار پٹیل سے رابطہ قائم کیا مگر سردار پٹیل نہیں مانا۔“  
(گلنگ بیگ: صفحہ ۸-۱۸۷)

چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ اتحاد سردار پٹیل کی پالیسی کا بنیادی مقصد نہ تھا۔ مگر جسٹس مہاجن کی حیثیت بھی اس مقصد کے حصول کے لئے استعمال کئے جانے والے ایک آلے کی تھی۔ اور سردار پٹیل کو بالخصوص کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

مہاراجہ نے میرے فیصلے پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور کبھی میرا مشورہ ماننے میں تاثر کا اظہار نہ کیا۔ میں نے اسے مکمل وفاداری دی اور ریاست میں اس کے وقار اور حیثیت کو بحال رکھنے کے لئے ہر ممکن اقدام کیا۔ ریاست پر حملے اور ریاستی فوجوں کی پسپائی کے بعد وہ کشمیر کے تحفظ کے لئے مکمل طور پر ہندوستان کے رحم و کرم پر تھا۔ ہندوستان اس پر اپنی مرضی کی شرائط مسلط کر سکتا تھا اور مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ابتدائی مرحلے میں میں ہندوستان کے وزیر اعظم اور سردار پٹیل سے مہاراجہ کشمیر کے لئے ریاست میں مہاراجہ میسور جیسی پوزیشن حاصل کر سکتا تھا۔ حملے سے قبل سردار پٹیل نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آئینی لحاظ سے مہاراجہ کشمیر کو نظام حیدر آباد جیسی حیثیت حاصل رہے گی۔ اس وقت نظام کو نہایت پرکشش شرائط پیش کی گئی تھیں مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا اور اپنے لئے ایک الگ مملکت تشکیل دینا چاہتا تھا۔ اگر حکومت ہندوستان اور پنڈت جواہر لال نہرو اس خط میں متذکرہ شرائط کی پابندی کرتے جو انہوں نے اتحاد کے موقع پر مجھے دیا تھا اور ریاست کو اس وقت کی تجویز کے مطابق میسور کی طرز پر ایک ریاستی آئین دے دیا جاتا تو مہاراجہ کشمیر کی پوزیشن خاصی محفوظ ہوتی اور شیخ عبداللہ کو مہاراجہ کو



نکال باہر کرنے اور ریاست کا خود مختار حاکم بن بیٹھے کا موقع نہ ملتا تاہم جیسا کہ دوسری ریاستوں میں ہوا، مہاراجہ کشمیر کا عہد حکومت بھی مختصر ہوتا اور دوسری ریاستوں کی طرح بالآخر اسے بھی ہندوستان میں شامل کر لیا جاتا۔ اس کے بعد جو خط و کتابت ہوتی اس میں وزیر اعظم ہندوستان نے (کشمیر کو) ایسور جیسی پوزیشن دینے کے تاثر کو گھٹانے اور مہاراجہ کو محض آئینی سربراہ کی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس سوچ کی شدید مخالفت کی۔ ہم وزیر اعظم ہندوستان کو سختی سے اپنے وعدے پر قائم رکھنا چاہتے تھے مگر وہ اس بنیاد پر اس سے روگردانی کن چاہتے تھے کہ وعدہ کرنے کے بعد حالات یکسر بدل چکے تھے۔

”(گلنگ بیگ“ صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

”فردری کے اوخر میں وزیر اعظم کے سیکرٹری نے فون پر مجھے دہلی آنے کی دعوت دی۔ میں دہلی گیا۔ وزیر اعظم نہرو، مسٹر باجپاتی اور سر گوپالا سوامی آئینگر نے تجویز پیش کی کہ مہاراجہ کو ایک اعلان کے ذریعے شیخ عبداللہ کو ریاست کا وزیر اعظم نامزد کر دینا چاہیے اور مجھے محض دیوان کا خالی عہدہ دیا جانا چاہیے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے سلامتی کونسل میں ہندوستان کے ہاتھ مضبوط ہوں گے جہاں کشمیر کے الحاق کا مسئلہ التوا میں پڑا ہوا تھا۔“

”(گلنگ بیگ“ صفحہ ۱۴۱)

کشمیر میں بدامنی برطانوی پنجاب اور پنجاب میں واقع ہندوستانی ریاستوں جیسے کپور تھلہ، فرید کوٹ، پٹیالہ اور جنوب اور مشرق سے پرہی طرف کچھ اور ریاستوں جیسے انور اور بھارت پور وغیرہ کے واقعات کا نتیجہ تھی جیسا کہ کپور تھلہ میں مسلم اکثریت اور دوسری ریاستوں میں مسلم اقلیت کا یا تو قتل عام کیا جا رہا تھا یا طاقت کے بے رحمانہ استعمال سے انہیں وہاں سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔ اس صورت حال سے ریاست جموں و کشمیر کی مسلم اکثریت کے ذہنوں میں اس بات کا خدشہ بجا تھا کہ جب تک ریاست کا حکمران پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان نہیں کرے گا انہیں بھی ایسی حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جو مذکورہ اور دوسری ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایچیٹن شمشرون کر دی جس میں ریاستی حکمران سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کرے۔ اس کے جواب میں



بہار اجمہ کے حکم پر ریاستی فوج نے مسلمانوں پر مظالم شروع کر دیئے۔ اس صورتحال کا خلاصہ شیخ عبداللہ نے ایک بیان کی صورت میں جاری کیا جو ۲۲ اکتوبر کے اخبار ”دی سٹیٹس مین“ میں شائع ہوا۔

آج ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے کشمیری قوم پرست لیڈر شیخ عبداللہ نے کہا کہ ”ریاست کو نوآزاد مملکتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کے لئے وقت دیا جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ ”اس دوران ہم اسے دوست شخصی حکومت سے نجات حاصل کرنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں“ انہوں نے مزید کہا ”دوسری جانب مسلمان پورہ تھلہ کے مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ دیکھ چکے ہیں جہاں وہ اکثریت میں تھے اس کے باوجود ان کا مصفا یا کر دیا گیا۔ اُس ریاست میں اب ایک بھی مسلمان باقی نہ رہا۔ الود، بھارت پور اور فزید کوٹ میں بھی انہیں ایسی ہی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا ہے جہاں مسلمان آبادی کا یا تو قتل عام کر دیا گیا یا انہیں طاقت کے بل پر وہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔ مگر اصل خدشہ یہ ہے کہ اسی قسم کی صورت کشمیر میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔“

(بحوالہ: اقوام متحدہ سلامتی کونسل، سرکاری ریکارڈ، تیسرا سال، جلد ۱۵، انا ۱۵، صفحہ ۶۸-۶۹)

”شیخ عبداللہ نے کہا کہ پونچھ جو کشمیر ہی کی ایک جاگیر ہے، وہاں بد امنی کی وجہ ریاست کی غیر دانشمندانہ پالیسی ہے۔ پونچھ کے عوام جو مقامی حکمران اور پھر بہار اجمہ کشمیر کے ماتحتوں مظالم برداشت کرتے رہے ہیں وہ اب پونچھ کے حکمران کے بے جا استبداد کے خلاف تحریک شروع کر چکے ہیں تاکہ ان کی شکایات کا ازالہ ہو سکے۔ یہ تحریک فرقہ وارانہ نہیں ہے۔ ریاست کشمیر نے اپنے فوجی دستے وہاں بھیجے اور پونچھ میں بد امنی پھیل گئی۔ انہوں نے وضاحت کی کہ پونچھ کی بالغ آبادی کی اکثریت سابق ہندوستانی فوجیوں پر مشتمل تھی جن کے جہلم اور راولپنڈی میں آباد لوگوں کے ساتھ قریبی تعلقات تھے — یہ دونوں مقامات مغربی پاکستان میں واقع ہیں۔

”انہوں (پونچھ کے باشندوں) نے اپنی عورتوں اور بچوں کو پونچھ سے نکال کر سرحد پار کی اور اٹلھ کے ساتھ واپس آ گئے جو انہیں ریاست میں مسلح اقدام کرانے کے خلاف افراد نے فراہم کیا تھا۔ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ کشمیر کی ریاستی فوجوں کو بعض علاقوں سے پسپا ہونا پڑا۔“

(بحوالہ: اقوام متحدہ سلامتی کونسل، سرکاری ریکارڈ، تیسرا سال، جلد ۱۵، انا ۱۵، صفحہ ۶۸-۶۹)



اس دوران وزیر اعظم کشمیر نے شکایات کیں کہ پاکستان میں شمال کو جوں کا توں رکھنے کے معاہدہ کی شرائط پر عمل پیرا نہیں ہے جو کشمیر نے پاکستان کے ساتھ ڈاک کی سہولتوں کی فراہمی وغیرہ کے سلسلے میں کیا تھا جبکہ پاکستان کی جانب سے یہ شکایت کی گئی کہ ریاست میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ حکومت پاکستان نے تجویز پیش کی کہ کراچی میں واقع اس کے دفتر خارجہ کا ایک سینئر عہدیدار کشمیر جا کر ریاست کے وزیر اعظم کے ساتھ ان معاملات کے بارے میں موقع پر ہی تبادلہ خیالات کرے۔ جب پاکستانی وزارت خارجہ کا ایک جوائنٹ سیکرٹری اس مقصد کے لئے سری لنکر پہنچا تو ریاستی وزیر اعظم نے اس کے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۵ اکتوبر کو ریاستی وزیر اعظم نے ریاست میں رونا ہونے والے واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کی درخواست کی۔ پاکستان نے تارکے ذریعہ اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور وزیر اعظم کشمیر سے کہا کہ وہ اپنا نمائندہ نامزد کرے اس کے نام سے آگاہ کرے تو پاکستان بھی اپنے نمائندے کے نام کا اعلان کر دے گا۔ مگر اس سلسلے میں وزیر اعظم کشمیر کی جانب سے مزید کسی کارروائی کی خبر نہ ملی۔

ان دونوں کوششوں کی ناکامی کے بعد حکومت پاکستان نے وزیر اعظم کشمیر کو کراچی آ کر معاملات پر بات چیت کرنے کی دعوت دی مگر یہ دعوت مسترد کر دی گئی۔

اس پر یہ تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں گورنر جنرل پاکستان، وزیر اعظم پاکستان، گورنر جنرل ہندوستان اور وزیر اعظم ہندوستان اور کشمیر کے نمائندے شرکت کریں۔ توقع تھی کہ یہ کانفرنس ۲۹ اکتوبر کو ہوگی مگر چونکہ اُس روز وزیر اعظم ہندوستان کی طبیعت خراب تھی اور وہ دہلی سے لاہور کا سفر کرنے کے قابل نہیں تھے اس لئے یہ کانفرنس یکم نومبر پر ملتوی کر دی گئی مگر ہندوستانی وزیر اعظم پھر بھی اس میں شرکت کرنے سے معذور تھے چنانچہ کانفرنس کا خیال ترک کرنا پڑا۔ مگر ہندوستان کا گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن جوائنٹ ڈیفنس کونسل کی میٹنگ میں شرکت کے لئے لاہور آیا تو گورنر جنرل پاکستان مسٹر جناح اور اس کے درمیان کچھ گفتگو تھیں ہوئیں۔ ان کا غلامہ یہ تھا کہ گورنر جنرل پاکستان نے گورنر جنرل ہندوستان کو حکومت ہندوستان کے غوراء اور منظوری کے لئے تجاویز دیں۔



۱۔ ”جنگ خواروک دی جاتے۔ دونوں گورنر جنرلوں کو اس بات کا مکمل اختیار دیا جاتے کہ وہ فوراً ایک اعلامیہ جاری کریں جس میں متحارب قوتوں کو آرٹائیس گھنٹے میں جنگ بند کرنے کا نوٹس دیا جاتے۔ گورنر جنرل پاکستان کا عبوری حکومت آزاد کشمیر یا جنگ میں ملوث قبائلیوں کی فوج پر کوئی کنٹرول نہیں ہے مگر وہ انہیں واضح الفاظ میں انتباہ کریں گے کہ اگر وہ لوگ فوری طور پر جنگ بند نہیں کرتے تو دونوں نوآبادی مملکتوں کی فوجیں ان کے خلاف جنگ کریں گی۔

۲۔ ہندوستانی اور قبائلی فوجیں دونوں بیک وقت جموں اور ریاست کشمیر کے علاقوں سے واپس چلی جائیں۔

۲۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں کی منظوری سے دونوں گورنر جنرلوں کو امن کی بحالی کے لئے مکمل اختیارات دیتے جائیں۔ وہ ریاست جموں کشمیر کا نظم و نسق سنبھال لیں اور اپنے مشترکہ کنٹرول اور نگرانی میں راستے شماری کا انتظام کریں۔“ (ایضاً: صفحہ ۹۰ - ۹۱)

حکومت ہندوستان نے ان تجاویز کا کوئی جواب نہیں دیا مگر ہندوستانی وزیراعظم نے ۲ نومبر کو ایک نشری بیان دیا جسے انہوں نے بعد ازاں گورنر جنرل پاکستان کی تجویز کا جواب قرار دیا۔ اس صورتحال کا خلاصہ برطانوی وزیراعظم کے نام حکومت پاکستان نے ایک ٹیلی گرام کی صورت میں یوں بیان کیا :-

”نڈت نہرو کا نشری بیان صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستانی حکومت پورے جموں کشمیر پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس پورے علاقے پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ بظاہر اس مبہم مگر دلکش لغزے کا آرٹ میں کیا جا رہا ہے کہ کشمیر کی تقدیر کا فیصلہ بالآخر اس کے عوام کریں گے۔ نڈت نہرو نے ”راستے شماری“ کا لفظ استعمال کرنے سے بھی گریز کیا اور اس کی جگہ ”ریفرنڈم“ کہا جس کا کوئی بھی مطلب لیا جاسکتا ہے حکومت ہندوستان کے جموں کشمیر کے علاقے پر مکمل قبضے کے بعد راستے شماری یا ریفرنڈم محض ایک مذاق بن کر رہ جاتے گا۔

”رین اٹنا پورے مغربی پاکستان اور قبائلی علاقوں میں عوام کے جذبات بہت برا لگتے تھے۔ چلے میں اور یہ جلد ہی ہر قسم کے کنٹرول سے باہر ہو جائیں گے۔ مشرقی پنجاب میں وحشیانہ قتل عام کے



بعد یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگ جموں اور کشمیر میں اسی قسم کا المیہ صبر کے ساتھ دیکھتے ہیں۔  
 ”جموں کی صورت حال کی بہت مختصر سی خبریں بیرونی دنیا تک پہنچنے دی جا رہی ہیں مگر وہاں صورتحال انتہائی سنگین ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہاں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ صرف جموں شہر میں نوے ہزار مسلمانوں کی نشان دہی کی جا چکی ہے اور ان کی جانوں کو فوری خطرہ لاحق ہے۔ مسئلہ اس قدر آتش گیر اور خطرناک ہے کہ اس کو فوراً حل کیا جانا چاہیے۔ گورنر جنرل ہندوستان کو گورنر جنرل پاکستان کے ساتھ ملاقات کے دوران اس مسئلے کی نزاکت سے مکمل طور پر آگاہ کر دیا گیا تھا۔“

”حکومت پاکستان کا پختہ یقین ہے کہ اس مسئلے کا واحد حل جس سے مزید خون خرابے کو روکا جاسکے، جموں و کشمیر میں دوبارہ امن بحال کیا جاسکے اور ریاستی عوام کا آزادانہ فیصلہ حاصل کر کے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو بحال کیا جاسکے۔ صرف وہی ہے جو گورنر جنرل پاکستان تجویز کر چکے ہیں۔ (اس لئے) فوری کارروائی ضروری ہے۔ گزرنے والا ہر دن صورتحال کو خطرناک حد تک سنگین بنا رہا ہے۔ میں ایک بار پھر آپ پر زور دیتا ہوں کہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر خود کارروائی کی جاتے ورنہ اس کے نتائج کنٹرول سے باہر اور انتہائی تباہ کن ہوں گے اور اس کے نتائج نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا پر اثر انداز ہوں گے۔“ (ایضاً: صفحہ ۹۱ - ۹۲)

۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو وزیراعظم پاکستان نے ایک اور تار ہندوستانی وزیراعظم کے نام روانہ کیا۔  
 ”اگر میں سفر کرنے کے قابل ہوتا تو میں ضرور دہلی چلا آتا مگر بد قسمتی سے میں ابھی تک صاحبِ فراش ہوں۔ چنانچہ میں آپ کو مستقبل قریب میں لاہور آنے کی دعوت دیتا ہوں کسی ایسی تاریخ پر جو آپ کے لئے موزوں ہو تاکہ باقی ماندہ سوالات پر بات چیت کی جاسکے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس دعوت کو قبول کریں گے۔“ (ایضاً: صفحہ ۹۳)

ہندوستانی وزیراعظم نے جواب دیا کہ آئندہ چند روز کے دوران وہ بے حد مصروف ہوں گے اور (دور سے کی) دعوت قبول نہیں کر سکیں گے۔

ان حالات میں ہندوستان اس مسئلے کو یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں لے گیا۔ سلامتی کونسل میں مسئلے پر بحث جنوری کے وسط میں شروع ہوئی اور ۱۱ فروری تک جاری



رہی۔ اس دوران سلامتی کونسل نے ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کے تفصیلی موقوفہ کو سننا۔  
مستے کے تمام پہلوؤں پر بحث ہوئی

سلامتی کونسل کے صدر نے فریقین کے نمائندوں کی بحث سے تفصیلی معلومات اور کسی حد تک  
رسنائی حاصل کی جو اس کے ساتھ ملاقات کے دوران تنازعہ کے دونوں فریق ملکوں کے وفد نے  
اسے ہم پہنچائی۔ سلامتی کونسل کا صدر ایک قرار داد پر دو ٹوک کرانے ہی والا تھا جس کا مسودہ صدر  
کی جانب سے دونوں متحارب ملکوں کے نمائندوں کو ۶ فروری کو بھجوا یا جا چکا تھا کہ سلامتی کونسل  
میں خود فکر کے اس مرحلے پر معاملے کو دوسروں کے ساتھ ساتھ برطانیہ، کولمبیا اور بلجیم کے نمائندوں کی آراء  
کے ساتھ سمیٹ لیا گیا جو ۶ فروری کی تجاویز میں سر فہرست تھے جن سے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں  
کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ آراء ملاحظہ ہوں:

مسٹر ٹول بیکر (برطانیہ): ”مجھے بے حد خوشی ہے کہ اس بحث میں اب ہم سمجھوتے کے مرحلے  
میں داخل ہو رہے ہیں جو کہ ہمیں امید ہے کہ کشمیر کے سوال پر طے پا جاتے گا۔ میں ان مقررین کی  
تقریروں کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں جو وہ مجھ سے پہلے کر چکے ہیں اور ہندوستان اور پاکستان کے  
مقررین کے لئے بھی جن کی تقریروں سے بحث کا آغاز ہوا۔۔۔

”میں سمجھتا ہوں کہ سلامتی کونسل میں کشمیر کا سوال حل ہونے تک چلے اور دوسرے واقعات  
ہوتے رہیں گے یہاں بہت سے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اور میں نے فریقین کے بیانات  
بھی سنے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں مجھے آزادانہ رپورٹیں بھی موصول ہوتی ہیں جو کچھ ہوا  
میں اس کی وضاحت بھی کر سکتا ہوں۔۔۔ یہ وضاحت ظاہر کرے گی کہ درحقیقت یہ واقعات  
بے پناہ خوف کی وجہ سے ہو رہے ہیں اور جب تک پنجاب اور کشمیر کے علاقوں میں لوگوں کے  
ذہنوں پر خوف مستطرب ہے گا اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہیں گے اور صورتحال انتہائی سنگین  
رہے گی۔

”ہم سوال کے بنیادی حصے پر بحث شروع کر رہے ہیں کہ ہم جنگ کو کس طرح روک سکتے ہیں۔  
مجھے امید ہے کہ ہم اس وقت تک اس موضوع پر بحث کرتے رہیں گے جب تک ہم ایسی سکیم نہ تیار  
کر لیں جو کارگر ثابت ہو۔ مجھے اس نقطہ منظر سے بہت گہری ہمدردی ہے جس کے ساتھ ہندوستانی



مندوب نے (بحث کا) آغاز کیا ہے۔۔۔ تاہم ہمیں جنگ بند کرانی چاہیے اور ہمیں اسے فوراً روکنا ہے۔

☆☆☆

”ہندوستانی مندوب نے ۲۶ جنوری کے ٹائمز آف لندن میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا حوالہ دیا۔ یہ نہایت قابل ذکر مضمون ہے۔۔۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کیا کہتا ہے؟ یہ کہتا ہے کہ جب تک سلامتی کونسل مسئلہ کشمیر کے کسی حل پر نہ پہنچ جائے جو سب کو قریب نظر آ رہا ہے (تب تک) ہم نہ صرف جنگ نہیں روکیں گے بلکہ اس سے بھی کہیں بدتر نتائج کو ہوا دیں گے جو اس وقت موجود ہے کیونکہ ہم اس میں تباہیوں کا ایک نیا سیلاب بہا کر لاسکتے ہیں۔“ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہندوستانی مندوب یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہے کہ سمجھوتے کے لئے پاکستان کو اس معاملے میں سخت کارروائی کرنی چاہیے۔ اور یہ کہ سلامتی کونسل کو ہندوستان کے تعاون سے پاکستان کے لئے ایسا کرنا ممکن بنانا چاہیے۔ ہم اب حقیقت میں مکمل جنگ بندی چاہتے ہیں۔ مزید خون خرابے کے بغیر اور تخریب کاروں کی مزید ہلاکت کے بغیر۔ کیونکہ انہی لوگوں کے ووٹ بالآخر ہم راتے شماری میں حاصل کرنا چاہیں گے۔ جیسا کہ ابھی ہندوستانی مندوب نے کہا ہمارا مطیع نظر ایک ذمہ دار حکومت کا قیام ہے۔ ہمیں اس قسم کی سکیم کی ضرورت ہے مگر سوال یہ ہے کہ اسے کس طرح تیار کیا جائے۔

☆☆☆

”سلامتی کونسل کے ارکان پہلے ہی کئی تجاویز تیار کر چکے ہیں کہ اس مسئلے کے حل کے لئے کیا کیا جانا چاہیے۔ ہم نے اس مہربان شہر میں فراغت کے اوقات اپنی اب تک کی تمام تر بحثوں کے لفظ بہ لفظ ریکارڈ کے مطالعہ میں گزارے ہیں۔ ۲۳۵ ویں اجلاس منعقدہ ۲۴ جنوری کے لفظ بہ لفظ ریکارڈ میں ہمیں وہ تجاویز نظر آئیں جن کا تعلق راتے شماری کی شرائط سے ہے۔ راتے شماری سلامتی کونسل کے زیر انتظام اور زیر اختیار منعقد کرانے کی تجویز دی گئی ہے۔ ایسی تجاویز بھی ہیں کہ ایک عبوری انتظامیہ تشکیل دی جائے جو تقصیب سے پاک ہو اور موجودہ جنگ میں بھی ملوث نہ ہو اور وہ اس قدر غیر جانبدار ہو جس قدر ہندوستان اور ہندوستان جیسے عظیم ممالک







ہم ایسے مستحکم حالات پیدا کر سکتے ہیں جن سے آنے والے برسوں میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان قیام امن کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ یہ ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم ایک ایسے تنازعہ سے بچ سکتے ہیں جو چالیس کروڑ عوام کو اپنی پیٹ میں لے لے گا۔

”راتے شماری سے ہر شخص میں اعتماد پیدا ہوگا بشمول ان لوگوں کے جو اس وقت برسہا برس ہیں۔ ہم سب اس کا پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔ ۲۲۹ ویں اجلاس کے دوران ہندوستانی مندوب پرسوں کہہ چکے ہیں کہ مسئلہ کشمیر میں دلچسپی رکھنے والے دو فریق پاکستان اور کشمیر میں سرگرم عمل باغی اور تحریک کار ہیں چنانچہ ہمیں ان دو فریقوں کو مطمئن کرنا ہے۔ سلامتی کونسل جو کچھ بھی کرے وہ ان دونوں فریقوں کے لئے منصفانہ ہونا چاہیئے۔“

”یہ حکومت پاکستان، باغیوں، قبائلیوں، حکومت ہندوستان اور جموں و کشمیر کے باشندوں کے علاوہ بیرونی دنیا کے لئے بھی منصفانہ ہونا چاہیئے۔۔۔۔“

مجھے امید ہے کہ ہم سلامتی کونسل کے ارکان کی جانب سے پیش کی جانے والی ٹھوس تجاویز پر غور کر کے اس قتل عام کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ قبائلیوں اور دوسرے مداخلت کاروں کو کشمیر سے باہر نکالا جاسکے۔ اور قانون کی بالادستی بحال کرنے کے بعد اسے برقرار بھی رکھا جاسکے۔ راتے شماری کا انتظام کیا جاسکے اور غیر جانبدار اور ویانٹا راجپوری انتظامیہ کے ذریعے اس کو مناسب انتظامات کے تحت منعقد کروایا جاسکے۔“



سٹروان لانگن ہوف (بلجیم) (فرانسیسی سے ترجمہ) :-  
”میں اس بحث کی جانب توجہ دلانا چاہوں گا کہ اس بحث کے دوران مجھے جن دو قراردادوں کے مسودے پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا ان میں سے کسی سے بھی اصولاً اختلاف نہیں کیا گیا۔۔۔۔“

”فریقین جموں اور کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا تنازعہ سلامتی کونسل میں لاتے ہیں۔ ان کی راتے میں مسئلہ ایک غیر جانبدارانہ راتے شماری کے ذریعے طے کیا جانا چاہیئے اور انہیں توقع ہے کہ سلامتی کونسل اس مقصد کے لئے مداخلت کرے گی۔“



”میرے خیال میں کونسل اس راتے کے اظہار میں حق بجانب ہے جو کہ بحث کے دوران دیتے گئے متعدد بیانات سے ظاہر ہوتی ہے کہ سلامتی کونسل کے زیر انتظام راتے شماری کا انعقاد ضروری ہے تاکہ یہ یقین پیدا اور بختم کیا جاسکے کہ راتے شماری جموں اور کشمیر کے لوگوں کی رضا کو ظاہر کرے گی۔ اور یہ کہ ایسا یقین جموں اور کشمیر میں گھس آنے والی طاقتوں کو دہاں سے نکالنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اور اس سے مقامی آبادی کو تشدد اور باہمی دشمنی سے روکا جاسکے گا۔ اور آخر میں یہ کہ اس سے متعلق حکومتوں کو اس مقصد کے لئے تعاون کرنا چاہیے۔“

”یہ راتے جس کام میں نے ابھی اظہار کیا ہے اور جو میرے خیال میں کونسل کے ارکان کی اکثریت کی راتے ہے جو میں نے بطیم کے نمائندے کی حیثیت سے بحث کو آگے بڑھانے کی غرض سے قرار داد کی صورت میں اس وقت پیش کی ہے۔ یہ قرار دادیں حرف آخر نہیں ہیں بلکہ ابھی ابھی کی جانے والی بحث کی روشنی میں انہیں قابل قبول بنایا جاسکتا ہے۔“

”ہوسکتا ہے کہ انہوں نے جس راتے کا اظہار کیا ہے وہ غیر جانبدار ہو۔ اس سے ہم آہنگی پیدا کرنے اور فریقین کے درمیان اعتماد اور تعاون پیدا کرنے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا محرک ارکان کونسل کے درمیان ہندوستان اور پاکستان کے لئے دوستی کے مشترک جذبات کی موجودگی ہے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ ان دونوں ملکوں کے نمائندے اس کا بخوبی احساس رکھتے ہیں۔ یہ مساوی دوستی ہی ہے جس کے تحت کونسل اس معاملے پر ایسی فضا میں غور کر رہی ہے جو ہماری اب تک کی کارروائی کے دوران مفقود تھی۔“

ہندوستان کی جانب سے التوا کی درخواست کونسل کے لئے انتہائی حیران کن تھی مگر وہ اس معاملے میں بے بس تھی چنانچہ کچھ بحث کے بعد معاملے پر مزید غور ملوث کر دیا گیا۔

بھارتی وفد واپس چلا گیا۔

اس مرحلے تک روس اور یوکرین کے نمائندوں نے سلامتی کونسل کی بحثوں میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ بلکہ جب بھی اس معاملے پر دو ٹونگ ہوتی تو یہ لوگ غیر حاضر رہے۔

”تاہم ہندوستانی حکومت کو سلامتی کونسل میں اپنی اپیل کے بارے میں رد عمل سے شدید مایوسی ہوئی جو اس نے جارحیت کا شکار بناتے جانے کی بنیاد پر بغیر سوچے سمجھے اس امید پر کی تھی کہ کونسل



فوراً اس کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس کے خاتمہ دلوں میں سے کوئی بھی پاکستانی مندوب سر محمد ظفر اللہ خان کی ٹکر کا نہ تھا۔ چنانچہ جب سلامتی کونسل میں پاکستان کی اس تجویز کی حمایت کرنے کے آثار ظاہر ہوتے کہ کشمیر میں غیر جانبدار انتظامیہ قائم کی جائے تو پنڈت نہرو نے لارڈ داؤنٹ بیٹن سے کہا کہ انہیں اقوام متحدہ میں جانے کے اپنے فیصلے پر شدید پشیمانی ہوتی ہے۔

(بحوالہ: دی گریٹ ڈیوائسڈ: صفحہ ۴۶۹)

لارڈ داؤنٹ بیٹن نے برطانوی وزیر خارجہ کے نام اپنی رپورٹ میں لکھا:۔  
 ”پنڈت نہرو نے کہا کہ انہیں یہ جان کر صدمہ ہوا ہے کہ اقوام متحدہ پر اخلاقیات کی بجائے طاقت کی سیاست کا غلبہ ہے اور انہیں یقین ہے کہ اقوام متحدہ کو امریکی چلا رہے ہیں۔ اور یہ کہ امریکی مندوب سینیٹر وارن اسٹن نے پاکستان کی حمایت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اُن (پنڈت نہرو) کے خیال میں اقوام متحدہ اس کیس میں میرٹ کی بجائے محض ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کی حمایت کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے خیال میں دولت مشترکہ تعلقات کے وزیر خارجہ مسٹر ٹوئل بیکر اور برطانوی وفد کے سربراہ بھی ہندوستان کے ہی مخالف تھے جتنے کہ خود امریکی مندوب سینیٹر وارن اسٹن سوائے اس کے کہ اول الذکر زیادہ شائستہ تھے اور ان کی گفتگو زیادہ محتاط زبان میں ہوتی تھی....

”فردی کے نصفِ اول میں میں نے پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو یہ باور کرانے کی بار بار کوششیں کیں کہ کشمیر کے مسئلے پر سلامتی کونسل کے ارکان کی اکثریت کے رویے پر اخلاقیات کی بجائے طاقت کی سیاست کا غلبہ ہونے کا خیال درست نہیں تھا۔ مگر میں ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ خیال فردی کے نصفِ اول کے دوران پھیلا اور اس کی بنیاد اس مفروضے پر قائم کی گئی تھی کہ برطانیہ مشرق وسطیٰ میں مسلم استحکام کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا اور امریکہ فلسطین کی تقسیم کی وکالت کرنے کے بعد عربوں میں اپنی پوزیشن بحال کرنے کا خواہاں تھا۔

”اقوام متحدہ میں حالات و واقعات کی اس توضیح پر مشر اور برطانیہ میں ملکِ معظم کی حکومت کے لئے تلخ جذبات تھے اور نیویارک میں برطانوی وفد کے بارے میں شدید شکوک و شبہات پاتے جاتے تھے۔ مسٹر ٹوئل بیکر خاص طور پر ”مشکوٰۃ“ ہو کر رہ گئے تھے....



”اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں اس تاثر نے جو پکڑا شروع کر دی کہ سلامتی کونسل میں صرف دو ارکان ہی ایسے تھے جنہیں ہندوستانی پوزیشن سے بھر دی ہو سکتی تھی اور وہ تھے روس اور یوکرین...“ (بحوالہ: دی گریٹ ڈیوائسڈ صفحہ ۴۶۹ - ۴۷۰)

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن اب دہری سفارتی کوشش میں مصروف ہو چکا تھا جو اس نے اپنی معمول کی توانائی اور مہارت کے ساتھ کئی ہفتوں تک جاری رکھی۔ ایک طرف وہ برطانوی طرز عمل کا جائزہ لے رہا تھا تا کہ ہندوستان کے موقف کو کم از کم ظاہری حد تک ان کے رویوں سے اور ایک سکیس میں سٹرٹون کی طرح جو کہہ دیا تھا اس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ مضبوط تسلیم کیا جاتے۔ اور دوسری طرف پنڈت نہرو کو اس بات پر متاثر کیا جاتے کہ برطانوی پالیسی ہندوستان مخالف نہیں ہے اور یہ کہ سلامتی کونسل میں برطانوی مندوبین کی بحثوں میں محض نقص اور طاقت کی سیاست ہی نہیں بلکہ کچھ معقولیت بھی شامل تھی۔ وہ دونوں پہلوؤں پر بس ایک حد تک ہی کامیاب ہوا۔ تاہم وہ اپنے وزیراعظم کو ہندوستانی وفد کو ایک سکیس سے واپس نہ بلانے پر رضامند کرنے اور اقوام متحدہ کی قرارداد کو کیسٹر ستر ذکر دینے سے باز رکھنے میں کامیاب رہا۔“ (بحوالہ: دی گریٹ ڈیوائسڈ صفحہ ۴۷۰ - ۴۷۱)

ہندوستان کی درخواست پر سلامتی کونسل میں بحث کا التوا پاکستانی وفد کے لئے پریشان کن تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ التوا کتنا طویل ہو سکتا ہے۔ کیا پاکستانی وفد کو نیویارک ہی میں ہندوستانی وفد کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے یا اسے بھی کراچی واپس آجانا چاہیے۔ مؤخر الذکر صورت میں ہندوستانی وفد نیویارک سے اپنی غیرحاضری کو طویل دے سکتا تھا جس سے ایک تاثر یہ ملتا کہ اسے سلامتی کونسل میں مستے پر بحث کو آگے بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسری طرف نیویارک میں بیٹھ کر ہندوستانی وفد کا انتظار کرنا اور اس کی خوشنودی کے لئے منظر رہنا بھی مضحکہ خیز تھا۔ پاکستانی کابینہ کے سیکرٹری جنرل سٹر محمد علی نے جونہی بارک میں وزیر خارجہ کی مدد کر رہے تھے مشورہ دیا کہ وزیر خارجہ کو لندن چلنا پڑے کیونکہ اب گفتگو کا مرکز یقیناً لندن بنے گا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سٹر نہرو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مدد سے اب برطانوی وزیراعظم ایٹلی کی طرف سے کھینچنے میں مصروف ہوں گے تا کہ برطانیہ سلامتی کونسل میں اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کرے وزیر خارجہ



نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور یہ دونوں حضرات لندن پرواز کر گئے جہاں وزیر خارجہ نے برطانوی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ مسٹر اسٹراٹھم سے ملاقات کی۔ مؤخر الذکر نے ان سے کہا میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمیں اب سلامتی کونسل میں زیر غور تجاویز پر اپنی (برطانوی) حمایت جاری رکھنی چاہیے۔ مگر ہندوستان کے معاملات پر کمرپس وزیر اعظم کو مشورہ دینا رہا ہے اور اس کی وزیر اعظم کے ساتھ ملاقات بھی رہی ہے۔ میرا خیال ہے آپ آج بعد دوپہر وزیر اعظم سے مل رہے ہیں۔ میں صرف آپ کی خوش قسمتی کے لئے دعا کر سکتا ہوں۔ وزیر خارجہ نے مسٹر محمد علی سے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ نے اپنی پالیسی میں تبدیلی کر لی ہے۔

بعد دوپہر پاکستانی وزیر خارجہ کی برطانوی وزیر اعظم سے ملاقات ہوتی اور ان کے شبہ کی تصدیق ہو گئی۔ مسٹر اسٹراٹھم نے سے پہلو تہی کرتے رہے اور انہوں نے کئی ایسے اسکانات اور ترامیم کا ذکر کیا جن کے ذریعے ہندوستان کو سلامتی کونسل میں زیر غور تجاویز کے ساتھ اتفاق کرنے کے لئے آمادہ کیا جاسکتا تھا۔ ان میں سے چند ایک مارچ میں ہندوستانی وفد کی نیویارک واپسی پر ترمیم شدہ تجاویز میں شامل بھی کر دی گئیں جنہیں ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے طور پر منظور کر لیا گیا۔ مسٹر فلپ نوٹی بیکر ان ترامیم سے خوش نہیں تھا اور اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر وزیر اعظم سے بھی یہ بات کہہ دی چنانچہ سلامتی کونسل میں بحث ختم ہوتے ہی اُسے مسٹر پی آف کاسن وولیتھ ریشیئر سے ایندھن اور بجلی کی وزارت میں منتقل کر دیا گیا اور بعد ازاں کابینہ سے ہی الگ کر دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کے مقتولین کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوا جو آج بھی اختتام کو نہیں پہنچی۔

اس طرح کی جانے والی ترامیم کے باوجود ہندوستان قرارداد سے پوری طرح خوش نہیں تھا۔ اس نے اسے قبول نہیں کیا مگر اجنٹن (پاکستان کا نامزد) بلجیم، کولمبیا، چیکوسلوواکیہ (ہندوستان کا نامزد) اور امریکہ کے مندوبین پر مشتمل اقوام متحدہ کے وفد برائے پاک و ہند کی آمد کو قبول کر لیا۔ کمیشن میں شامل ممالک کی جانب سے اپنے اپنے نمائندوں کی نامزدگی کے بعد جنیوا میں کمیشن کا اجلاس ہوا اور اس نے کمیشن کی ضخیم دستاویزات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کمیشن نولائی کے دوسرے ہفتے میں برصغیر پاک و ہند پہنچا۔

اس اثنا میں کشمیر کی صورتحال میں بعض تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ سلامتی کونسل میں کی جانے والی



بحرل میں ہندوستان کا موقف یہ تھا کہ کونسل پاکستان کو قبائلیوں کو امداد اور سہولیات پہنچانے سے منع کرے جو لشکر کی صورت میں کشمیر میں جنگ کی غرض سے گھس آتے تھے اور انہیں واپس چلے جانے پر آمادہ کرے جس کے بعد ہندوستان کشمیر کے لوگوں سے الحاق کے مسئلے پر ان کی خواہشات جاننے کے لئے مناسب اقدامات کرے گا۔ سلامتی کونسل نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

سلامتی کونسل کے رویے کے رد عمل کے طور پر ہندوستان نے مسئلہ کشمیر کو فوجی ذرائع سے حل کرنے کی کوشش کی اور بھرپور حملے کی تیاریاں کر لی گئیں۔ پاکستانی کمانڈر انچیف جنرل ڈکس گریسی نے وزیراعظم کو (جو وزیر دفاع بھی تھے) اپریل کے اواخر میں صورتحال کا جائزہ پیش کیا جس کے مطابق ہندوستانی تیاریوں کا مقصد آزاد کشمیر کے علاقے میں پیش قدمی کرنا تھا جس کے باعث اہر جہم ہیڈ ورکس سسٹم اور پاکستانی کے سرحدی علاقوں کو خطرہ لاحق تھا۔ انہوں نے زور دیا کہ پاکستان آرمی کے لینٹوں کو اس علاقے میں تعینات کیا جانا چاہیے تاکہ متوقع حملے کی صورت میں بارڈر لائن کا دفاع کیا جاسکے۔ یہ سٹی کے اوائل میں کر لیا گیا جب اقوام متحدہ کمیشن برائے پاک و ہند کراچی پہنچا تو اسے فوری طور پر اس صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔

کمیشن مٹے کے مختلف پہلوؤں کے گہرے مطالعے میں مصروف ہو گیا اور اس نے کراچی اور دہلی میں دونوں حکومتوں کے نمائندوں سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ بالآخر اس نے ۱۳ اگست کو دونوں حکومتوں کو ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس کا مقصد ریاست کو فوجوں سے خالی کرنا تھا۔ کمیشن کے چیئرمین چیکو سلواکیہ کے ڈاکٹر جوزف کو ربل نے مسودہ کے مختلف پر اگر افوں کے متعلق وضاحتیں کیں۔ حکومت پاکستان نے زور دیا کہ قرارداد کے مسودہ میں راتے شماری کرانے کے لئے ایک خاکہ شامل ہونا چاہیے تاکہ اسے یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ کیا یہ مسودہ قرارداد اطمینان بخش ہے۔ چنانچہ چار ماہ سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد کمیشن نے دونوں حکومتوں کو دوسرا پیلیٹری مسودہ قرارداد پیش کیا جس میں راتے شماری کرانے کا فریم ورک بھی شامل تھا۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں دونوں حکومتوں نے دونوں قراردادوں کی منظوری دے دی۔ اس پر کمیشن نے دونوں حکومتوں پر کشمیر میں جنگ بندی کے لئے زور دیا جس کے نتیجے میں دونوں



ملک ۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء سے جنگ بندی پر متفق ہو گئے۔ دوسرے مسودہ قرارداد کو باضابطہ طور پر ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرارداد کہا گیا۔ اس کے بعد کمیشن جنگ بندی لائن کے عملی تقین کے لئے موقع پر گیا جو فریقین کی باہمی رضامندی سے طے کر لی گئی۔

۱۳ اگست کی قرارداد کے حصہ سوم کے تحت کونسل کو حصہ دوم میں مذکورہ فریم ورک کے مطابق فوجوں کے انخلاء کی سکیم مرتب کرنا تھی۔ چنانچہ فریقین سے کہا گیا کہ وہ اس مقصد کے لئے اپنی اپنی تجاویز پیش کریں۔ اس مرحلے تک قبائلی کشمیر سے نکل چکے تھے اور کونسل اس معاملے میں مطمئن ہو چکی تھی۔ انخلاء کی سکیم کے مطابق کمیشن کے نوٹیفکیشن کے فوراً بعد پاکستان کو اپنی فوجیں واپس لے جانے کا انتظام کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کو اپنی فوجیں ریاست سے ہٹانے کا کام شروع کرنا تھا۔ دونوں ملکوں کو اپنی اپنی فوجیں یکساں رفتار سے ریاست سے نکالنا تھیں تاکہ کسی ایک فریق کو نقصان کا اندیشہ نہ رہتا یہاں تک کہ آزاد کشمیر اور دوسری جانب ہندوستانی مقبوضہ کشمیر سے دونوں ملکوں کی افواج مکمل طور پر واپس چلی جاتیں۔ فریقین کے فوجی نمائندوں نے کمیشن کو اپنی اپنی تجاویز پیش کر دیں۔ ہندوستان نے شرط لگا دی کہ اس کی تجویز سے نہ صرف پاکستان بلکہ سلامتی کونسل کو بھی اس وقت تک باخبر نہ کیا جاتے جب تک کہ کوئی سمجھوتہ نہ ہو جاتے۔ ہندوستان کی تجاویز کے مطالعہ کے بعد کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ اُس نے قرارداد کے فریم ورک کے اندر رہ کر تجاویز پیش نہیں کی تھیں۔ چنانچہ سلامتی کونسل کے نام اپنی رپورٹ میں کمیشن نے لکھا کہ اُس کے خیال میں ہندوستانی تجاویز معیار اور ضخامت ہر دو لحاظ سے قرارداد کی شرائط کو پورا نہیں کرتیں۔ اس کے نتیجے میں قرارداد پر مزید عملدرآمد معطل ہو گیا۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا کہ اُس نے محسوس کیا ہے کہ اس مسئلے میں اُس کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور یہ کہ مزید مراحل طے کرنے کے لئے اقوام متحدہ کا ایک نمائندہ مقرر کر دیا جاتے۔ سلامتی کونسل نے کمیشن کی رپورٹ پر غور کیا، کمیشن کی کوششوں اور کامیابیوں کا جائزہ لیا اور آسٹریلوی ہائی کورٹ کے جج سراوون ڈکسن کو امور کشمیر پر اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کر دیا۔ سراوون بڑے صغیر آئے اور کراچی اور دہلی میں دونوں حکومتوں کے ساتھ گفت و شنید کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستانی وزیراعظم ایسی شرائط پر اتفاق کرنے کو تیار نہ تھے جن



کے نتیجے میں کشمیر میں صحیح اور غیر جانبدارانہ راستے شماری ہو سکے۔

یہ رپورٹ موصول ہونے کے بعد سلامتی کونسل نے فریقین کا موقف سنا اور ایک سابق امریکی سینیٹر ڈاکٹر فرینک پی گراہم کو کشمیر کے لئے اقوام متحدہ کا نائبہ مقرر کیا گیا۔ اس اثناء میں سلامتی کونسل نے فریقین کی رضامندی سے امریکی بحریہ کے ایک فلیٹ ایڈمرل جسٹرو بلینوینٹسز کو کشمیر میں راستے شماری کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔

ڈاکٹر گراہم نے کشمیر سے فوجوں کی واپسی کے لئے دونوں فریقوں کے درمیان سمجھوتے کی متعدد کوششیں کیں۔ ہر بار مجوزہ تجاویز پر فریقین کے خیالات کا تعین کر سنے کے بعد انہوں نے اس کی رپورٹ سلامتی کونسل کو پیش کی جس میں یہ بتایا کہ فریقین کے درمیان کس حد تک اختلافات موجود ہیں۔ عموماً یہ ہوتا رہا کہ ڈاکٹر گراہم کی تجاویز سے مکمل طور پر مطمئن نہ ہونے کے باوجود پاکستان رضامندی کا اظہار کر دیتا مگر ہندوستان اسے مسترد کر دیتا۔ ہر دفعہ ڈاکٹر گراہم سلامتی کونسل کو رپورٹ پیش کرتے جو فریقین کا موقف سن کر ڈاکٹر گراہم کی کوششوں کے لئے شکریہ ادا کرتی اور انہیں اپنا کام جاری رکھنے کے لئے کہا جاتا۔ اس طرح ڈاکٹر گراہم کی پانچ رپورٹیں منادی گئیں۔ مگر اس کی چھٹی اور آخری رپورٹ پر سلامتی کونسل میں بحث تک نہ کی گئی۔ اس اثناء میں ایڈمرل نیمٹسز راستے شماری ایڈمنسٹریٹر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور کچھ عرصے بعد ڈاکٹر گراہم کا انتقال ہو گیا۔ کشمیر کیس میں جان گنوا نے والوں کی تعداد میں مزید دو کا اضافہ ہو گیا۔

ڈاکٹر گراہم کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کی بھاری تعداد کا تعین کیونکر کیا جاتے۔ جنہیں ہندوستان ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی اقوام متحدہ کی قرارداد کے ذریعے قائم ہونے والے پاک و ہند کمیشن کے تحت واپس لے جانے کا پابند تھا۔ پاکستانی وزیر خارجہ نے ہندوستان کی گریز پالیسی سے تنگ آکر سلامتی کونسل کو اس کا ایک حل تجویز کیا تھا۔ ہندوستان نے کمیشن کو کشمیر سے اپنی فوجوں کی بڑی تعداد نکال لینے سے متعلق ایک سکیم پیش کی تھی مگر اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ پاکستانی وزیر خارجہ نے کہا کہ اس کی حکومت اس مسئلے کے حل کے لئے ایک اور کوشش کر دیکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کو کشمیر میں اپنی فوجوں کی بڑی تعداد



رکھنے کی اجازت دے دی جاتے جس کا ذکر اس نے کشن کے رُو برد کیا ہے مگر وہ اس کا سنتا کم حصہ واپس لے جاتے۔ ہندوستان نے ایسا کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

۱۹۵۰ء میں ہندوستان نے کشمیر میں ایک آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ پاکستان نے یہ معاملہ سلامتی کونسل میں اٹھایا کیونکہ ایسا کرنے سے دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ راتے شماری کرانے میں رخنہ پڑ سکتا تھا۔ اس کے جواب میں اقوام متحدہ میں ہندوستانی مندوب سر بی۔ این رادھ نے (جو بعد میں بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج ہوئے) ہندوستان کی جانب سے سلامتی کونسل میں حسب ذیل بیان دیا۔

”حسب روایت بھارتی آئین میں آئین ساز اسمبلی کی تشکیل رکھی گئی ہے تاکہ کشمیر کے آئین کے سوال پر تفصیلات طے کر لی جاتیں کیا یہ اسمبلی الحاق کے سوال پر فیصلہ کرے گی؟ میری حکومت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی اگر چاہے تو اس مسئلے پر اپنی راتے کا اظہار کر سکتی ہے مگر یہ اس پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔“

(حوالہ، یو این سیکوریٹی کونسل، آفیشل ریکارڈ، چھٹا سال ۵۳۶ واں اجلاس مورخہ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء) اور ایک بار پھر:-

”سلامتی کونسل کے کچھ ارکان نے اس غرضے کا اظہار کیا کہ کشمیر کی آئین ساز اسمبلی اپنے کام کے دوران الحاق کے سوال پر بھی اظہار راتے کر سکتی ہے۔ اگر آئین ساز اسمبلی اس سوال پر اظہار راتے کا فیصلہ کرے تو اسے ایسا کرنے سے عطا روکا نہیں جاسکتا۔ مگر اس کی پابندی کرنا میری حکومت پر لازمی نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے سلامتی کونسل کی پوزیشن میں فرق آتے گا۔ میں حکومت ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس کونسل کے سامنے پہلے ہی یہ کہہ چکا ہوں اور میں سوائے اظہار افہوس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرے وہ بیانات جو میں نے اپنی حکومت کے اہلکار پر دیئے ہیں کہ مشترک مسودہ قرارداد کے ابتدائیہ میں موجود آئین ساز اسمبلی کے حوالہ جات کو نظر ثانی شدہ مسودہ میں برقرار رکھا جانا چاہیے۔“

(ایضاً ۵۳۸ واں اجلاس ۲۹ مارچ ۱۹۵۱ء)

کشمیر میں آئین ساز اسمبلی قائم کی گئی جس نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور



کر لی۔ اس کے بعد اس قسم کے بیان دینا ہندوستان کا معمول بن گیا کہ یہ قرارداد الحاق کے سوال پر ریاست کے عوام کے فیصلے کی ترجمان ہے۔

رفتمہ رفتہ سلامتی کو نسل میں ہندوستانی مندوبین نے جن کے رہنما مسٹر کرشنا مینن (ہندوستانی وزیر دفاع) تھے اپنے وعدوں سے انحراف کی پالیسی اختیار کر لی۔ انہوں نے سلامتی کو نسل کی حیثیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور انہیں اس کی قراردادوں کی خلاف ورزی میں بظاہر کوئی نقصان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک موقع پر تو مسٹر کرشنا مینن نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہاں تک کہہ گئے کہ ہندوستانی وزیر اعظم نے کشمیر کے مسئلے میں راتے شماری کی اصطلاح سرے سے کبھی استعمال ہی نہیں کی۔ اس کے برعکس پاکستانی مندوب نے متغدد ایسی مثالیں دیکھا کر ڈس سے پیش کیں۔ ان کے جواب میں مسٹر کرشنا مینن اپنے بیان کو محض مزید اصرار کے ساتھ بار بار دہراتے رہے۔ مسٹر کرشنا مینن نے بتدریج یہ دعویٰ کرنا بھی شروع کر دیا کہ وقت گزر جانے کے باعث اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پاک و ہند کے چارٹر کی پابندی ہندوستان پر لازم نہیں رہی کیونکہ بقول ان کے کمیشن کی قراردادوں پر عمل درآمد میں تاخیر کا باعث بھی پاکستان تھا۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ دوم کی رو سے پہلے پاکستان کو اپنی فوجیں کشمیر سے نکالنا تھیں جس کے بعد ہی ہندوستان کو فوجوں کے انخلاء کے لئے کہا جاسکتا تھا یہاں یہ بات نوٹ کر نا اہم ہو گا کہ کمیشن کی قراردادوں پر اختلافات رونما ہوتے ہی امر کی صدر ٹرومین اور برطانوی وزیر اعظم ایٹلی نے ایک مشترکہ تار کے ذریعے دونوں حکومتوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اختلافات کے حل کے لئے بین الاقوامی ثالثوں سے مدد لیں۔ پاکستان نے اس پر رضامندی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ مگر ہندوستان نے یہ کہہ کر اس مشورے کو مسترد کر دیا کہ ایسا کرنے سے اس کی خود مختاری مجروح ہوتی ہے۔ حالانکہ ایسا کرنا بھارتی آئین کی ریاستی پالیسی سے متعلق دفعہ ۱۵ (ڈی) کے عین مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان بین الاقوامی تنازعات کو "ثالثی کے ذریعے حل کرنے کی حوصلہ افزائی کرے گا۔"

تین مختلف مواقع پر پاکستان نے پیشکش کی کہ فریقین کو تمام متعلقہ امور کا جائزہ لینے کے بعد بین الاقوامی عدالت انصاف سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ دونوں ملکوں کے لئے اُن



کے فرائض متعین کر دیں اور یہ کہ فریقین کو اس دوران اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہیے۔ ہر مرتبہ ہندوستان نے انکار کر دیا۔

یہ تنازعہ دونوں حکومتوں کے درمیان مسلسل کشیدگی کا باعث ہے جس کی وجہ سے تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ یہ علاقائی بلکہ بین الاقوامی امن کے لئے خطرہ ہے۔ دانشمندی اور برصغیر کے عوام کی فلاح کا تقاضا ہے کہ فریقین کسی ایسے طریق کار پر متفق ہو جائیں جو صحیح اور منصفانہ ہو اور ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے قابل قبول ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی طور پر ریاست کے باشندوں کے لئے بھی قابل قبول ہو۔

اگر یہ دھماکہ خیز مسئلہ اطمینان بخش طریقے سے حل ہو جائے تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تمام مسائل جن میں سے کچھ واقعی پیچیدہ اور مشکل ہیں انہیں عمومی سفارتی ذرائع سے حل کیا جاسکتا ہے۔







مصطفیٰ سعودی فرمانروا  
شاہ سعود کے ساتھ



اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری مسٹر ڈاکٹر شولڈ اور مصطفیٰ

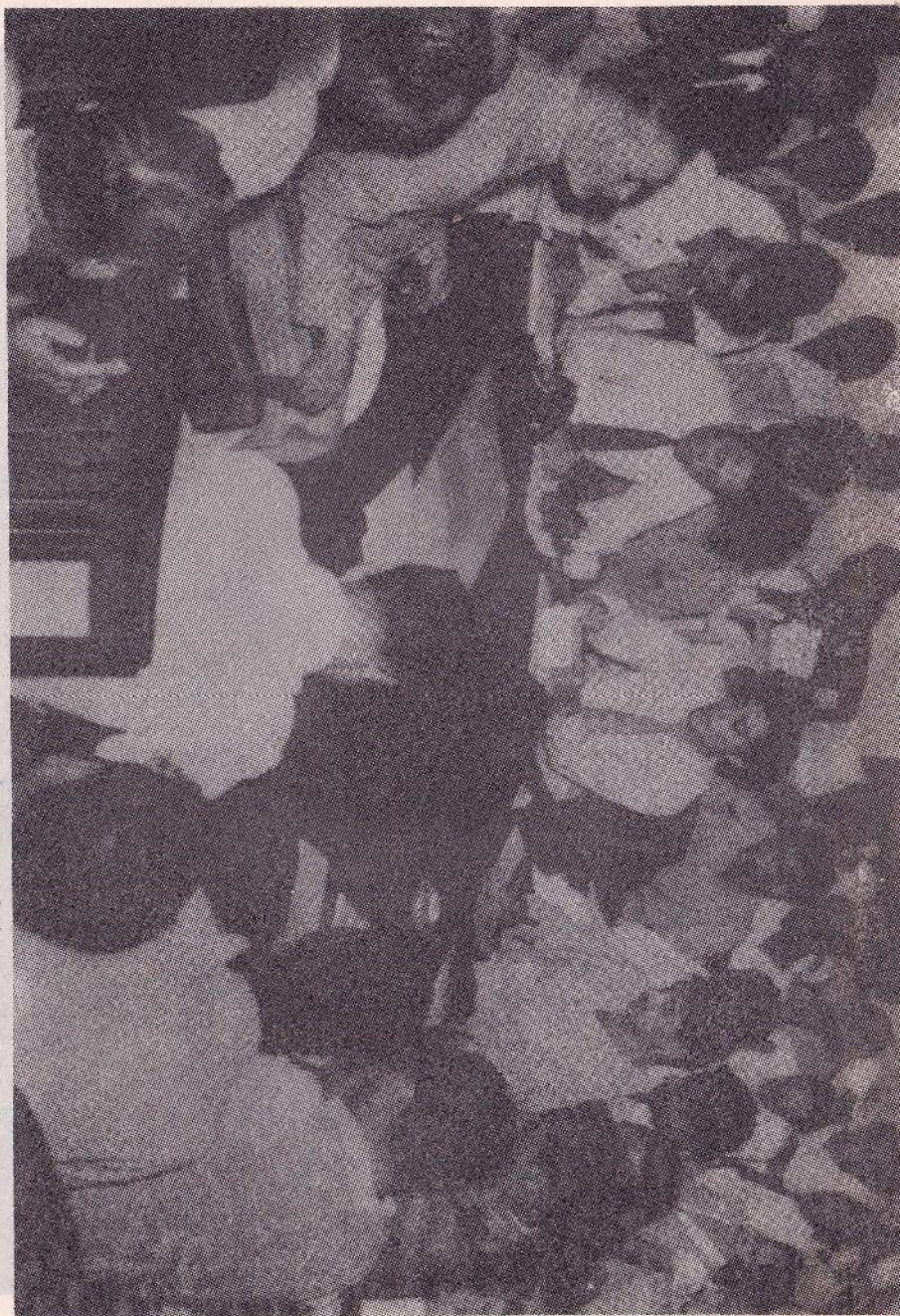




۱۹۵۰ء مصنف وزیر اعظم برطانیہ لارڈ ایشلی کے ہمراہ



سکون کی کوشش میں مسئلہ کچھ بڑھ کر آئے ہیں مصنف کا ایک پرچہ ہمیشہ کافور سے خطاب





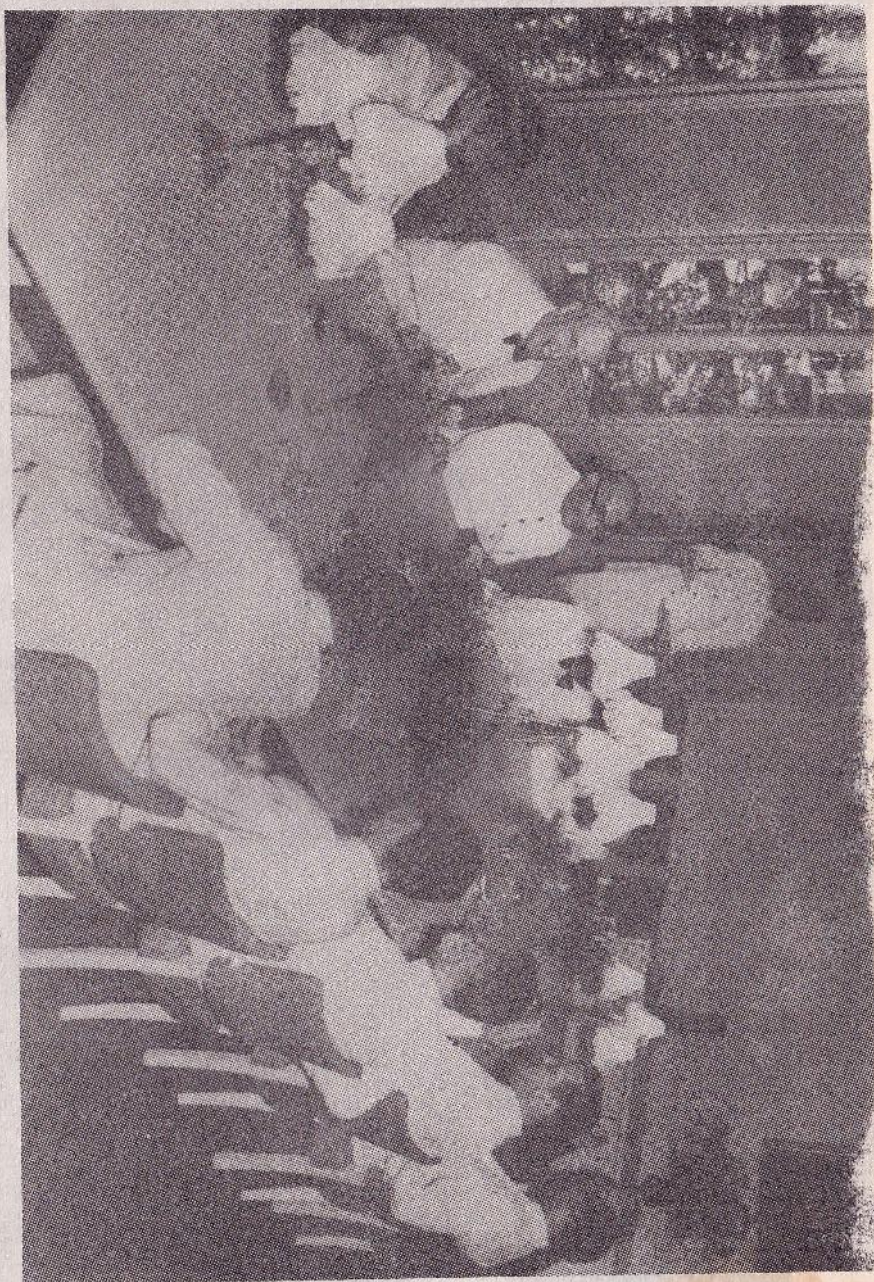


مصنف سعودی عرب کے شاہ فیصل کے ہمراہ



مصر کے صدر جمال عبدالناصر اور مصنف





ایات علی خان کسان کے عزیز اور کثیر متعلق ہو گئے۔ ان سے ان نشتوں پر ان سے میرے فہرہ مصنف (تبدوزی خاوند پاکستان)



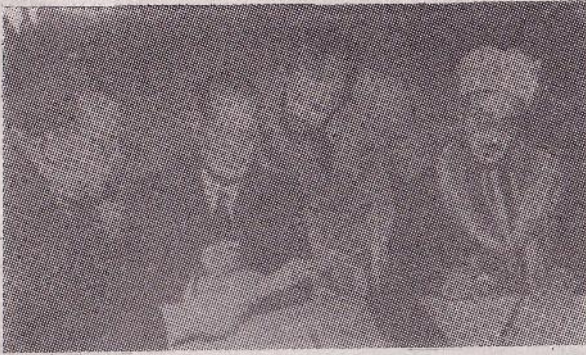


۱۹۶۹ء مصنف جرمنی کے ممتاز قانون دان پروفیسر ڈاکٹر ہینکے کے ساتھ دوران گفتگو



مصنف (تب وزیر خارجہ پاکستان) ، مصر کے وزیر خارجہ ، مولوی تمیز الدین خاں ، امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسن اصفہانی اور مصری سفیر عبدالرحیم





۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء۔ مصنف اقوام متحدہ کے اجلاس میں۔ یمن اور پاکستان کے اقوام متحدہ میں داخلے کا منظر

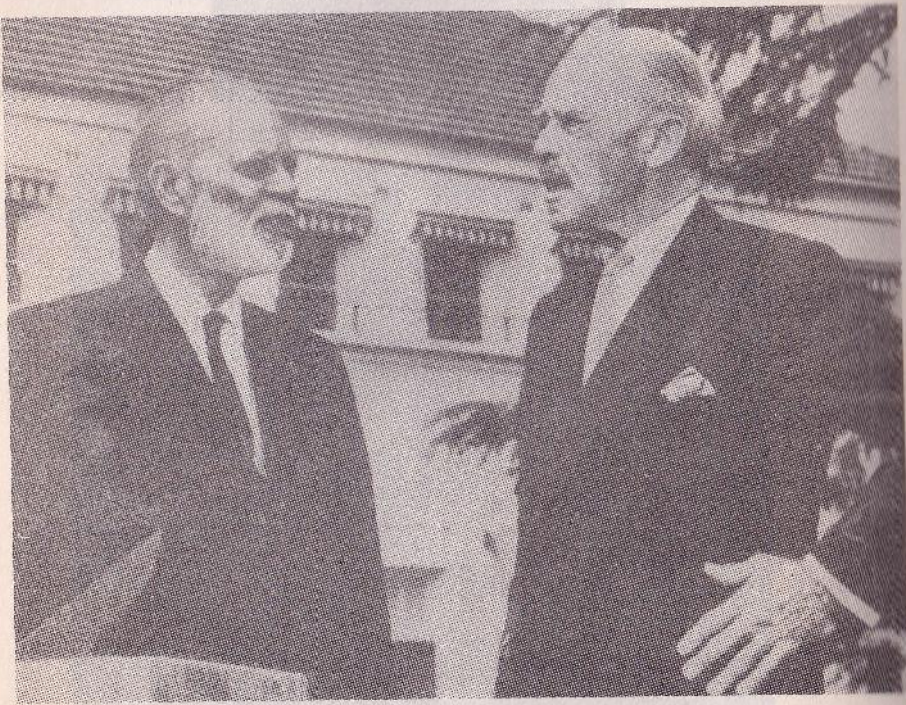


مصنف اردن کے شاہ حسین کے ساتھ۔ اردن کا اعلیٰ ترین اعزاز وصول کرنے کے بعد





امریکہ - مصطفیٰ امریکہ کی بعض ممتاز شخصیات کے ساتھ درمیان میں رابرٹ کینیڈی



کینیڈا - آسٹریلیا کے گورنر جنرل لارڈ گریسی اور مصطفیٰ





مصنف کا بطور مرکزی وزیر آئل انڈیا ریپورٹ سے خطاب



سر راماسوامی مودالیا اور مصنف





مصطفیٰ جہاںگیر کی ایگریکچر کونسل کے رکن تھے



سرور عبدالرب نشتر (تب وزیر مواصلات) مصطفیٰ جہاںگیر (تب وزیر خارجہ) عبدالستار بیگزادہ (تب وزیر خوراک)  
پاکستان سیکورٹی پرنٹنگ کارپوریشن کے سنگ بنیاد کی تقریب میں شرکت کے لئے آ رہے ہیں





مستف بطورج انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس



ان مصائب و مشکلات کے ساتھ پاکستان معرض وجود میں آیا۔ جہاں تک انسانی کوششوں کا تعلق ہے تو یہ بڑی حد تک محض ایک شخص کی کامیابی تھی اور وہ تھے مسٹر محمد علی جناح جنہیں ان کی شکر گزار قوم قائد اعظم یعنی ”دی گریٹ لیڈر“ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کے لئے علیحدہ سر زمین کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ بچھا کر دیا۔ جب منزل ملی تو ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ وہ پاکستان کا نظم و نسق سدھارنے کے لئے ایک سال سے کچھ ہی زائد عرصہ زندہ رہے۔ ان کے نمایاں قریبی ساتھی اور پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان صرف تین سال بعد ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ان دونوں اعلیٰ ترین رہنماؤں کا انتقال جو فہم و دانش اور بے پناہ وقار کے ساتھ ساتھ عزم مصمم کے مالک تھے ملک و قوم کے لئے سنگین اور ناقابلِ تلافی نقصان تھا۔ اس صورتحال نے پاکستان کو اندرونی طور پر بھی کمزور کر دیا جو کہ بیرونی اعتبار سے اپنی جغرافیائی پوزیشن اور ہندوستان کے کشمیر پر معاندانہ نوجی قبضے سے پیدا ہونے والے مشکل حالات سے دوچار تھا۔

لیاقت علی خان کے جانشین وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین قابل احترام شخصیت تھے۔ وہ پُرکشش شخصیت رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسری تمام خوبیوں سے مالا مال تھے جن میں نرمی، شائستگی، مہمان نوازی اور ذاتی دیانت شامل تھیں۔ مگر وہ مطلوبہ سختی کے وصف سے افسوسناک حد تک عاری تھے جو کسی بھی رہنما اور ایڈمنسٹریٹر کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ انہیں اپنے آس پاس ہمیشہ کسی ایسے شخص کی ضرورت رہتی تھی جس کی قوت سے وہ کام کریں اور جس کے فیصلے پر وہ انحصار کر سکیں۔ وہ اس سے قبل غیر منقسم بنگال میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہنے کے علاوہ مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے۔ وہاں انہیں ان کے کہیں زیادہ قابل، چالاک اور شاطر



چھوٹے بھائی خواجہ شہاب الدین نے سنبھالا دیئے رکھا تھا جب بڑا بھائی مسٹر جناح کے جانشین کی حیثیت سے پاکستان کا گورنر جنرل بنا تو چھوٹے بھائی کی مشاورت، مدد مل گفتگو اور رہنمائی انہیں بدستور مقیم رہی کیونکہ وہ مرکز میں وزیر داخلہ بن چکے تھے۔ بڑے بھائی کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد ہی چھوٹے کو صوبہ سرحد کا گورنر بنا دیا گیا اور وزیر اعظم کے بے تکلف اور قریبی مشیر کی جگہ وزیر تجارت مسٹر فضل الرحمن نے لے لی جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ خواجہ ناظم الدین کے گورنر جنرل ادویات علی خان کے وزیر اعظم ہونے کے عہد میں آیتنی امر کا انتہائی محتاط انداز میں خیال رکھا جاتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین کے وزیر اعظم بننے پر ملک غلام محمد گورنر جنرل بنے جواب تک وزیر خزانہ تھے جن کی صحت اب قابل رشک نہیں رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ ابھی تک خامی زوردار شخصیت کے مالک تھے۔ اقتدار کا نقطہ ارتکاز اور پالیسی سازی کا جھکاؤ دونوں میں سے مضبوط تر شخصیت کی طرف ہونے لگا۔ گورنر جنرل نسیم کیساتھ آئین کی عملی پیروی کرنے پر کاربند رہے جبکہ وزیر اعظم وزیر تجارت کی حمایت اور مشوروں کے باوجود دوسرے ملکوں کی طرح آئین کی روح کو برقرار رکھنے کے لئے مطلوبہ قوت استعمال کرنے میں ناکام رہے۔ اس صورتحال سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اس سے یقیناً ملکی انتظامیہ مضبوط نہ رہی یا اپنا وقار برقرار نہ رکھ سکی۔

جب کابینہ کے ارکان کو وزیر اعظم اور گورنر جنرل کے درمیان اعتماد کے فقدان کا علم ہوا تو وہ وزیر اعظم کے علم کے بغیر گورنر جنرل سے براہ راست ملنے لگے۔ اس پر گورنر جنرل نے خود یہ سوچ کر کہ ایسا کرنے سے وزیر اعظم اور کابینہ کی اتحادی کمزور ہو جائے گی۔ پوری کابینہ کو یاد دلایا کہ نہ صرف ارکان کابینہ کے درمیان اعتماد کا بحران پیدا ہو رہا ہے بلکہ اس سے کابینہ کے ارکان انفرادی طور پر اور وزارت بحیثیت مجموعی عوام اور رائے عامہ سے بظاہر الگ تھلک ہوتی جا رہی ہے۔ انہوں نے زوردار انداز میں مشورہ دیا کہ وزیر اعظم کو کابینہ کی تشکیل نو پر غور کرنا چاہیے تاکہ کابینہ کے ارکان کے درمیان باہمی اعتماد بحال کرنے کے ساتھ ساتھ کابینہ اور خود وزیر اعظم کے درمیان بھی اعتماد بحال ہو سکے۔ وزیر اعظم نے گورنر جنرل کے اس مشورے کو شاید غیر ضروری اور غیر مناسب سمجھا چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کرنے پر



آبادی کا اظہار نہ کیا۔ معاملات اسی طرح چلتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۵۳ء کا موسم مہار آگیا جب لاہور میں وسیع پیمانے پر اور کراچی میں کسی حد تک ہنگامے اور بد امنی پیدا ہوئی جس کا مقصد اس مطالبے کی حمایت کرنا تھا کہ وزیر خارجہ کو ان کے عقائد اور نظریات کی وجہ سے جنہیں غیر روایتی یا غیر قدرت پسند سمجھا جاتا تھا مستعفی ہو جانا چاہیے یا پھر انہیں برطرف کیا جانا چاہیے۔ گورنر جنرل نے محسوس کیا کہ وزیر اعظم اپنے غیر مستحکم رویے کے باعث صورتحال سے مؤثر طور پر نمٹنے میں ناکام رہے ہیں۔ چنانچہ ملک کو جس بحران میں دھکیل دیا گیا تھا اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے وزیر اعظم سے استعفا طلب کر لیا۔ وزیر اعظم نے انکار کر دیا۔ اس پر گورنر جنرل نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ اور مشرقی پاکستان سے مسٹر محمد علی بوگرہ کو، جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے اور ان دنوں کراچی آئے ہوئے تھے، حکومت بنانے کی دعوت دی۔ مسٹر محمد علی نے فوری طور پر نئے ارکان کا بینہ کی فہرست گورنر جنرل کو پیش کر دی۔ شام چار بجے پہلی وزارت برطرف کی گئی اور آٹھ بجے دوسری کا بینہ کے ارکان نے حلف اٹھا لیا۔

نئے وزیر اعظم اپنے پیش رو کی نسبت کم عمر اور زیادہ چالاک و چوند تھے اور کچھ عرصے تک گورنر جنرل اور وزیر اعظم ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ تاہم اپنے طویل تجربے اور معاملات کی وسیع تر سمجھ بوجھ رکھنے کی وجہ سے گورنر جنرل نشورہ دیئے کو بے تاب رہتے تھے جو بعض اوقات وزیر اعظم کی سوچ اور مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں ایک طرف گورنر جنرل اور وزیر اعظم کے درمیان اختلافات منظر عام پر آنے لگے اور دوسری جانب وزیر اعظم جو آئین ساز اسمبلی میں قدرتی طور پر اپنی پوزیشن مضبوط بنانا چاہتے تھے انہیں گورنر جنرل سے ملنے والی ہدایات اور دلائل سنا کر کھٹکے لگیں جن کا مقصد شاید وہی پُرانا تھا ۱۹۵۲ء کے موسم خزاں میں معاملات یہاں تک پہنچے کہ گورنر جنرل نے انتہائی اقدام کرتے ہوئے آئین منسوخ کر دیا اور آئین ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ اس طرح قیام پاکستان کے صرف سات سال بعد آئینی اختلافات کی مشینری عملدرآمد کرتی آگئی اس کے بعد سیاسی الجھاؤ کا چار سالہ دور شروع ہوا جس میں مسٹر سکندر مرزا ملک کے معاملات چلاتے رہے۔ سکندر مرزا برطانوی دور میں صوبہ سرحد میں نہایت قابل پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر فرائض ادا کر رہے تھے قیام پاکستان



کے بعد وہ سیکرٹری دفاع کے منصب پر فائز رہے جہاں ان کا تقرر کارکردگی اور قابلیت کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اُسے گورنر جنرل ملک غلام محمد نے سربراہ مملکت کا عہدہ سنبھالنے کے لئے بلایا تھا۔ سکندر مرزا ملک کا سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی سیاسی رسد کشی میں ملوث ہو گئے جس نے ملکی ریاست کو "میزدیکل چیئر" کا کھیل بنا کر رکھ دیا۔ سربراہ مملکت نے ملک میں نئی سیاسی جماعتوں اور وزارتوں کے قیام کی عہدہ افزائی کی اور ساتھ ہی ساتھ انہیں بگاڑنے اور اقتدار سے محروم کرنے میں مصروف رہے۔ ان حالات نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کو ۱۹۵۸ء میں ملک کی ہاک ڈور سنبھالنے پر اکسایا۔

انہوں نے برسرِ اقتدار آتے ہی سیاسی رسد کشی سے اپنی شدید نفرت کا اظہار کیا اور سیاست کو صاف ستھرا بنانے کے عزم کا اظہار کیا۔ ان کی حکومت کے ابتدائی پانچ برسوں میں ہر چیز ترقی پذیر نظر آتی تھی اور عوام کے نشانات اطمینان اور خوش حالی کے تھے۔ بعض خرابیوں کی اصلاح کے لئے بنیادی اہم اقدامات کئے گئے جس کے نتیجے میں عام آدمی ایوب خان کے پیش رو کے دور کے مقابلے میں خود کو بہتر اور خوش و خرم محسوس کرنے لگا۔ انتظامیہ کے لئے اندرون ملک احترام کے جذبات تھے اور بین الاقوامی سطح پر بھی اس کے وقار میں اضافہ ہونے لگا۔

فیلڈ مارشل کا عزم سے جمہوریت کے آواز کا تجربہ نہایت زوردار مجلسی کے ساتھ شروع کیا گیا۔ ابتداء میں اس نے لوگوں کی امیدوں کو بے تابی کی حد تک بڑھا دیا مگر اس کی دلکشی جلد ہی ختم ہو گئی اور ان کے بنیادی جمہوریت دان پرانے سیاستدانوں سے کسی لحاظ سے بہتر ثابت نہ ہو سکے۔ اس پر سنزاد ان کی ناخوشانگی اور نا تجربہ کاری تھی۔ البتہ اس نظام سے عوام کے لئے سیاست میں کسی حد تک دلچسپی پیدا ہوئی مگر اس سے وہ فائدہ حاصل نہ ہو سکے جن کی توقع کی گئی تھی۔

پرانے انداز کے سیاستدانوں کی بجا طور پر مذمت کرنے اور انہیں تہن منہس کر دینے کے بعد فیلڈ مارشل بد قسمتی سے خود ایک سیاسی جماعت کی سربراہی قبول کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس طرح وہ بھی اسی قسم کی ترغیبات اور لالچ کا شکار بن گئے ان سے پہلے جو سیاستدانوں میں باقی جاتی تھیں اور جس کی وہ شدت کے ساتھ مذمت کر چکے تھے۔

یہ بذاتِ خود شاید اتنی نقصان دہ بات نہ ہوتی یا اس سے ہونے والے نقصان کو ایک خاص حد تک محدود رکھا جاسکتا تھا مگر بد قسمتی سے وہ تنقید سے انتہائی الگ ہو گئے اور انہوں



نے اپنے ارد گرد چالوس اور خوشامدی قسم کے مشیروں کی دیوار کھڑی کر لی جس نے انہیں راستے عامہ سیاسی سوچ کے انداز فکر اور حکومت اور اس کے حواریوں کے خلاف بڑھتی ہوئی بے اطمینانی کے درجہ ان سے بالکل بے خبر رکھا۔ اس صورت حال کے عین دوران میں اُن پر مرض حملہ ہوا جس سے وہ پورے طور پر مغلوب تو نہ ہوئے مگر اس سے حکومت پر ان کی گرفت یقیناً ڈھیلی پڑ گئی۔ چنانچہ عین اس مرحلے پر جب انہیں آگے بڑھنا چاہتے تھے، وہ پسپا ہونا شروع ہو گئے۔ اُن کے اقتدار کے ابتدائی برسوں میں دو ایسے مفید رجحانات نے فروغ پایا جو یقیناً ان کی زور دار پالیسیوں اور زبردست شخصیت کا نتیجہ تھے۔ اقتصادی میدان میں ایک ہمہ جہت اور نمایاں بہتری ہوئی جس کی رفتار برقرار تھی۔ اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالت سدھارنے پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ تناسب کے اعتبار سے مشرقی پاکستان میں ہونے والی ترقی مغربی پاکستان سے بھی نمایاں ہو گئی۔

انتظامیہ پر ان کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی بدعنوانیوں کی انتہا ہو گئی یہاں تک کہ بعض معاملات میں ان سے پہلی حکومتوں کے ادوار میں بھی ان کی مثال ملنا مشکل ہو گئی۔ ابتدائی برسوں کی شان و شوکت اور دلکشی کی جگہ جلد ہی انسردگی، ناامیدی اور بے بسی نے لے لی۔ فیلڈ مارشل نے اس لہر کو ختم کرنے کی آخری کوشش کی تو معلوم ہوا کہ حالات کا دھارا اتنا تیز ہے کہ وہ اپنی کمزور صحت کے ساتھ اسے روکنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ آخر کار انہیں اقتدار جرنل یحییٰ خان کے حوالے کرنا پڑا جو سیاسی اور انتظامی ہر دو طرح کے تجربے سے محروم تھے۔ اگرچہ انہوں نے صحت مند جمہوری سیاسی نظام کی بحالی کے لیے خلوص کے ساتھ کوششیں کیں جن کے تحت اقتدار منتقل کیا جاسکے مگر وہ سیاسی لہروں کے مدوجزرا اور شخصی خواہشات کا شکار ہو گئے جن سے ان کی نجات کا راستہ سبوتا ہو گیا۔ اور یہ پردہ آخر المیہ منظر پر اٹھا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہندوستان کا تقریباً ایک ہزار میل کا علاقہ شامل تھا۔ مشرقی پاکستان کا رقبہ چوں ہزار مربع میل تھا جبکہ مغربی حصے کا رقبہ تین لاکھ چھ ہزار مربع میل تھا۔ مغربی پاکستان کی آبادی چھ کروڑ تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں سات کروڑ لوگ آباد تھے۔ یہ کراۓ ارض پر سب سے گنجان آباد علاقہ ہے۔ چٹاگانگ کے سوا تمام ملک میدانی ہے اور دریاؤں سے بھرپڑا ہے۔



یہ برصغیر پاک و ہند کے دو بڑے دریا توں گنگا اور برہمپتر کے درمیان ڈیلٹا بناتا ہے۔ دریاؤں کی کثرت ہے۔ سیلاب اکثر آتے رہتے ہیں جن سے ساحلی علاقے طوفانی لہروں کی زد میں رہتے ہیں۔ اور اکثر بھاری نقصانات ہوتے رہتے ہیں۔

مغربی پاکستان میں سندھ کے علاقے میں وسیع و طرییع صحرا ہیں اور شمال مغرب میں ہندو بالا پربتوں کے علاوہ سطح مرتفع کا علاقہ ہے جو بٹاشنک گرنڈ فیئر ہے اور اس کی سطح سمندر سے ہندی دو ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے۔ مغربی پاکستان کی ضرورت آبپاشی ہے مگر مشرقی پاکستان کے لئے پانی کی لکاسی اور سیلابوں کی روک تھام بڑے مسائل ہیں۔ آزادی کے وقت دونوں حصوں میں برائے نام صنعتیں تھیں مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی زرعی پیداوار پٹ سن تھا جو مغربی بنگال میں پراسیس ہونے کے بعد برآمد کر دیا جاتا تھا۔ جبکہ چائے براہ راست برآمد کر دی جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں اناج کی کمی تھی چاول نرم غذا تھی۔ کیپاس، گندم اور گنا مغربی پاکستان کی اہم فصلیں تھیں۔ مشرقی پاکستان کی آب و ہوا گرم مرطوب تھی جبکہ مغربی پاکستان کی گرم خشک ہے شمال مغربی علاقے میں سردیوں کے چار ماہ کا موسم نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ دسمبر جنوری کی راتیں نقطہ انجماز تک سرد ہو جاتی ہیں جبکہ دن سورج سے نور افروز شگوار ہوتے ہیں۔ جولائی سے ستمبر کے دوران ہونے والی مون سون کی بارشوں کے بعد سردیوں میں سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی نہریں آبپاشی کے لئے پانی مہیا کرتی ہیں۔

دونوں خطوں کے لوگوں کی صحت کا تعین آب و ہوا اور غذا کا کرتی تھی۔ موزا لڈر کا تعلق بھی آب و ہوا میں سے تھا جو موسم متعین کرتے تھے۔ مشرقی حصے کی زبان بنگالی تھی جو مشرقی اور مغربی بنگال (ہندوستان) دونوں جگہ عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ دارالحکومت ڈھاکہ کے علاوہ پورے مشرقی پاکستان میں اردو صرف ضلع سلہٹ میں (جو دراصل آسام کا حصہ تھا) بہتر طور پر سمجھی جاتی تھی۔ عقائد اور عبادت کے طریقے مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں میں مشترک تھے۔ مگر مشرقی پاکستان کا سماجی ڈھانچہ اور لوگوں کی عادت و اطوار مغربی پاکستان کی نسبت مغربی بنگال (ہندوستان) میں بسنے والوں کے زیادہ قریب تھیں۔

ملک کے دونوں حصوں کے درمیان جغرافیائی بُعد نے تعلقات کو بہت نازک بنا دیا تھا۔ یہ



نزاکت پاک و ہند تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ کچھ اہم جو یا نہ عوامل نے صورتحال کی نزاکت کو بڑھا دیا تھا۔ ملک کا انتظامی دار حکومت مغربی حصے میں ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت میں ایک خاص سطح سے نیچے ٹانفین مغربی پاکستان کی نمائندگی غلطی کی حد تک زیادہ ہو گئی تھی۔ بالائی سطح پر مغربی پاکستان کی پہلے ہی تقریباً اجارہ داری تھی۔ اس پرستز اد یہ کہ مشرقی پاکستان کے اعلیٰ انتظامی معاملات چلانے کے لئے بھی انہیں ہی بلوایا جاتا تھا کیونکہ آزادی کے وقت آل انڈیا سرورسز میں مشرقی پاکستانیوں کی تعداد درحقیقت بہت معمولی تھی۔ یہی صرف آہستہ آہستہ ہی پوری کی جاسکتی تھی۔ علاوہ ازیں دونوں حصوں کے درمیان طویل فاصلہ حامل ہونے، سفر پر آنے والے اخراجات، زبان کے فرق، آب و ہوا، خوراک اور رہن رہن کے مختلف طریقوں کے باعث یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہونے لگا کہ مشرقی پاکستان پر مغربی پاکستان کی حکمرانی ہے۔

اس پر مزید یہ کہ شروع میں تقریباً تمام تر افواج کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا اور اس عدم توازن کی فوری اصلاح کرنا عملی ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا آسان حل یہ نکالا گیا کہ مشرقی پاکستان کے افراد کو فوج کے عام رینکس میں بھرتی کرنے کی بجائے آفیسر کیڈر میں لیا جائے لگا۔

ابتدائی برسوں میں دونوں خطوں میں لوگوں کا تفرقہ اور تعیناتی فوری اور شدید ضرورت کے مطابق کی جاتی رہی جس کا مقصد مملکت کی بقا تھا اور تقرریوں میں علاقائی پہلو کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا جہاں سے اور جس قسم کے وسائل میسر آتے تھے انہی سے ضروریات کو پورا کر لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی صورتحال میں پہلے سے بہتر پوزیشن والا خطہ پس ماندہ علاقے کی نسبت زیادہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے اور جب تک مناسب اصلاحی اقدامات کا جائزہ لے کر انہیں نافذ نہ کر دیا جائے اس وقت تک دونوں علاقوں کے درمیان تفاوت کی غلطی آہستہ آہستہ برپا ہی جاتی ہے۔ جبرائیلی بعد دراصل ایک چیلنج ہے جسے کوئی بھی دانشمند اور حرآت مند قیادت نظر انداز نہیں کر سکتی۔

اس کا احساس دونوں جانب موجود تھا اور انہماق و تقہیم کے جذبہ سے مناسب اقدامات کئے جاتے رہے تھے۔ مشرقی پاکستان اپنی زیادہ آبادی کے باوجود آئین ساز اسمبلی میں جو مرکزی قانون ساز اسمبلی بھی تھی، برابر کی نمائندگی پر رضامند ہو گیا۔ مغربی پاکستان سے سرمایہ اور ہنرمندی کی مشرقی پاکستان میں بڑھتی ہوئی کو نو دفطرانہ استحصال کی بجائے براہ راست ہمدردی اور خدمت کے ناطے سے آمادہ کیا گیا تھا۔ اعلیٰ اگر ڈور،



میں کام کرنے والے سول ملازمین نے خوشی خوشی اپنی خدمات مشرقی پاکستان کے لئے وقف کر دیں اور وہاں کے لوگوں کی تریف اور سپردِ ردی بھی حاصل کی جن کی خدمت میں وہ صرفِ عمل تھے۔ ارزاں شرحِ کرایہ پر دونوں حصوں کے درمیان ہوائی سروس فراہم کی گئی جس سے سفر تیز تر، سستا اور آسان ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں ہوائی سفر کی سہولیات میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فوجی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی کم از کم سرکاری شعبہ میں مشرقی پاکستان کی اقتصادی ترقی کی رفتار مغربی پاکستان کے مقابلے میں تیز تر ہونا شروع ہو گئی۔ اس صورتحال میں ایک مفید تبدیلی یہ آئی تھی کہ اُس وقت تک مشرقی پاکستان میں اقتصادی ترقی کے منصوبوں سے استفادہ کرنے کے لئے مطلوبہ بنیادی ڈھانچہ مضبوط ہو چکا تھا۔ خود مشرقی پاکستانی یہ کہتے ہوتے سُنے جاتے تھے کہ ڈھاکہ ناقابلِ یقین حد تک پھیلنا جا رہا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہاں کوئی تنقید نہیں کی جا رہی تھی، یا شکایت کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ بے اطمینانی نہیں تھی، تبدیلی کی خواہش یا بہتری کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ سب کچھ بے پناہ بلکہ اس سے بھی زیادہ حد تک موجود تھا۔ وہاں شدید گھن گرج اور تنقید تھی مگر حکومت نے بہر حال ایک توازن قائم رکھا تھا اور معاملات چل رہے تھے۔

تاہم آہستہ آہستہ شکوک کے بیجوں نے سر اُبھارنا شروع کیا جن میں سے کچھ اندر بکھرے پڑے تھے اور کچھ نزدیک اور دُور کی سرحدوں سے پھینکے جا رہے تھے۔ زمین زرخیز ثابت ہوتی اور ان کی نشوونما نہایت تیز تھی۔

زمان کے مسئلے کو عقلمندی سے نہیں سلجھایا گیا تھا۔ تاریخ سے ظاہر ہے کہ کوئی بھی قوم اپنی زبان کی تبدیلی کی کوشش یا ترغیب کے خلاف پوری قوت سے ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے۔ اور اس طرح کی کوشش سے بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ برنگالی اور اردو کا مسئلہ دو مختلف رسم الخط ہونے کی وجہ سے زیادہ اُلجھ گیا تھا۔ اردو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جبکہ عربی رسم الخط کی سادہ شکل ہے۔ برنگالی رسم الخط ہندی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان جو مسرآن پڑھتے تھے ان کے لئے عربی رسم الخط سے آشنا ہونا ضروری تھا۔ بہاری مہاجرین اردو جانتے تھے اور اسے عام بول چال کی زبان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ضلع سلہٹ میں آباد لوگوں کی اکثریت



تھوڑی بہت اُردو جانتی تھی اور پورے مشرقی پاکستان میں مذہبی علماء اُردو بھجوا دیے گئے تھے۔ اگر دوسرے شعبوں میں اعتماد اور اعتبار بحال رکھا جاتا تو قدرتی رجحان یہ ہوتا کہ بنگالیوں میں بتدریج اُردو رسم الخط سے آشنائی بڑھتی جاتی۔ اسی طرح غیر بنگالی عناصر کے بڑے حصے میں بنگالی زبان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کا سوشل کلچر اور عادات و اطوار مقبول ہو جاتیں۔ یہ صحت مند اور مفید رجحان آپ اپنی رفتار کے ساتھ چلتا رہتا۔ مگر بد قسمتی سے اُردو کی وکالت کرنے والوں نے فوری پیش رفت کی کوشش کی اور عمومی رفتار کو جبراً تیز کرنا چاہا۔ یہ کوشش ہلک ثابت ہوئی اور اس کے کئی شعبوں میں تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔

شک نے بد اعتمادی کو فروغ دیا اور خیر سگالی ختم ہو کر رہ گئی۔ تخریب کار عناصر نے ان لوگوں کی سرگوشیاں سننے کے لئے اپنے کھلے کان آگے بڑھا دیئے جو قیام پاکستان ہی کے خلاف تھے اور دوسرے وہ لوگ تھے جو حکومت کی پالیسیوں اور رویوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ حکام بالا جن کی جڑیں مغربی پاکستان میں تھیں یا وہ مغربی پاکستان میں بیٹھے تھے انہیں جب بھی مشرقی پاکستان میں زیر زمین سرگرمیوں اور اُبلنے والے لاوے سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے اسے معمولی قرار دے کر لاپرواہی سے محض کندھے اُچکا دیتے۔ بشرطِ رعیت میں اپنا سرگہرے سے گہرا چھپانا چلا گیا۔

مخالف عوامل کو کئی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ کچھ دونوں حصوں کے درمیان جغرافیائی بُعد کی پیداوار تھے اور وہ مستقل اور مضبوط اصلاحی اقدامات کا مطالبہ کرتے تھے۔ کچھ کی جڑیں مخالفت اور مخالفت سے وابستہ تھیں۔ انہیں بھدروی اور خیر سگالی کا دشمنندی سے مظاہرہ کر کے ختم کیا جاسکتا تھا۔ کچھ اور فرضی داستانوں پر یقین کئے بیٹھے تھے جن کا خاتمہ حقائق کو موثر انداز میں پیش کر کے کیا جاسکتا تھا۔ بعض امور غلط فہمی کا نتیجہ تھے جنہیں بے لاگ وضاحت کے ذریعے ختم کیا جاسکتا تھا۔ ان میں سے کسی بات کے لئے کوشش نہیں کی گئی اور اگر کی گئی تو وہ بہت معمولی تھی اور بے حد تاخیر سے کی گئی۔ ایک فریق کے دل میں شکوک سے پُر اعتمادی اور دوسرے میں جذباتی اور زیادہ پُر اعتمادی نے صورتحال کو الجھا دیا۔

جب مشرقی پاکستان میں ملٹری انٹیلی جنس کو معمول شدہ اطلاعات کے مطابق اگر تدریجاً سازش کی خبر اور اس میں ملوث ملزمان کے خلاف مقدمہ چلانے کی تجویز کی خبر شائع ہوئی تو مغربی پاکستان



میں صدر کے لہر دوڑ گئی۔ کسی کو ایسی بات کی توقع نہ تھی۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات نے معاملے کو کسی شک و شبہ یا امکان سے بالاتر کر دیا۔ درحقیقت اس میں ملوث آدمی کو اپنے خوابوں کے پرجہونے پر فخر تھا۔

ایک متعلق مفروضہ مغربی پاکستان کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کا اقتصادی استحصال تھا۔ اس سلسلے میں کچھ حقائق دلچسپی کا باعث ہیں :-

۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران حکومت پاکستان نے ترقیاتی قرضوں کی مد میں ۱۵۲۶۶ ملین روپے فراہم کئے۔ ان میں سے ۸۴۱۹ ملین روپے مشرقی پاکستان کو ملے اور ۶۸۴۷ ملین مغربی پاکستان کو۔

قیام پاکستان کے ابتدائی عشرے میں کمزور اقتصادی ڈھلچنے اور جذب کرنے کی کم صلاحیتوں کے باعث غیر ملکی قرضے برابر مقدار میں تقسیم نہ کئے جاسکے۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے یہ صورتحال بتدریج مشرقی پاکستان کی موافقت میں چلی گئی۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک مشرقی پاکستان نے کل مرکزی محصولات میں ۸۰۵۱ ملین روپے فراہم کئے۔ اس میں سے ۲۸۸۴ ملین روپے (۲۸ فیصد) اس کے صوبائی حصے کے مطابق واپس کر دیئے گئے۔ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان نے ۲۲۲۷۱ ملین روپے فراہم کئے اور اسے ۴۰۰۰ ملین (صرف ۱۸ فیصد) واپس کئے گئے۔

حکومت کی ملکیت مشرقی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے متعدد صنعتی منصوبے شروع کئے جن میں تقریباً ایک ارب روپے کی سرمایہ کاری کی گئی۔ اس طرح پاکستان کی واحد سٹیل مل چٹاگانگ لگائی گئی اور کاغذ کا واحد کارخانہ کھنڈا میں لگایا گیا۔ یہ دونوں مشرقی پاکستان ہی میں تھے۔

وصول شدہ محاصل	۱۹۴۷-۴۸	۱۹۶۹-۷۰
مشرقی پاکستان	۱۶۹	۱۷۸۹
ڈھاکہ میونسٹیٹی	۱۰۶	۱۶۰۳
چٹاگانگ میونسٹیٹی	۷۰۷	۱۵



۱۹۷۰	۱۹۴۷	
۵۵	کوئی نہیں	پٹ سن کے کارخانے
(جن میں سالانہ تیس لاکھ گاڑھ پٹ سن پریس کی جاتی تھی)		
۴۴	۵	کپڑے کے کارخانے
(خام کپاس مغربی پاکستان ہیا کرتا ہے)		
۶۰۰۰ سے زائد	۳	ڈاکھی نے (تقریباً)
۵۰۰۰۰ سے زائد	۳۰۰	ٹیلی فون
۲۴۰۰ میل	۲۴۰ میل	سرٹکیں عمدہ
۱۴۰۰ میل	کوئی نہیں	سرٹکیں (عام)
۴ لاکھ ٹن	پانچ لاکھ ٹن	بندرگاہ (بلحاظ گنجائش) چٹاگانگ
۲ لاکھ ٹن سے زائد	موجود نہ تھی	بندرگاہ (بلحاظ گنجائش) چائنا
		ہوائی اڈے

۱۹۴۷ء میں صرف دو چھوٹے ہوائی اڈے تھے ایک ڈھاکہ میں اور ایک چٹاگانگ میں۔  
 ۱۹۷۰ء تک پورے مشرقی پاکستان میں درجنوں ہوائی اڈے اور ہوائی پٹیاں قائم کی جا چکی تھیں۔ اور  
 ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کو بے حد وسعت دے کر حیث جہازوں کے اُترنے کے قابل بنا دیا گیا تھا۔





۷

مارچ ۱۹۶۹ء میں حکومت سنبھالنے کے لمحے سے ہی جنرل یحییٰ خان ملک میں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے جن سے آئینی حکومت بحال ہو سکے۔ انہوں نے اپنا مدعا بار بار دہرایا اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے نہایت تیزی کے ساتھ اقدامات کئے اور قواعد نافذ کئے۔ پیچھے مڑ کر دیکھیں تو اسے سست رفتاری کی بجائے تیز رفتاری کا مور و مٹھرایا جاسکتا ہے۔

جولائی ۱۹۶۹ء میں انہوں نے اپنی نشری تقریر کے دوران مشرقی پاکستان کے عوام کے عدم اطمینان اور قومی سطح پر قومی زندگی کے اہم معاملات میں فیصلے کرنے میں ان کی عدم شرکت کے احساس کا خاص طور پر ذکر کیا۔ وہ اس سے قبل ہی مرکزی حکومت کے حکموں کے انچارج سیکرٹریوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کی ہدایات کر چکے تھے۔ باسی طرح انہوں نے مسلح افواج میں مشرقی پاکستانیوں کی بھرتی فوری طور پر دوگنا کرنے کے احکامات بھی جاری کئے تھے۔

اسی نشری تقریر میں انہوں نے کہا کہ سیاسی رہنماؤں کے ساتھ صلاح مشورے کے نتیجے میں ابتدائی طور پر تین مسائل سامنے آتے ہیں اور عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے سے پہلے انہیں حل کیا جانا ضروری ہے۔ انہوں نے ان تین مسائل کو اس طرح پیش کیا :-

۱۔ کیا مغربی پاکستان کو دوبارہ چار صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے ؟ یعنی پنجاب ، سندھ ، صوبہ سرحد اور بلوچستان جن کو ملا کر مغربی پاکستان وجود میں آیا تھا۔

۲۔ کیا مرکزی مجلس قانون ساز میں مشرق و مغرب پاکستان کی مساوی نمائندگی کو ختم کر دیا جائے ۔ جس پر ابھی تک اتفاق راستے موجود تھا اور اس کی جگہ آبادی کے مطابق نمائندگی دی جاتے ؟

۳۔ اور یہ کہ وفاق پاکستان کے اندر رہ کر مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کو کس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے ؟



انہوں نے سیاسی قیادت پر زور دیا کہ ان مسائل پر اتفاق راستے پیدا کیا جاتے۔  
 نومبر میں انہوں نے اعلان کیا کہ انہوں نے محسوس کیا ہے کہ ان مسائل پر اتنی مفاہمت  
 موجود ہے کہ ان پر مزید بات چیت کر کے ان پر اختلاف برائے کو ختم کیا جاتے اور انتخابات کراتے  
 جاسکیں۔ وحدت مغربی پاکستان کو ختم کر کے صوبے بحال کرنا تھے۔ انتخابات حتیٰ بالئے راستے دیہی کی بنیاد پر عددی  
 اعتبار سے تقریباً یکساں انتخابی حلقوں سے کراتے جاتیں گے۔ وفاقی پارلیمانی طرز کی حکومت قائم کی  
 جاتے گی جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دے کر قومی استحکام اور سالمیت کو  
 بحیثیت مجموعی برقرار رکھا جائے گا۔ آئین میں بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی ان کی خلاف ورزی  
 کو عدالتوں میں چیلنج کیا جاسکے گا۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اور یہ آئین کے  
 تحفظ کی ذمہ دار ہوگی۔

یہ کوششیں خاصی جرات مندانہ تھیں مغربی پاکستان کی وحدت کو ختم کرنا اگرچہ بہت سے  
 لوگوں کے خیال میں رجعت پسندانہ اقدام تھا مگر یہ چھوٹے صوبوں کی سیاسی قیادت کے لئے ایک  
 رعایت تھی جو بڑے اور ترقی یافتہ صوبے پنجاب کے ساتھ منسلک رہنے میں خوشی محسوس نہیں کرتے  
 تھے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مرکزی مجلس قانون ساز میں برابری ختم کرنا عملاً سیاسی  
 اقتدار کا مرکز مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان میں منتقل کرنے کے مترادف تھا۔ زیادہ سے  
 زیادہ صوبائی خود مختاری کے اعلان کے ساتھ مشرقی پاکستان کے تمام معقول مطالبات بلکہ ان سے  
 بھی کچھ زیادہ کو اصولی طور پر مان لیا گیا۔

اُس کے ساتھ عجیب بات یہ تھی کہ سیاسی رہنماؤں کی جانب سے انتقال اقتدار کے طریقے پر  
 مناسب رہنمائی نہیں کی جا رہی تھی۔ صدر نے مارچ ۱۹۶۰ء کے ادارتنگ ایک لیگل فریم ورک  
 آرڈر تشکیل دینے کا وعدہ کیا جس کے مطابق انتخابات اور آئین کی تشکیل کا طریق کار طے کیا جانا تھا  
 انہوں نے واضح کیا کہ اسمبلی میں ووٹنگ کا طریق کار پاکستان کے تمام علاقوں کے نمائندوں کے لئے  
 منصفانہ ہونا چاہیے۔

انتخابی فہرستیں جون ۱۹۶۰ء تک تیار ہوں گی اور انتخابی حلقوں کی تشکیل بھی اُس وقت  
 تک مکمل کر لی جائے گی۔ قومی اسمبلی کے انتخابات ۵ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو ہوں گے اور اسمبلی پر لانڈیم ہوگا



کر دہ اپنے پہلے اجلاس سے ۱۲۰ دن کے اندر آئین کی تشکیل مکمل کرے گی۔ اس کام میں ناکام رہنے کا صورت میں اسمبلی توڑ دی جائے گی اور انتخابات از سر نو کرائے جائیں گے۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان قانون سازی اور مالیاتی اختیارات کی تقسیم سب سے بڑا مسئلہ ہوگا جسے اسمبلی کو حل کرنا ہوگا۔

پروگرام کے مطابق لیگل فریم ورک آرڈر کا اعلان ۳۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو کر دیا گیا۔ تمام پارٹیوں نے عموماً الیکشن کی بنیاد اور اسمبلی کے کام کرنے کے لئے رہنما اصول کے طور پر تسلیم کر لیا۔

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو سیاسی جماعتوں کی بحالی کے بعد قدرتی طور پر اور متوقع اندازہ میں ایک حد تک سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ لیگل فریم ورک آرڈر کا اعلان کئے جانے کے بعد ملک کے دونوں حصوں میں سیاسی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ مغربی پاکستان میں ایک دواختہ سناک واقعات کے سوا ان سرگرمیوں نے تشدد کی تحریک کارنگ اختیار نہ کیا۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں شروع سال ہی سے عوامی لیگ نے بظاہر تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے سوا ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں کو دبا ڈالے گی۔ دوسری سیاسی جماعتوں اور گروپوں کی طرف سے جلسہ کرنے یا جلوس نکالنے کی کوششوں کو منظم طریقے سے تشدد اور مار دھاڑ کے ذریعے ناکام بنا دیا گیا۔ اس سے بے شمار لوگ زخمی ہوئے اور اموات بھی واقع ہوئیں۔ مخالف سیاسی جماعتوں اور اخبارات جنہوں نے عوامی لیگ کے پروگرام کے کسی بھی حصے کی مخالفت کی، ان کے دفاتر پر حملے کئے گئے۔ فرنیچر توڑ دیا گیا اور کاغذات جلادیتے گئے۔

”اگرچہ مختلف متاثرہ افراد اور جماعتوں نے اس قسم کے ہتھکنڈوں کے خلاف رسمی احتجاج کیا مگر اس سلسلے کو ختم کرنے کے لئے زیادہ کارروائی نہ کی گئی۔ مشرقی پاکستان میں حکام نے تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ غیر جانبداری کے صدارتی احکامات پر سختی سے عمل کیا۔ بد قسمتی سے اس کا نتیجہ نہ نکلا۔ عوامی لیگ کو اپنے سیاسی مخالفین کو تشدد سے کچلنے کی کھلی چھٹی مل گئی اور برہم خود مشرقی پاکستان کے حقوق کے لئے لڑنے والی ”پارٹی“ کی حمایت کا موقع مل گیا۔ اس طرح ہم نے دیکھا کہ انہیں بہت سے ذمہ دار شہریوں کی حمایت حاصل ہو گئی جو ان کے تشدد آمیز ہتھکنڈوں



کو محض نوجوانوں اور جو شیٹلے کارکنوں کی کارستانی کہہ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔ میں اور میری بیوی نے ان کا نقطہ نظر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ عوامی لیگ ہمارے ساتھ اور اپنے بے گناہ سیاسی مخالفین کے ساتھ جو کچھ کر رہی تھی وہ بعینہ وہی طرز عمل تھا جو جرمنی میں نازی ازم کے عروج سے پہلے ہٹلر کے حامی طبقہ شرفاء کے رئیسوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ مزید خطرہ یہ تھا۔ ہم سوچتے تھے کہ مشرقی پاکستان جیسے ملک میں ہمہ گیر تشدد شروع کرنا آسان تھا مگر روکنا مشکل۔ اور یہ جلد ہی مکمل شورش کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

(بحوالہ: ڈی ایسٹ پاکستان ٹریبونل؛ صفحہ ۳۲-۳۳)

مارچ ۱۹۷۰ء کے اواخر میں صدر نے اپنے نشری خطاب میں سیاسی رہنماؤں کو یاد دلایا کہ اپنے پیروکاروں کو تشدد سے روکنا ان کی ذمہ داری ہے مگر اس یاد دہانی کا کوئی اثر نہ ہوا جو لاقی کے اواخر میں صدر نے خبردار کیا کہ تشدد ختم نہیں ہوا ہے۔ جامعوں کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں اور مفاہمت کا جذبہ مفقود ہے۔ انہوں نے امن و امان کی ضرورت پر زور دیا اور واضح کیا کہ مارشل لا احکام نے نفاذ قانون کے فرائض کو جان بوجھ کر محدود کر رکھا ہے تاکہ سیاسی سرگرمیاں محدود نہ ہونے پائیں اور یہ کہ اسے کمزوری پر محمول نہ کیا جاتے۔ انہوں نے حکومت کے اس عزم کا اعادہ کیا کہ منصفانہ انتخابات کو یقینی بنایا جاتے گا۔

ان نشریوں میں حکومت کے ان پروگراموں کا خلاصہ بھی بیان کیا گیا جن پر عملدرآمد شروع کیا جا چکا تھا اور جن کا مقصد مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تفاوت کو دور کرنا اور ملک زیادہ پسماندہ حصوں میں تیز رفتار ترقی کو فروغ دینا تھا۔ عالمی بینک کی سفارش پر مشرقی پاکستان کے ۸۰۰ ملین روپے کی خطیر رقم سے سیلاب پر قابو پانے کے ایک جامع پروگرام کا اعلان کیا گیا تھا اور اس کے لئے غیر ملکی امداد حاصل کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔

یکے بعد دیگرے دو قدرتی آفات نے مشرقی پاکستان کے بارے میں تمام تخمینوں کو درہم برہم کر دیا۔ ستمبر میں شدید سیلابوں نے وسیع علاقوں میں تباہی پھیلا دی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے۔ مواصلات کا پورا نظام بُری طرح متاثر ہوا۔ صدر نے قومی اسمبلی کے انتخابات، دسمبر اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۷ دسمبر پر ملتوی کر دیئے۔ مرکزی حکومت اور مشرقی پاکستان



کی حکومت مطلوبہ مقامات پر امدادی کاموں میں مصروف ہو گئی۔ اسی دوران میں ۱۲ نومبر کو ایک غیر متوقع طور پر شدید سمندری طوفان آیا جس سے پانچ لاکھ کے قریب افراد ہلاک ہو گئے اور بے شمار مالی نقصان ہوا۔

تباہی اس قدر شدید تھی کہ ہر طرف سے امداد کی فراخ دلانہ پیشکشیں ہونے لگیں۔ ”غیر ملکی صحافی اور مختلف امدادی تنظیموں کے نمائندے بڑی تعداد میں ڈھاکہ پہنچ گئے مگر سیاسی انتخابی تحریکوں کی گرما گرم فضا میں یہ غیر ملکی نمائندے جن کے لئے متناثرہ علاقوں تک پہنچنا عملاً ناممکن تھا کیونکہ ریل و رسائل اور مواصلات کے تمام میسر ذرائع پر امدادی کاموں کی غرض سے سرکاری اداروں کا کنٹرول تھا، باستانی مرکزی اور صوبائی حکومت پر عوامی لیگ کی تنقید کا شکار ہو کر رہ گئے۔ یہ تباہی شیخ مجیب الرحمن کی منافرت پھیلانے کی تحریک کا ایک اور نمونہ بن گئی۔ چنانچہ مرکزی حکومت اور صوبائی سول و فوجی حکام کی بیعت بے حس کا پروپیگنڈہ کرنے کے لئے خون آشام داستانیں اور کہانیاں گھڑ لی گئیں۔۔۔

”۱۹۷۱ء کے موسم بہار اور موسم گرما کے اوائل میں پاکستان کے اپنے دو دوروں کے دوران میں نے ان الزامات کے متعلق معلومات حاصل کرنا اپنا معمول بنالیا۔ میں نے محسوس کیا کہ دفاعی افواج کو یہ موضوع سخت ناپسند تھا کیونکہ انہوں نے برداشت کی آخری حد تک جا کر دن رات امدادی کام کیا تھا۔ مجھے امدادی کام کرنے والے غیر ملکیوں سے جو کسی طرح متناثرہ علاقوں تک جا پہنچے تھے بے شمار ایسی غیر جانبدار شہادتیں ملیں جن سے دفاعی افواج کے شاندار کام کی تائید ہوتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ان کی لگن تمام تر تقریبی کلمات سے بالاتر ہے۔۔۔۔

”حقیقت یہ ہے کہ حکام کی جانب سے تباہی پر قابو پالنے کی کوششیں فوری اور شدید تھیں۔ سمندری طوفان بھٹنے کے چند گھنٹوں کے اندر فوج کی طبی امداد کی جماعتیں سب سے شدید متناثرہ علاقوں میں پہنچیں جن میں بھولا اور باتیا جزائر اور نواکھلی کے اضلاع شامل تھے۔ سگنل کور کے باقی ماند لوگوں کو اکٹھا کر کے ہنگامی وائرلیس مواصلات کا سسٹم بحال کر لیا گیا۔ ایک آرمی آپریشنل سنٹر نے ڈھاکہ میں فوری طور پر کام کرنا شروع کر دیا تاکہ سول اور فوجی حکام کی سرگرمیوں کو مربوط بنایا جاسکے۔ پاک بحریہ فوراً حرکت میں آگئی۔۔۔ چٹاگانگ میں بحریہ کے حکام نے ضرورت



کے مطابق اشیاء متاثرہ علاقوں میں پہنچانے کا جامع منصوبہ بنالیا۔ بہت سے لوگ تختوں اور شہتروں پر تیرتے ہوئے ملے جنہیں زندہ بچالیا گیا۔ پاکستان اتر فورس بھی فوراً امدادی کاموں میں شامل ہو گئی۔ تمام میسٹریاؤں کو امدادی کاموں کے لئے وقف کر دیا گیا۔۔۔ ایسے دور دراز علاقوں میں جہاں فوج اور بحریہ فوری طور پر نہیں پہنچ سکتی تھیں وہاں غوراک اور دوسری ضروری اشیاء پہنچانے کے علاوہ اتر فورس نے امدادی سامان لے کر ڈھاکہ آنے والے غیر ملکی طیاروں کو اُتارنے، انہیں تیل اور تھینکی امداد فراہم کرنے کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ صدر مملکت نے متعدد اعلیٰ مرکزی اور صوبائی حکام کے ہمراہ متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور امدادی کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔

”بد قسمتی سے اس تمام اچھے کام کی کوئی تشہیر نہ ہو سکی۔ ڈھاکہ میں آتے ہوئے غیر ملکی صحافیوں کو اس میں کوئی خبریت نہ مل سکی کیونکہ عوامی لیگ منظم طور پر انہیں ظلم و ستم، ڈکیتی، بد انتظامی اور سفاکی کی داستانیں بہم پہنچا رہی تھی۔ اس طرح کی من گھڑت خبریں بغیر تنقیدی جائزہ لئے قبول کر لی جاتی تھیں اور غیر ملکی صحافی انہیں بیرون ملک اپنے اپنے دفاتر کو ارسال کر دیتے تھے۔۔۔ تاہم زیادہ عرصہ گزر جانے سے پہلے ہی رسل و رسائل کے ذرائع بحال کر دیتے گئے اور غیر ملکی صحافی سیلاب سے تباہ ہونے والے علاقوں کا دورہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ اس کے باوجود مسلح افواج کے ریلیف کے کاموں کی جانب ان کی توجہ نسبتاً کم ہی رہی۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ کام کوئی ڈرامائی ”خبر“ فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ غیر ملکی نامہ نگار جنہیں الیکشن کی خبروں کی ترسیل کے لئے اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے بلایا گیا تھا انہوں نے البتہ حکام کی ان بے پناہ کوششوں کو مناسب طور پر رپورٹ کیا جو متاثرہ لوگوں کی بحالی کے لئے کی جا رہی تھیں۔ مگر ان کی رپورٹوں سے وہ متاثرہ اہل نہ ہو سکا جو اس سے پہلے اُن کے ساتھیوں کی بیرون ملک ارسال کردہ رپورٹوں سے قائم ہو چکا تھا۔ شیخ مجیب الرحمن اور اس کے حواریوں نے سمندری طوفان سے پیدا ہونے والی مشکلات کو مرکزی حکومت اور مغربی صوبے کے ہاتھوں تشریف پاکستان پر توڑے جانے والے مبینہ مظالم کی طویل فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ حکام پر نہ صرف تباہی کے بعد صورتحال کو سنبھالنے میں غلطیاں کرنے کا الزام لگایا جا رہا تھا بلکہ مشرقی پاکستان کے لئے طے والی فراخ دلانہ غیر ملکی امداد کی راہ میں روڑے اڑکاتے اور اس



کی ترسیل میں چوری اور ہیرا پھیری جیسے الزامات بھی عائد کئے جا رہے تھے۔ ایکشن سے پہلے اور بعد دونوں حالات میں سمندری طوفان سے ہونے والی تباہی کو مرکزی حکومت اور مغربی صوبے کے خلاف ایک زوردار نعرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا اور یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کی خوفناک زبوں حالی کی یہی وجہ ہیں۔“

(بحوالہ ”دی ایسٹ پاکستان ٹریبیون“، صفحہ ۳۴-۳۵)

طوفان سے قومی اسمبلی کے اٹھ اور صوبائی اسمبلی کے اکیس حلقے متاثر ہوئے تھے۔ صدر مملکت نے فیصلہ کیا کہ ان حلقہ ہائے انتخاب کو چھوڑ کر انتخابات پروگرام کے مطابق ہوں گے۔ پورے مغربی پاکستان میں سیاسی سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ اندرونی مسائل اور خارجہ پالیسی تھی اور چند ایک واقعات کو چھوڑ کر یہ امن و امان کے دائرہ کے اندر رہ کر جاری تھیں جبکہ مشرقی پاکستان میں سیاسی سرگرمیاں عوامی لیگ کی جانب سے مسلسل شور و شہ اور مغربی پاکستان کے خلاف شدید نفرت کی تحریک پر مبنی تھی۔ اس کے رہنما کی جانب سے تمام تقاریر اور اعلانات میں براہ راست امر کا اظہار کیا جاتا رہا کہ مشرقی پاکستان میں موجود ہر برائی اور خرابی کا ذمہ دار صرف اور صرف مغربی پاکستان ہے۔ وہ بار بار کہتا کہ مرکزی حکومت مغربی پاکستان کے استحصالی عناصر کی آلہ کار ہے جنہوں نے مشرقی پاکستان کو لوٹا تھا اور اب بھی لوٹ رہے ہیں۔ ان لوگوں نے مشرقی پاکستان کو اس کے سرمایہ، اقتصادی ترقی، غیر ملکی زرمبادلہ، اس کے باشندوں کو انتظامیہ اور مسلح افواج میں شرکت کے حقوق اور قومی اور مقامی معاملات کو چلانے سے محروم کر رکھا تھا۔ مغربی پاکستانیوں نے عوامی لیگ کے لیڈر کے بقول نوآبادیاتی نوعیت کی اس لوٹ کھسوٹ کے ذریعے مغربی پاکستان میں نفع بخش صنعتیں قائم کر لی تھیں۔“

(”دی ایسٹ پاکستان ٹریبیون“، صفحہ ۴۲-۴۳)

”۱۹۶۰ء کے ابتدائی مہینوں میں اس نے اور اس کے سرکردہ حواریوں نے مشرقی پاکستان کے طول و عرض کے دورے کئے اور اس طرح وہاں کے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ اسے مغربی پاکستان کی کوئی پروا نہیں اور یہ کہ عوامی لیگ ہی مشرقی پاکستان کے حقوق کی تنہا علمبردار ہے۔ چھ نکات ایسا جاڑے جو ان کے حقوق کو ہمیشہ کے لئے محفوظ بنادے گا۔ اس کے سامعین



کو یقین ہو گیا کہ اگر انہوں نے اسے ووٹ دیتے تو ان کے تمام معاشی مسائل حل ہو جاتیں گے۔ مشرقی پاکستان امیر اور خوشحال ہو جاتے گا۔ اور ہر فرد کو مناسب خورداک، گھر اور لباس میسر آ جائے گا۔“ (بحوالہ: ڈی ایسٹ پاکستان ٹریجڈی؛ صفحہ ۴۳)

”انتخابات سے پہلے شیخ مجیب الرحمن کے اعلانات کا ایک پہلو ایسا ہے جس کا بغور جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اُس نے کسی بھی موقع پر نہ تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مطالبہ کیا اور نہ ہی ایسا کوئی اشارہ دیا۔ ایک ایسی طرز کے پاکستان پر یقین رکھنے والے ووٹروں سے جس کی بنیاد قائمہ اعظم نے رکھی تھی، اُس کی ایک اہم اپیل یہ تھی کہ اس کے چھ نکات پاکستان کو مضبوط بنائیں گے کیونکہ اس سے مغرب اور مشرق کے درمیان ایک دوسرے کے متعلق نئی افہام و تفہیم پیدا ہوگی اور یہ ان کے درمیان زیادہ موثر تعاون کی بنیاد بنیں گے۔“

(ڈی ایسٹ پاکستان ٹریجڈی؛ صفحہ ۴۴-۴۳)

اس مرحلے پر کسی بھی جانب سے ایسی کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی تھی کہ حکومت انتخابات میں مداخلت کر رہی ہے۔ بلکہ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے اس میں حکومت کے رویے پر تنقید کی قطعاً خواہ گنجائش موجود ہے کہ اس نے عوامی لیگ کی جارحانہ اور ہنگامہ خیز سرگرمیوں سے چشم پوشی کئے رکھی۔ یہ سرگرمیاں پورے مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی تھیں اور یہ ۱۹۷۰ء کے پورے سال کے دوران جاری رہیں۔ ان سرگرمیوں کی نوعیت اور دائرہ کار کا اندازہ محض اس ایک حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کے الیکشن میں عوامی لیگ کی مضبوط تنظیم اور ڈسپلن کے ساتھ ساتھ اس کے بظاہر لامحدود مالی وسائل کے باوجود محض ۵۵ فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ ان میں سے ۵۷ فیصد ووٹ عوامی لیگ کے امیدوار کے حق میں ڈالے گئے۔ اس طرح قومی اسمبلی کی ۲۱۳ میں سے ۱۶۷ نشستیں جیت کر اکثریتی پارٹی کی حیثیت حاصل کر لینے کے باوجود یہ ایک حقیقت تھی کہ اسے مشرقی پاکستان کے حلقے ہاتھ نہایت میں محض ۴۳ فیصد ووٹروں کی حمایت حاصل تھی عوامی لیگ کے تمام تر وسائل اور پورے صوبے میں جذباتی جوش و خروش کی لہر پیدا کر دینے کے باوجود حقیقت کیسی سنگین ہے کہ مشرقی پاکستان کے ۴۳ فیصد ووٹروں نے سرے سے انتخابات میں حصہ ہی



نہیں لیا۔ اس کی صرف ایک توجیہ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ عوامی لیگ کے رضا کاروں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ صرف اُن کے حامی ہی پولنگ سٹیشنوں تک ووٹ ڈالنے پہنچیں۔ اس سے کہیں اہم بات یہ ہے کہ ان کے علاوہ جو لوگ کسی نہ کسی طرح پولنگ سٹیشنوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، اُن کی ۲۵ فیصد تعداد نے عوامی لیگ کے امیدواروں کو ووٹ نہیں دیئے۔

اور شاید ایسا ہی ہوا ہوگا انتخابات نے عوامی لیگ کو قومی اسمبلی میں اکثریتی پارٹی کی حیثیت دلادی۔ قومی اسمبلی میں دوسری بڑی پارٹی مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی تھی جسے ۸۸ نشستیں حاصل تھیں۔ مشرقی پاکستان کی صوبائی اسمبلی میں عوامی لیگ نے ۲۰ میں سے ۲۸۸ نشستیں جیت لی تھیں۔ اس طرح عوامی لیگ قومی اور صوبائی دونوں سطحوں پر غالب اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے ابھری تھی۔

یہ قومی اسمبلی میں اپنی پوزیشن مزید مستحکم بنانے کے لئے کچھ آزاد ارکان اور چھوٹی پارٹیوں کے الگ ہوجانے والے گروپوں کو اپنی طرف راغب کر سکتی تھی۔ قومی اسمبلی کے سامنے سب سے بڑا کام آئین پاکستان کی تشکیل تھا۔ لیگل فریم ورک آرڈر (۱۹۷۰ء کا صدر کا آرڈر ۲) جس کی بنیاد پر الیکشن کراتے گئے تھے اور جسے تمام سیاسی پارٹیوں نے قومی اسمبلی کے لئے ایک مفید رہنما اصول کے طور پر قبول کر لیا تھا اُس کی شق ۲۰ کے مطابق آئین کے بنیادی اصول متعین کئے گئے تھے:-

”۲۔ آئین اس طرح تشکیل دیا جائے گا کہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول اس میں شامل ہوں:-  
(۱) پاکستان وفاقی طرز کی جمہوریت ہوگا اور اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نام دیا جائے گا۔ اس میں صوبے اور دوسرے علاقے جو آج شامل ہیں یا جو بعد ازاں شامل کئے جائیں وہ ایک وفاق میں اس طرح متحد ہوں گے کہ ان کی آزادی، علاقائی سالمیت اور پاکستان کی قومی سالمیت کو یقینی بنایا جائے گا۔ اور کسی بھی صورت میں وفاق کے اتحاد میں رخنہ نہیں پڑے گا۔

(۲) الف) اسلامی نظریہ جو پاکستان کی تخلیق کی بنیاد ہے اسے برقرار رکھا جائے گا اور  
ب) مملکت کا سربراہ مسلمان ہوگا۔



(۲) (الف) جمہوریت کے بنیادی اصولوں سے وابستگی کو یقینی بنانے کے لئے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے براہ راست اور آزادانہ انتخابات آبادی اور حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مقررہ وقفوں کے دوران کرائے جائیں گے۔

(ب) شہریوں کے بنیادی حقوق کا یقین کیا جائے گا اور ان کی ضمانت فراہم کی جائے گی۔

(ج) انصاف کی فراہمی اور بنیادی حقوق کے نفاذ کے لئے عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنایا جائے گا۔

(۴) تمام اختیارات بشمول قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی امور وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اس طرح تقسیم کئے جائیں گے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات۔ تاہم وفاقی حکومت کے پاس بھی مناسب اختیارات ہونے چاہئیں بشمول قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات کے تاکہ وہ اندرونی اور خارجہ معاملات میں اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن ادا کر سکے اور ملک کی آزادی اور علاقائی سالمیت کو برقرار رکھ سکے۔

(۵) ان امور کی ضمانت دی جائے گی کہ

(الف) پاکستان کے تمام علاقوں کے لوگوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ قومی سرگرمیوں میں مکمل طور پر حصہ لے سکیں۔ اور

(ب) قانون سازی اور دوسرے اقدامات کے ذریعے ایک خاص عرصے کے دوران صوبوں اور کسی ایک صوبے کے مختلف علاقوں کے درمیان معاشی اور دوسری تمام ناہمواریوں کو دور کیا جائے گا۔

عوامی لیگ نے اپنے منشور میں چھ نکات یوں بیان کئے تھے :-

پاکستان ایک وفاق ہو گا اور وفاق میں شامل تمام یونٹوں کو مکمل خود مختاری دی جائے گی جس کی بنیاد چھ نکاتی فارمولہ پر رکھی جائے گی۔

(۱) ملک میں وفاقی پارلیمانی طرز حکومت ہوگی جس میں مرکزی قانون ساز ادارے اور وفاق میں شامل یونٹوں کے قانون ساز اداروں کے لئے براہ راست انتخابات عالمی طور پر



مسئلہ حق باطل راستے دہی کی بنیاد پر کراتے جائیں گے۔ مرکزی قانون ساز ادارے میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر دی جائے گی۔

(۲) وفاقی حکومت صرف دفاع اور خارجہ امور کے لئے ذمہ دار ہوگی اور درج ذیل نکتہ (۳) میں دی گئی شرائط کے مطابق کرنسی کی بھی۔

(۳) ملک میں ہر ریجن کے لئے الگ الگ کرنسیاں ہوں گی جنہیں باہم یا آزادانہ طور پر تبدیل کرایا جاسکے گا۔ یا متبادل انتظام کے طور پر ایک کرنسی بھی رکھی جاسکتی ہے بشرطیکہ ایک وفاقی ریزرو سسٹم وضع کیا جاتے جس کے تحت ریجنل فیڈرل ریزرو بنک قائم کئے جائیں جو ایسے اقدامات کریں جن سے وسائل اور سرمایہ کی ایک ریجن سے دوسرے ریجن میں منتقلی کو روکا جاسکے۔

(۴) مالیاتی پالیسی کی تشکیل وفاق میں شامل یونٹوں کی ذمہ داری ہوگی۔ دفاع اور خارجہ معاملات سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لئے وفاق کو مطلوبہ وسائل ہیا کر دیئے جائیں گے اس مقصد کے لئے آئین میں دیتے گئے طریق کار کے تحت تناسب کی بنیاد پر وسائل مرکز کو منتقل ہوتے رہیں گے۔ اس قسم کی آئینی گنجائشیں وفاقی حکومت کو وسائل کی مسلسل فراہمی یقینی بناتے رکھیں گی جن کا مقصد مالیاتی پالیسی پر وفاق میں شامل یونٹوں کی حکومتوں کے کنٹرول کو یقینی بنانا ہے۔

(۵) آئین میں ایسی گنجائشیں بھی رکھی جائیں گی جن کے تحت ہر وفاقی یونٹ کی غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا الگ حساب رکھا جاسکے گا۔ ان حسابات پر متعلقہ وفاقی یونٹ کی حکومت کا کنٹرول ہوگا۔ وفاقی حکومت کی غیر ملکی زرمبادلہ کی ضروریات کو وفاق میں شامل یونٹ پورا کریں گے۔ ان کے حصہ داری کی کاتین تناسب کی بنیاد پر آئین میں دیتے گئے طریق کار کے تحت کیا جائے گا۔

(۶) قومی دفاع میں موثر طور پر شرکت کرنے کے لئے وفاق میں شامل یونٹوں کو رضا کار یا نیم فوجی تنظیمیں قائم کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنا اہم ہے کہ اگرچہ چھ نکات میں وفاقی اور وفاقی پارلیمانی طرز حکومت کی بات کی گئی ہے اور عوامی لیگ کے رہنماؤں نے بار بار اپنی انتخابی تقاریر میں یقین



دلیا کہ وہ پاکستان کو توڑنے کے لئے کوشاں نہیں ہیں اور نہ ہی اس کے اسلامی تشخص کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے باوجود مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کی تحریک پورے شد و مد اور تلخی کے ساتھ جاری رہی۔

نہرا تین گنج میں ۲۱ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمن نے کہا ”چھ نکاتی پروگرام پر عمل کیا جائے گا مگر نہ تو پاکستان کے استحکام اور نہ ہی اسلام کو خطرے میں ڈالا جائے گا“۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے عام انتخابات کو ”عرباتی خود مختاری کے مسئلے پر ریفرنڈم“ قرار دیا۔ ۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو سہٹ میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا ”چھ نکاتی پروگرام کا مقصد علاقائی خود مختاری کے ذریعے مشرقی بنگال کے مفاد کے لئے صرف آئین میں تحفظ حاصل کرنا ہے“۔

۲۱ ستمبر ۱۹۶۰ء کو نہرا تین گنج میں تقریر کرتے ہوئے مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے سیکرٹری جنرل سراج الدین احمد نے یقین دلیا کہ ”چھ نکات پر عملدرآمد کا عملی سلامتی اور یک جہتی کے ساتھ گہرا تعلق ہے“۔ آل پاکستان عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری سٹراے۔ ایچ۔ ایم فرائز نے ۲۱ جون ۱۹۶۰ء کو ارجشاہی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ”مشرقی اور مغربی پاکستان کا باہمی تعلق ناقابل تنسیخ ہے“۔ لاہور میں ۲۷ ستمبر ۱۹۶۰ء کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے غاص طور پر اس بات کی تردید کی کہ ان کی پارٹی پاکستان کو توڑنا چاہتی ہے۔ مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے نائب صدر خوند کرشناں احمد نے ۲۰ مارچ ۱۹۶۰ء کو فیضی کے مقام پر ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوامی لیگ ”ایک مضبوط پاکستان“ کی علمبردار ہے اور مکمل علاقائی خود مختاری ایک مضبوط قوم کی تشکیل میں مدد دے گی۔“

اب ذرا تصویر کے دو سیرے رخ کی ایک دو جھکیاں ملاحظہ ہوں :

۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء کو ہزاری بلخ پارک میں تقریر کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمن مغربی پاکستان کے بعض سیاسی رہنماؤں سے معلوم کرنا چاہتے تھے، جن کے نام بھی انہوں نے لے لئے۔ ”آخر وہ بنگال کی دولت واپس کرنے میں کتنا دقت لیں گے جو انہوں نے اپنے آقاؤں کی مدد سے لٹی تھی“۔ انہوں نے بنگالیوں سے کہا کہ ”وہ اٹھ کھڑے ہوں اور خدا رول اور عوام کا



خون چوسنے والوں سے بنگال کی مقدس سرزمین کو پاک کر دیں۔“

مسٹر تاج الدین احمد نے دھاکہ میں ۱۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا ”گزشتہ کئی برسوں سے بنگالیوں کا خون اور گوشت استھالی اور ڈاکو لگتے رہے ہیں آئندہ انتخابات کے ذریعے ملکی سیاست سے ان کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ ایک روز بعد کپاسیا، دھاکہ میں ایک دوسرے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے اپنے دل کا بوجھ یوں ہلکا کیا: ”مغربی علاقے سے تعلق رکھنے والے استھالی طبقے نے ۲۳ برس تک مشرقی بنگال کا خون چوسا ہے۔ پاکستان کی تاریخ سازش اور ظلم و قسوت کی تاریخ ہے۔“

وسط جنوری ۱۹۷۱ء میں راقم الحروف کو شیخ مجیب الرحمن سے ملاقات کا موقع ملا۔ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ انہوں نے تلخی کے ساتھ بات نہیں کی مگر اپنی مشکلات اور مسائل کو سنجیدگی اور مضبوط ہوجے کے ساتھ پیش کیا۔ میں نے وضاحت کی کہ اگرچہ میں ملک کو درپیش سنگین مسائل کو حل کرنے میں گہری دلچسپی رکھتا ہوں مگر میرے خیالات بے لچک نہیں ہیں اور نہ میں بنیادی طور پر کسی چیز کے خلاف یا حق میں ہوں۔ تاہم فوری طور پر مجھے ان چند ایک معاملات پر ان کی رائے جان کر خوشی ہوگی جو میرے نزدیک اہم ہیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ صوبوں کی جانب سے وفاقی مرکز کو مالی وسائل فراہم کرنے کا طریق کار جس کا چھ نکات میں ذکر کیا گیا ہے بھے وہ حقیقت پسندانہ اور قابل عمل نظر نہیں آتا۔ انہوں نے کہا کہ مرکز کو صوبوں میں ٹیکس لگانے کا اختیار حاصل ہوگا اور ہر صوبے کے محصولات میں مرکز کے ٹیکس سب سے پہلے وصول کئے جائیں گے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ محض زبانی جمع تفریق تھی جس سے اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہ ہوگی۔ نا دہند یا ادائیگی سے انکار کر دینے والے صوبے کے خلاف کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ انہوں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور میں نے اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دیا۔

پھر میں نے کہا کہ سالہا سال تک بیرون ملک رہنے کی وجہ سے میں بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے امیج کے بارے میں تشویش رکھتا ہوں۔ اس کا تعلق زیادہ تر ہر ملک کے حوالے سے اس کی قوت اور استحکام سے کیا جاتا ہے۔ اور ان دونوں عوامل کی ذمہ داری بنیادی



طور پر مرکز پر عائد ہوتی ہے۔ انتخابات کے نتائج نے انہیں (شیخ نجیب الرحمن) مرکز کے لئے ذمہ دار بنادیا ہے۔ نہ تو یہ محض اتفاقیہ تھا اور نہ سرسری تغیر۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں نمائندگی کے لئے دونوں صوبوں کے درمیان پیرٹی کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مشرقی پاکستان قومی اسمبلی میں اب ہمیشہ غلبہ کی پوزیشن میں رہے گا کیا ان کے خیال میں ایک نسبتاً مضبوط مرکز مشرقی پاکستان کے لئے تقویت کا سرچشمہ نہیں ہوگا اور نئے حالات کے مطابق کیا مرکز اس عدم تفاوت کو دور کرنے میں مدد نہیں کرے گا جس کی وہ (شیخ نجیب الرحمن) ہمیشہ شکایت کر رہے ہیں؟ اس کا جواب محض ایک مختصر انگریز مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔

جیسا کہ صدر ریجنل خان نے بار بار زور دے کر کہا تھا۔ میں نے بھی یہ نکتہ اٹھایا کہ آئین قانون سازی کا محض ایک پرزہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے ایک نظام کی حیثیت سے کام کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک اطمینان بخش طریقے سے کام نہیں کر سکتا جب تک اس پر عام طور پر قابل قبول وسیع تر سیاسی سوچ کی مانند کی ٹہر ثبت نہ ہو۔ انہوں (شیخ نجیب الرحمن) نے بظاہر اس سے اختلاف نہیں کیا اور خان عبدالقیوم خان کے سوا ہر قسم کی راستے رکھنے والے سیاسی رہنماؤں سے تبادلہ خیال پر رضامندی ظاہر کی۔ اس استثناء کے بارے میں میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا: عبدالقیوم خان مرکز کا آزاد کار ہے۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ خان عبدالقیوم خان کو بلا لینے سے کسی کام کا خطرے میں نہیں پڑے گا جبکہ انہیں نہ بلانا تکلیف دہ ہوگا اور انہیں بجا طور پر شکوہ رہے گا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ وہ اس معاملے پر مزید غور کریں گے۔

شیخ نجیب الرحمن کے ساتھ ملاقات کے فوراً ہی بعد مجھے ان کے ایک قریبی رفیق کار سے بات کرنے کا موقع ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ شیخ مرکز میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ اگر آئین پر کوئی اتفاق راتے ہو جاتے تو عوامی لیگ مرکز میں حکومت قائم کرے گی مگر شیخ وزارت عظمیٰ قبول نہیں کریں گے۔ میں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو مجھے بتایا گیا کہ شیخ ڈھاکہ چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوں گے کیونکہ وہ اپنی پارٹی کو مزید مستحکم بنانے کے لئے خود کو وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ اس صورتحال نے مجھے وقتی طور پر حیران کر دیا مگر بعد کے واقعات نے اس رویے کی توجیہ پیش کر دی۔



ان ملاقاتوں سے میں نے یہ تاثر لیا کہ چھ ملکات کے معاملے میں شیخ نے مفاہمت کے لیے اپنے ذہن کے دروازے بند نہیں کئے۔ مگر بعد کے تیزی سے رونما ہونے والے واقعات نے باور کرا دیا کہ میں غلطی پر تھا پہلا منفی اشارہ چند ہی روز بعد ایک بڑے پارٹی اجتماع کے دوران ان الفاظ میں دیا گیا: ”مجھ پر اعتماد کیجئے میں انہیں گھنٹوں کے بل گرا دوں گا۔“ یہ بات حیت کرنے کی زبان نہیں تھی۔ یہ مضبوط بازو کا الٹی میٹم تھا۔

۱۳ فروری کو صدر مملکت نے قومی اسمبلی کا اجلاس ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں طلب کیا۔ اس پر سر ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان کیا کہ وہ اور ان کے ارکان پارٹی اس وقت تک اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کریں گے جب تک اکثریتی پارٹی (عوامی لیگ) کی جانب سے دو طرفہ تعاون کے اظہار کے طور پر کوئی یقین دہانی نہیں کرائی جاتی۔ انہوں نے کہا: ”میرا خیال ہے ہم کوئی ایسی قابل عمل صورت نکال سکتے ہیں جو ہم دونوں کو مطمئن کر سکے گی۔ لیکن اگر ہمیں صرف اس لئے ڈھاکہ بلایا جا رہا ہے کہ ہم ایک ایسے آئین کی توثیق کر دیں جو عوامی لیگ پہلے ہی بنا چکی ہے۔ اور جس میں کہیں بھی رتی برابر تبدیلی نہیں کی جاسکتی پھر آپ ہمیں ڈھاکہ میں موجود نہ پاتیں گے۔“ شیخ مجیب الرحمن کے جواب نے مفاہمت کے لئے کوئی گنجائش نہ چھوڑی۔ ۲۱ فروری کو انہوں نے اعلان کیا: ”ہمارا موقف بالکل واضح ہے۔ آئین کی تشکیل چھ ملکات کی بنیاد پر کی جلتے گی۔“

تفصل مکمل ہو چکا تھا۔

یکم مارچ ۱۹۷۱ء کے اپنے بیان کے دوران صدر مملکت نے کہا:۔

”گوشتہ چند ہفتوں کے دوران ہمارے سیاسی لیڈروں کے درمیان کچھ ملاقاتیں ضرور ہوتی ہیں۔ مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتفاق رائے کی بجائے ہمارے کچھ لیڈر سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے ہیں۔ یہ انتہائی بد قسمتی کی بات ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے رہنماؤں کے درمیان سیاسی محاذ آرائی اور بھی افسوسناک صورتحال ہے۔ اس سے قوم پر غم کے ساتھ بڑھ رہے ہیں۔

”مختصر اُصورت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی بڑی سیاسی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی اور کچھ دوسری سیاسی جماعتوں نے اپنے اس غزم کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ



میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کریں گی۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی جانب سے پیدا شدہ کشیدگی کی صفائے پوری صورت حال کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ چنانچہ میں نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا ہے۔

”میں نے بار بار کہا ہے کہ آئین قانون سازی کا ایک عام حصہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اکٹھے رہنے کا معاہدہ ہوتا ہے چنانچہ ایک صحت مند اور قائم رہنے والے آئین کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان آئین سازی میں مناسب شرکت کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ کچھ کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ بادل نخواستہ کیا ہے۔ تاہم کسی بھی شخص کو اس قسم کے مسائل کے حل کے لئے عملی پہلوؤں پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ مغربی پاکستان کے نمائندوں کی اتنی بڑی تعداد کو اسمبلی سے دور رکھ کر اگر ہم ۳ مارچ کے افتاحی اجلاس کا انعقاد کرتے تو اسمبلی خود ہی ٹوٹ کر رہ جاتی اور اس طرح پُر امن انتقال اقتدار کی وہ کوشش جس کا میں قبل ازیں ذکر کر چکا ہوں، یکسر ضائع ہو جاتی۔

”چنانچہ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ سیاسی رہنماؤں کو معقول باہمی انہام و تفہیم کے لئے وقت دیا جاتے جس کی آئین سازی میں ضرورت ہے۔ یہ وقت جو انہیں دیا جا رہا ہے مجھے پوری امید ہے کہ وہ صورت حال کی نزاکت کو سمجھیں گے اور اس مسئلے کو حل کر لیں گے۔ میں پاکستان کے عوام کے ساتھ پختہ تہد کرنا چاہتا ہوں کہ جیسے ہی آئین سازی کے لئے حالات سازگار ہوتے جن کا قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے مجھے اسمبلی کا اجلاس فوراً طلب کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اپنے وطن کے شہریوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اپنے دائرہ اختیار میں ہر وہ کوشش کروں گا جس سے سیاست دانوں کو ہماری مشترک منزل تک پہنچنے میں مدد ملے۔ میں ایسا کرنے میں مکمل انصاف سے کام لوں گا جیسا کہ میں اب تک کرتا آیا ہوں۔“

صدر یحییٰ خان نے سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو مشورہ دیا تھا کہ ”وہ انتخابات اور اسمبلی کے پہلے اجلاس کے درمیان وقفے کو مستقبل کے آئین کی شکلوں پر اتفاق راستے تک پہنچنے کے لئے استعمال کریں۔ اس سے کچھ لو اور کچھ دو کا جذبہ آگے بڑھے گا۔ ایک دوسرے پر



اعتماد میں اضافہ ہوگا اور ہماری تاریخ کے اس انتہائی مرحلے کی اہمیت مزید اجاگر ہوگی۔ انہیں وقت دینے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ۲۵ مارچ کو طلب کیا گیا۔

سٹوڈنٹ انفارمیشن کمیٹی اور مغربی پاکستان سے دوسرے سیاسی رہنما شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ بات چیت کے لئے ڈھاکہ گئے مگر عوامی لیگ انتہائی جارحانہ موڈ میں تھی چھ نکات کے بارے میں شیخ مجیب الرحمن کے لب و لہجہ اور طرز گفتگو سے بھی صورتحال مکمل طور پر بدل چکی تھی۔ انہوں نے امریکا کی ان میں سے ہر نکتہ نئے آئین میں شامل کیا جانا چاہتے تھے اور جن لوگوں کو اس سے اتفاق نہیں وہ جو چاہیں کریں۔ اپنی تقاریر اور جلسے ہاتھ عام میں انہوں نے مشرقی پاکستان کو سنگل وٹس کہنا شروع کر دیا اور اب ان کی زبان پر پاکستان کو مضبوط بنانے اور اس کے اتحاد کو برقرار رکھنے کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

لیڈروں کے درمیان گفتگو بے نتیجہ رہی۔ شیخ مجیب الرحمن نے مزید بات چیت یا صدر سے ملاقات کرنے کے لئے مغربی پاکستان آنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے صدر پاکستان کو پیغام بھیجا کہ اگرچہ نکات جوں کے توں قبول نہ کئے گئے تو خون کی ندیاں بہا دی جائیں گی۔ صدر نے یکم مارچ ۱۹۷۱ء کے اپنے خطاب میں ”ہندوستان کی جانب سے پیدا کی گئی جس

عمومی کشیدہ صورتحال کا ذکر کیا تھا اس کا ایک پہلو مختصر وضاحت کا طالب ہے۔ ۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو انڈین ایئر لائنز کا ایک فوکر فریڈ شپ جہاز جو بھری نگر سے دہلی جا رہا تھا اُسے اُس کے دو مسافروں نے اغوا کر لیا۔ جہاز کو لاہور کے ہوائی اڈے پر اتار لیا گیا۔ اس نے حکومت پاکستان کو ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا۔ ہائی جیکروں نے اپنا تعلق آزادی کشمیر کی تحریک سے بتایا۔ اُن کے اس عمل سے لاہور کے عوام میں شدید جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ہائی جیکروں نے جہاز کو چھوڑنے سے انکار کر دیا تاہم انہیں ترغیب دے کر مسافروں اور ملے کو رہا کر کے لاہور کے بہترین ہوٹل میں رکھا گیا۔ انہیں ہندوستان واپسی سے قبل بہترین خوراک اور طبیعت وغیرہ فراہم کئے گئے۔ بعد ازاں ان میں سے متعدد افراد نے پاکستان میں اپنی دیکھ بھال اور ہمان نوازی کے لئے حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا۔

”بھارتی ہائی کشنر کو اس واقعہ سے آگاہ کیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ حکومت پاکستان



طیارے کی بحفاظت واپسی کے لئے کوششیں کر رہی ہے اور یہ کہ اگر وہ چاہے تو موقع پر اپنا ایک نمائندہ بھیجا سکتا ہے۔ مگر اس دوران میں دونوں ہائی جیکر مقبول عام سپروڈ کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا — اُن میں سے ایک ہمہ وقت جہاز میں رہا — اور سیاسی پناہ کی درخواست کی۔ چونکہ حکومت پاکستان نے مقبوضہ کشمیر پر بھارتی قبضے کو تسلیم کرنے سے سسل انکار کیا تھا اور چونکہ اس کے نزدیک کشمیری ہندوستان کے باشندے نہ تھے۔ اس لئے ہائی جیکروں کی درخواست منظور کر لی گئی۔

”اس اقدام نے اور اس کے پس پردہ کارفرما وجوہ نے ہندوستان کی دکھتی رنگ کو چھڑوایا۔ ہندوستانی اخبارات اور رائے عامہ کی جانب سے اس کا فوری اور تلخ رد عمل ہوا۔ اس تمام تر واقعہ کے لئے پاکستان کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر اور اُن کے عملے کے اہلکار کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اور پاکستان کے خلاف بے ہنگم ہجوم نے ہنگامے شروع کر دیئے۔ ہندوستان میں جذبات اس وقت اور بھی بھرپور اُٹھ چکے تھے جب ہائی جیکروں نے طیارے کو واپس بھیجنے کی کوششوں کے عین درمیان اُسے دھماکے سے اڑا دیا۔ ہندوستانی حکومت نے اعلان کیا کہ جہاز کو تباہ کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات بحیرہ نظر انداز کر دی گئی کہ ہائی جیکر نے پاکستانی تھے اور نہ ہندوستانی۔ اس لحاظ سے وہ کسی بھی طرح کی ذمہ داری نہ تھے۔ مگر حکومت ہندوستان نے جہاز کے معاوضے کی ادائیگی کا مطالبہ کر دیا اور حکومت پاکستان کی جانب سے کسی جواب کا انتظار کئے بغیر مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان سول اور فوجی دونوں قسم کے پاکستانی جہازوں کی ہندوستانی علاقے پر سے پروازوں پر پابندی عائد کر دی۔ حکومت پاکستان نے بین الاقوامی کنونشن کی اس صریح خلاف ورزی پر شدید احتجاج کیا اور دونوں ہائی جیکروں کو ہندوستان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں وہ دونوں ہندوستان کے شہری نہیں تھے۔ انہوں نے مصالحت کی نیت سے کسی معقول سمجھوتے پر پہنچنے کی پیشکش کی مگر ہندوستان نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ پاکستانی شہریوں کے خلاف معاندانہ مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا اور ہندوستانی علاقے پر سے پاکستانی پروازوں کے گزرنے پر پابندی بدستور قائم رہی۔ احمد آباد اور بڑودہ میں مسلم کش



فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے۔

”مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مواصلات کے اس اہم رابطے کی تیسخ سے زیادہ شاید ہی کوئی چیز شیخ مجیب الرحمن کے لئے سازگار ہو سکتی تھی جس کے بعض پیر و کار اور شاید وہ خود بھی مرکزی حکومت کو بری طرح کمزور کر دینے کے لئے کام کر رہے تھے۔“

(دی الیٹ پاکستان ٹریبونل، صفحہ ۵۰-۵۱)

جب مغربی پاکستان میں پیدا ہونے والا جوش و خروش کم ہوا تو راستے عامر نے سوچا شروع کیا کہ طیارے کا اغوا اور اس کے نتیجے میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان فضائی رابطے میں تعطل کیا واقعی خود بخود ہوا تھا۔ اس قیاس آرائی کو مسٹر جے پرکاش نارائن کے نام شیخ عبداللہ کے خط سے بھی تقویت ملی جو نئی دہلی کے ”انڈین ایکسپریس“ نے ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء کو شائع کیا۔ اس خط میں شیخ عبداللہ نے لکھا:-

”بد قسمتی سے حالیہ واقعات نے برصغیر کے درمیان ملکوں کے درمیان پہلے ہی سے کشیدہ تعلقات کو اور بھی خراب کر دیا ہے۔ یہ کہانی بہر حال طیارے کے اغوا اور اسے تباہ کر دینے پر ختم نہیں ہوتی۔ اہم سوال یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر عائد کی جانی چاہیے۔ اس واقعہ کے بعد ذمہ دار حلقوں کے ذریعے ہونے والے انکشافات نے میرے ذہن میں اور شاید دوسرے بہت سے لوگوں کے ذہن میں بھی ان ایجنسیوں کے متعلق کئی کہانیوں کو جنم دیا ہے جو اس واقعہ کی ذمہ دار ہیں۔ تاہم یہ بات بڑی حد تک صاف ہے کہ ہائی جیکروں کا سرغنہ بھارتی بارڈر سیکورٹی فورس کا ملازم تھا۔ وہ یقیناً طور پر سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہوا تھا جہاں اُس نے طیارے کے اغوا کی تربیت حاصل کی تھی۔ جنگ بندی لاتن عبور کر کے اس طرف آنے کے بعد بھارتی سیکورٹی فورس نے اسے دوبارہ ملازمت میں لے لیا تھا اور اس کی ڈیوٹی ایئر پورٹ پر بھارتی اخباروں کے مطابق بظاہر اس مقصد کے لئے لگائی گئی تھی کہ وہ جہازوں کے اغوا کو روکنے کے لئے دہشت گردوں کی کارروائیوں پر نظر رکھے۔ ہائی جیکر نے اپنے محکمے کے حکام کو طیارے کے اغوا کے اندیشے سے آگاہ کیا تھا۔ یہ اطلاع حکومت کشمیر کو اس ایجنسی نے دے دی تھی جس کے تحت ہائی جیکر کام کرتا تھا۔ کشمیر پولیس اس شخص سے تفتیش



کرنا چاہتی تھی مگر کشمیر کے وزیر اعلیٰ مسٹر صادق کے مطابق اس ایجنسی نے اس شخص کی نشاندہی کرنے یا اسے تفتیش کے لئے کشمیر پولیس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار وہ شخص اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ اور بارڈر سیکورٹی فورس کی اطلاع کے مطابق جہاز میں سوار ہو گیا اور طیارے کو بروستی لاہور میں اتار کر اپنا مشن پورا کر لیا۔

ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان کے اوپر سے پروازوں کی بندش سے شیخ مجیب الرحمن اور عوامی لیگ کو اس بات کی یقین دہانی مل گئی کہ مشرقی پاکستان میں موجود پاکستانی افواج اپنی پوزیشن مزید مستحکم بنانے کے قابل نہیں رہیں۔ شاید یہی صورت حال مغربی پاکستانی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کے دوران شیخ مجیب الرحمن کے سخت رویے کا باعث بنی اور اس نے کھلم کھلا وہ مؤقف اختیار کیا جو پورے سال ۱۹۷۰ء کے دوران اس کا مطمح نظر رہا تھا۔ یعنی چھ نکات یا پھر کچھ بھی نہیں ۲ مارچ ۱۹۷۱ء سے شروع ہونے والے واقعات نے کسی شک و شبہ کے بغیر ثابت کر دیا کہ کچھ نکات کو مکمل عملیہ گی اور اپنے راستے الگ کرنے کی کوششوں پر محض پردہ ڈالے رکھنے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا جس کے لئے اسلحہ کی خریداری سمیت ایک طویل عرصہ سے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس کے اتوار نے شیخ مجیب الرحمن کو وہ موقع فراہم کر دیا جس کا اُسے انتظار تھا۔ اگلے روز اس نے ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا اور اس کے نتیجے میں تمام سرکاری اور عام نظم و نسق قائم کرنے والی مشینری اور اس کی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں۔ سوائے ان سرگرمیوں کے جنہیں عوامی لیگ اپنے مقاصد کے لئے جاری رکھنا چاہتی تھی۔ ہڑتال سے پورے صوبے میں عوامی لیگ کا راج نافذ ہو گیا اور اس کے کارکن ان تمام عناصر پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے جو پورے جوش و خروش کے ساتھ عوامی لیگ کی پالیسیوں سے متفق نہیں تھے۔

۴ مارچ کو شیخ مجیب الرحمن نے ایک ہفتے پر محیط ”غیر تشدد اور عدم تعاون کی تحریک“ کو جاری رکھنے کا اعلان کیا جب تک کہ مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ یعنی مارشل کا فوری خاتمہ اور اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کرنا۔ یہ تحریک ۲ مارچ سے شروع ہو چکی تھی پر وگرام حسب ذیل تھا:۔  
(۱) ٹیکس دانہ کرنے کی ہم جاری رہے گی۔



(۲) سیکریٹریٹ، سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر، ہائی کورٹس اور پورے بنگلہ دیش کی دوسری تمام عمارتوں میں ہڑتال رہے گی۔ اس سلسلے میں مناسب متشنیات کا اعلان وقتاً فوقتاً کیا جائے گا۔

(۳) ریویوے اور بندرگاہیں کام کر سکتی ہیں مگر ریویوے اور بندرگاہوں پر کام کرنے والے لوگ عوام کے خلاف استعمال کی جانے والی افواج پاکستان کی نقل و حمل کی صورت میں تعاون نہیں کریں گے۔

(۴) ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات ہمارے بیانات کے مکمل متن شائع کریں گے۔ عوام کی تحریک سے متعلق خبروں کو دیا یا نہیں جائے گا۔ ورنہ ان اداروں میں کام کرنے والے بنگالی تعاون نہیں کریں گے۔

(۵) صرف مقامی اور بین الاضلاع ٹرنک ٹیلی فون مواصلاتی کام کریں گے۔

(۶) تمام تعلیمی ادارے بند رہیں گے۔

(۷) بینک مغربی پاکستان کو سٹیٹ بینک یا کسی دوسرے ذریعے سے رقم منتقل نہیں کریں گے۔

(۸) تمام عمارتوں پر روزانہ سیاسی جھنڈے لہراتے جائیں گے۔

(۹) دوسرے تمام شعبوں میں ہڑتال کا اعلان واپس لیا جاتا ہے مگر صورتحال کے مطابق مکمل ہڑتال کا اعلان کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے۔

(۱۰) مقامی عوامی لیگ تنظیموں کی قیادت میں ہریوین، محلہ، تھانہ، سب ڈویژن اور ضلع میں ایک ایک سنگرام پریشد (ہیڈ کوارٹر) قائم کی جائے گی۔

سنگین سزاؤں کی دھمکی دے کر عوامی لیگ کے رضا کاروں نے اس پروگرام پر مکمل طور پر عملدرآمد کر لیا۔ عمل کوئی مزاحمت یا عدم تعمیل نہیں ہوتی۔ ذرا سوچیں کہ ایک سیاسی پارٹی کے رہنما کی جانب سے جاری کردہ ہدایات پر عملدرآمد کرتے ہوئے بینک قانون کے تحت اپنے گاہکوں کے لئے خدمات انجام دینے میں ناکامی سے دوچار تھے اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھے۔ یہ تھی دہشت کی وہ فضا جو عوامی لیگ کے مسلح رضا کاروں نے پیدا کر رکھی تھی کہ اپنے قانونی فرائض کی ادائیگی کے لئے بھی کوئی پارٹی کے



احکامات کی عدم تعمیل کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

۸ مارچ کو مشرقی پاکستان عوامی لیگ کے سیکرٹری جنرل مسٹر تاج الدین نے شیخ مجیب الرحمن

کے احکامات کے مطابق کم و بیش پندرہ مستثنیات اور روضا حوتوں کا اعلان کیا :-

۱۲ مارچ کو اس سلسلے میں ایک بیان جاری کیا :- "۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے مندرجہ ذیل

احکامات کے مطابق پروگرام آف ایکشن کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس کی رو سے تمام گزشتہ احکامات، مستثنیات اور روضا حوتوں پر حسب ذیل احکامات کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اور اس کے بعد بنفیس احکامات کا اعلان کیا گیا جن میں تمام تر سرکاری اور عوامی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا تھا :-

\_\_\_\_\_ حکومتی ادارے

\_\_\_\_\_ تعلیمی ادارے

\_\_\_\_\_ امن عامہ کا نفاذ

\_\_\_\_\_ بندرگاہیں بشمول اندرون ملک بندرگاہیں

\_\_\_\_\_ درآمدات

\_\_\_\_\_ ریلوے

\_\_\_\_\_ روڈ ٹرانسپورٹ

\_\_\_\_\_ اندرون ملک آبپاشی پورٹ

\_\_\_\_\_ اجرتوں کی ادائیگی

\_\_\_\_\_ بینشزر

\_\_\_\_\_ بینک

\_\_\_\_\_ ایئر پورٹ (مشرقی پاکستان) اور غزائر

\_\_\_\_\_ سٹیٹ بینک

\_\_\_\_\_ کنٹرول درآمدات و برآمدات

\_\_\_\_\_ ٹریول ایجنٹس اور غیر ملکی فضائی کمپنیاں

\_\_\_\_\_ آگ بجھانے والے ادارے

\_\_\_\_\_ میونسپل کمیٹیاں



\_\_\_\_\_ ٹیکس ادا نہ کرنے کی مہم  
\_\_\_\_\_ پاکستان انشورنس کارپوریشن اور دوسری انشورنس کمپنیاں  
\_\_\_\_\_ نجی تجارتی اور صنعتی تنظیمیں اور دکانیں  
\_\_\_\_\_ سیاہ جھنڈے  
\_\_\_\_\_ سنگرام پریشد۔

سنگرام پریشد سے متعلق حکم میں کہا گیا تھا۔

”سنگرام پریشد کو تمام سطحوں پر پوری قوت اور توانائی کے ساتھ کام کرنا ہوگا اور وہ تمام ضروری اقدامات کرنا ہوں گے جن کے ذریعے ان احکامات اور اسی قسم کے وقتاً فوقتاً جاری کئے جانے والے مزید احکامات پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔“

۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو عوامی لیگ کی جانب سے ان احکامات سے متعلق وضاحتوں کا ایک مجموعہ جاری کیا گیا۔ یہ سب کچھ صدر پاکستان کے اس واضح اعلان کے باوجود کیا گیا جو ۶ مارچ کو جاری کیا گیا اور جس کے تحت قومی اسمبلی کا اجلاس ۲۵ مارچ کو طلب کیا گیا تھا۔ صدر مملکت نے ۶ مارچ کو اپنے بیان میں کہا تھا۔

”بعض وجوہ کی بناء پر اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ میں التوا کو کیس غلط سمجھا گیا ہے۔ ایسا جان بوجھ کر سمجھا گیا ہے یا کسی اور وجہ سے اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر ایک بات یقینی ہے۔ یہ غلط فہمی انتشار کی قوتوں کے اجتماع کا مظہر بن گئی ہے جب اس قسم کی قوتیں سرگرم ہو جائیں تو بے گناہ شہریوں کو ان کے ہاتھوں تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کی روزمرہ کی زندگی بڑی طرح متاثر ہوتی ہے اور جنہیں مستقل طور پر جسمانی نقصان یا موت کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اس بات کو محسوس کرنے کے باوجود کہ مناسب قوت کے استعمال سے اس طرح کی صورتحال کو قابو میں لایا جاسکتا ہے میں نے جان بوجھ کر مشرقی پاکستان میں حکام کو لوٹ مار، آتشزدگی اور قتل و غارت کے ذریعے قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف ممکنہ حد تک کم سے کم طاقت استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔“

مغربی پاکستان میں سیاسی رہنماؤں کے ساتھ بات چیت کے کئی اذراء کے بعد صدر مملکت



۱۵ مارچ کو ڈھاکہ پہنچے اور سیاسی تعطل کے خاتمے کے لئے شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ کئی ملاقاتیں کیں۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ شیخ مجیب الرحمن کے ساتھ ان کی گفتگو میں پیش رفت ہوتی ہے صدر نے مغربی پاکستان سے سیاسی رہنماؤں کو ڈھاکہ بلایا اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ جو ۲۱ مارچ کو ڈھاکہ پہنچے تھے کئی ملاقاتیں کیں۔ دوسرے مغربی پاکستانی سیاستدانوں کے ساتھ بھی صدر نے ڈھاکہ میں ملاقاتیں کیں۔ اگرچہ بہت سی تجاویز اور جوابی تجاویز زیر بحث آئیں اور صدر مملکت نے ہر ممکنہ حد تک شیخ مجیب الرحمن کے نقطہ نظر کو تسلیم کر لینے پر رضامندی کا اظہار بھی کیا مگر بات چیت نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ شیخ مجیب الرحمن کا اصرار تھا کہ اسمبلی کے اجلاس سے پہلے مارشل لا اٹھایا جائے گا۔ اس کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس دو حصوں میں ہونا چاہیے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوں اور انہی اجلاسوں کے دوران ہر حصے کے لئے آئین تشکیل دیا جائے۔ یہ دونوں حصے کنفیڈریشن کے ذریعے باہم مربوط ہوں۔ شیخ مجیب الرحمن کے ان مطالبات کو ناقابل قبول اور کچھ فیصلی پر مبنی سمجھا گیا خاص طور پر امن و امان کی بحالی کے نقطہ نظر سے۔ اس گفتگو کے بغور مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شیخ مجیب الرحمن اور عوامی لیگ کی قیادت میں شامل اُن کے رفقاء ملک کے دونوں صوبوں کے درمیان مکمل علیحدگی سے کم کسی بات پر رضامند نظر نہیں آتے تھے خواہ اس علیحدگی کو کوئی بھی نام کیوں نہ دیا جائے۔

عوامی لیگ کے رہنماؤں نے ایک اعلامیہ کا مسودہ پیش کیا تھا جو دراصل ان کی جانب سے آئین کا مسودہ تھا۔ یہ دستاویز حکومت پاکستان کے مشرقی پاکستان میں بحران کے بارے میں قرطاس ابیض کے اضافہ "ای" کے صفحات ۴۷، ۵۹ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اس موضوع پر عوامی لیگ کی جانب سے حرف آخر تھا اور مغربی پاکستانی رہنماؤں کے لئے ہرے سے ناقابل قبول تھا۔ اس لئے تعطل کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

اس دوران ۲ مارچ کے بعد مشرقی پاکستان میں وائس حکمران ادارہ صرف عوامی لیگ تھی۔ یہ متوازی حکومت پہلانے کا معاملہ بھی نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان میں صرف عوامی لیگ کی حکمرانی تھی۔



صدر پاکستان نے ۲۶ مارچ کو اس کی وضاحت اس طرح کی تھی :-

”میں شیخ مجیب الرحمن کے خلاف کئی ہفتے پہلے کا رد وائی کر چکا ہوتا مگر میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کر دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے پُر امن انتقال اقتدار کے منصوبے کو کوئی خطہ لاحق نہ ہونے پاتے۔ اور میں نے صدر محال کو اسی انداز سے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے میں نے بعد دیگرے لاقانونیت کے کئی اقدامات کو برواشت کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں نے کسی معقول حل تک پہنچنے کے لئے حل کی تلاش کر دیکھی۔ میں پہلے ہی ان کوششوں کا ذکر کر چکا ہوں جو میں اور کئی سیاسی رہنما شیخ مجیب الرحمن کو معقولیت کی طرف لانے کے لئے کر چکے ہیں۔ ہم نے اس مقصد کے لئے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ مگر وہ کسی بھی لحاظ سے تعمیری رد عمل کا اظہار کرنے سے قاصر رہا ہے۔ دوسری جانب وہ اور اس کے پیروکار بری ڈھاکہ میں موجودگی کے دوران بھی حکومت کے احکامات کی خلاف ورزیاں کرتے رہے ہیں۔ اعلامیہ جو اس نے تجویز کیا وہ محض ایک جال تھا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی حیثیت اس کا غذبہ بنی بھی نہیں ہے جس پر اُسے لکھا گیا ہے۔ مارشل لا اٹھائے جانے کے بعد پیدا ہونے والے خلا کے دوران وہ بلا خوف و خطر جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کی بے جا ضد، ہٹ دھرمی اور معقولیت کی بات کرنے سے صریح انکار سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا جاسکتا ہے کہ یہ شخص اور اس کی پارٹی پاکستان کے دشمن ہیں اور وہ مشرقی پاکستان کو ملک سے مکمل طور پر الگ کر دینا چاہتے ہیں۔“

میں نے ۶ مارچ کو اپنے خطاب کے دوران آپ سب کو بتایا تھا کہ پاکستان کی سالمیت، یک جہتی اور سلامتی کو برقرار رکھنا مسلح افواج کا فریضہ ہے۔ میں نے افواج پاکستان کو اپنا فرض ادا کرنے اور حکومت کی بالادستی کو مکمل طور پر بحال کرنے کے احکامات جاری کر دیئے ہیں۔

المیہ اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔







ماضی پر ایک نظر ڈالیں تو ایسا لگتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان نے اگرچہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی درخواست پر اقتدار سنبھالا تھا مگر اس نے ایک ایسی ذمہ داری قبول کی تھی جس کو پورا کرنے کے لئے وہ موزوں نہ تھا۔ وہ اول تا آخر ایک سپاہی تھا اور ایک سپاہی کے تعلقات کی حدود سے باہر اس کے شاذ ہی کسی سے کوئی روابط تھے۔ اس صورتحال میں آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کو اس شخص کے انتخاب کے لئے صحیح مشورہ نہیں دیا گیا جسے پاکستان کی کشتی کو منجھدار سے باہر نکال لے جانے کی ذمہ داری سونپی جا رہی تھی۔ جس کی جانب یہ بظاہر نہایت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ شاید اُس کے پاس کوئی تبادلہ نہیں تھا۔ وجہ خواہ کچھ بھی تھی امکانات بہت محدود تھے اور المیہ کا خوفناک انجام ناگزیر بن چکا تھا۔

تاہم جنرل یحییٰ خان کو مقصد کے ساتھ دیانت داری کا کریڈٹ ضرور جاتا ہے۔ ہر مرحلے پر اُس نے اپنی تشویش کا عملی ثبوت فراہم کیا کہ معمول کا آئینی عمل موثر ہونا چاہیے۔ اسے کم از کم اپنی کچھ خامیوں کا احساس ضرور تھا اور شاید وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ اسے محض اختیارات کے استعمال کی غرض سے اقتدار سے چٹے نہیں رہنا چاہیے۔ اختیارات کا دانشمندانہ استعمال ریاست کے تمام اداروں کی معمول کے مطابق کارکردگی کی بحالی کے لئے ناگزیر تھا۔ اچھے عزائم بذاتِ خود ناکافی ثابت ہوتے۔

وسط مارچ ۱۹۷۱ء تک سیاسی صورتحال ناقابلِ اصلاح حد تک خراب ہو چکی تھی صاف نظری اور انتہائی جرات ہی سے اس سنگین ایسے سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی جس کے پیش آنے کے آثار ۱۹۶۴ء کے اوتار ہی میں نظر آنے لگے تھے مگر انیسویں ان دونوں اوصاف کی کیسر کی تھی۔



۲ مارچ سے انتظامیہ کا معمول کا کام شیخ مجیب الرحمن اور اس کی عوامی لیگ نے عارضی طور پر سنبھال لیا تھا۔ کوئی شخص جو عوامی لیگ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چلتا تھا یا جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر رہا تو وہ خود کو سنگین خطرے میں ڈال رہا تھا۔ جنرل یحییٰ خان ابھی تک اس امید کا دامن تھا ہے ہوتے تھا کہ اس کا ”پُر امن انتقال“ اقتدار کا منصوبہ شاید کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔ مگر مشرقی پاکستان میں قانون کی حکمرانی قائم کرنے میں ناکامی اور شہرپوں کے جان و مال کے تحفظ کی بحالی میں ناکامی سے اس نے ”پُر امن انتقال“ اقتدار“ کا یہ موقع ضائع کر دیا۔ شیخ مجیب الرحمن کی جانب سے اقتدار پر ناجائز طور پر قبضہ کرنے کے بعد ۲ مارچ سے انتظامیہ کی معمول کی مشینری ناکام ہو کر رہ گئی۔ ۲ مارچ سے شروع ہونے والے تین ہفتوں کے دوران ”پاکستان کی سلامتی، استحکام اور علاقائی سالمیت“ دشمن افواج کے قبضے سے پیدا ہونے والی صورتحال سے بھی بدتر اور تباہ و برباد ہو کر رہ گئی۔ حکومت کی اتھارٹی بڑی طرح متاثر ہو چکی تھی اور اس کی بحالی کے امکانات تقریباً معدوم ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس مرحلے پر جنرل یحییٰ خان نے ۲۵ مارچ کو مسلح افواج کو ”اپنے فرائض ادا کرنے اور حکومت کی اتھارٹی بحال کرنے کا حکم دیا۔ مسلح افواج کو ایک ایسی چیز کی بحالی کا حکم دیا گیا تھا جو دم توڑ چکی تھی اور دوبارہ زندہ ہونے کے قابل نہ رہی تھی۔

۲۵ مارچ تک جنرل یحییٰ خان کو اس بات کا پوری طرح احساس نہیں تھا جبکہ اس کے سوا ہر شخص اس بات سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا کہ عوامی لیگ اور اس کے رہنما دشل لاد کے اٹھنے کا انتظار کتنے بغیر جو چاہتے تھے بلاروک لوگ کر رہے تھے اور ان کا سیاسی مقصد مغربی پاکستان بے مکمل علیحدگی اختیار کرنا بن چکا تھا۔ جنرل یحییٰ خان کو انتہائی مشکل اور پیچیدہ صورتحال کا سامنا تھا۔ بلاشبہ اُس کا اولین فریضہ امن و امان کی بحالی تھا جسے مارچ کے اوائل ہی سے بڑی طرح نظر انداز کیا گیا۔ جیسا کہ اس نے اپنے ۶ مارچ کے بیان میں کہا کہ ”اس نے جان بوجھ کر قانون شکنی، لوٹ مار اور قتل و غارت کرنے والوں“ کے خلاف محدود اور کم سے کم طاقت استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ مقصد بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا اور عوامی لیگ کے رضا کار اپنی مرضی کے مطابق اتھارٹی کے نام پر بے قابو ہو گئے تھے اور جس کی حدود کا



آغاز وقتاً فوقتاً جاری کئے جانے والے مختلف اعلانات اور ہدایات میں گول مول الفاظ میں اور وسیع پیمانے پر کردیا گیا تھا۔ جب سٹیج افراج کو اپنا فرض ادا کرنے اور حکومت کی بالادستی کو مکمل طور پر بحال کرنے کے اختیارات دیئے گئے تو یہ کام ان کے بس سے باہر ہو چکا تھا۔

مگر جنرل یحییٰ خان اور اس کے افسروں کو درپیش یہ واحد مسئلہ نہیں تھا۔ اس وقت تک جنرل یحییٰ خان کا دماغ مکمل طور پر مایوسی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس نے خود کو ایسی پوزیشن میں دھکیل دیتے جانے کا موقع فراہم کیا تھا کہ اب اس کے لئے راہ فرار اختیار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ۲۵ مارچ تک اسے احساس ہو جانا چاہیے تھا کہ نہ صرف شیخ مجیب الرحمن اور اس کی پارٹی ملک سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے بلکہ انہوں نے حالات پر اس طرح سے غلبہ حاصل کر لیا تھا کہ وہ لوگ جو عوامی لیگ سے متفق نہیں تھے انہیں مکمل طور پر زیر کیا جا چکا تھا اور یہ کہ مشرقی پاکستان میں آواز اٹھانے والا طبقہ شدت سے عوامی لیگ کا حامی بن چکا تھا اور یہ لوگ مکمل علیحدگی سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے۔ یہ حالات کی وہ صورت تھی جس کی اصلاح ملٹری ایکشن سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس قدر تاخیر سے کیا جانے والا ملٹری ایکشن امن و امان کی بحالی تک محدود رہنا چاہیے تھا۔ اور یہ بلا تفریق اور بلا امتیاز کیا جانا چاہیے تھا۔ سٹیج افراج اور عوام دونوں پر واضح ہونا چاہیے تھا کہ ملٹری ایکشن کا واحد مقصد جس تک یہ ایکشن سختی کے ساتھ محدود رہے گا، یہ تھا کہ پُر امن حالات بحال کئے جائیں تاکہ آئینی مسئلے کا کوئی ایسا حل نکالا جاسکے جو پاکستان کے دونوں حصوں کے لوگوں کے لئے قابل قبول اور قابل عمل ہو۔ اور یہ کہ کوئی ایسی کوشش نہ کی جلتے جو ایک فریق کے حق میں یا دوسرے کی مخالفت میں جاتی ہو یا یہ کہ کسی فریق کو کوئی ایسا طریق کار قبول کرانے کے لئے فوج جانیبداری سے کام نہیں لے گی جسے قبول کرنے یا جس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لئے لوگ تیار نہ ہوں۔

اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان کے لوگ علیحدگی پر اصرار کریں تو پُر امن حالات کی بحالی کے بعد علیحدگی کا عمل شروع کیا جائے گا اور اسے قابل عمل بنایا جائے گا۔ اگر اس قسم کا حکم واضح طور پر جاری کر دیا جاتا۔ اس کی ملک کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر تشہیر کر دی جاتی اور اسے سختی کے ساتھ نافذ کر دیا جاتا تو اس ایسے کے بہت سے المناک



اور افسوسناک پہلوؤں پر بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا تھا جن میں ملک بڑی حد تک بھینس چکا تھا۔ یہ راستہ اختیار کرنا آسان نہ ہوتا اور شاید جنرل یحییٰ خان اپنے بچاؤ کے نقطہ نظر سے اس کو اختیار کرنے میں کسی بھی حالات میں راضی نہ ہوتے۔ اس کے لئے ان کے ذہن سے زیادہ واضح، مضبوط اور مستحکم ذہن کی ضرورت تھی جو صورت حال کی مرکزی حقیقت کا ادراک کر سکتا جس کا غلط یا صحیح، اچھا یا بُرا تھی سے قطع نظر مشرقی پاکستان کے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت نے فیصلہ کرتے ہوئے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور یہ کہ جس موڈ کے تحت انہوں نے کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس میں وہ بربادی کے راستے کو آئینی تعلق پر ترجیح دیتے۔ جبکہ جنرل یحییٰ خان، اس کے مشیر اور مغربی پاکستان کے رہنما شاید مؤرخانہ ذکر پر اصرار کرتے۔ یہاں یہ کہنا بے مقصد ہو گا کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان مکمل علیحدگی لیگل فریم ورک آرڈر کی خلاف ورزی ہوتی۔ بلکہ اس کا مختصر جواب یہ ہو گا کہ حالات کے دھارے نے جو رخ اختیار کیا وہ اس صورتحال سے یکسر مختلف تھا جس کے لئے لیگل فریم ورک آرڈر بنایا گیا تھا اور اس طرح یہ آرڈر غیر متعلق ہو کر رہ گیا تھا۔ آرڈر کے تحت بنیادی مفروضہ پاکستان کے دونوں حصوں کے عوام کی آئینی تعلق کے حوالے سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی مشترک خواہش تھی۔ جب اس خواہش نے اس تصور کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو فریقین کا ایک آئینی یوین کے تحت رہنے کا موڈ اور رویہ دونوں ختم ہو جاتیں گے۔ اور مشرقی پاکستان کے معاملے میں ایسا ہو چکا تھا۔ اس ناگوار اور ناپسندیدہ حقیقت کو تسلیم کرنے میں ناکامی اس ایلتے کا مرکزی نقطہ تھی۔

ذرا تصور کیجئے کہ ایک ناگوار صورتحال پیدا ہو چکی تھی اور مغربی پاکستان کے لوگوں نے مثبت یا منفی وجوہ کی بنیاد پر، اچھے یا بُرے عزائمات کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان آئینی شرکت کو ختم کرنے سے متعلق اپنے ذہنوں میں ناقابلِ تسخیر تصورات کو بنایا تھا۔ کیا کوئی دلیل، وکالت یا آئینی نظریہ یا اصول جسے مشرقی پاکستان کی جانب سے پیش کیا جاتا مغربی پاکستان کو اس امر سے باز رکھ سکتا تھا کہ وہ اس بوجھ کو اُٹار کر رکھ دے جسے اس کے لوگ بہت بھاری سمجھنے لگے تھے؟



مشرقی اور مغربی پاکستان کے باہمی تعلق میں دو اہم عوامل کو کسی بھی حقیقت پسندانہ جائزے کے دوران نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ ایک ان کا جغرافیائی محل وقوع ہے (جن کے درمیان ایک ہزار میل کا ہندوستانی علاقہ قائل ہے) جس پر مستزاد مشرقی پاکستان کی ہندوستانی جنگل کے ساتھ قریبی ثقافتی اور لسانی ہم آہنگی ہے۔ دوسری حقیقت مشرقی پاکستان کا زیادہ گنجان آباد ہونا ہے مغربی پاکستان کے ساتھ اس کی نسبت ۱ کے مقابلے میں تقریباً ۷ کے ہے جس کے باعث ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں اسے وفاق پاکستان کی قومی اسمبلی میں مغربی پاکستان کی نسبت زیادہ نمائندگی حاصل ہو گئی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان کا رتبہ (۲۱۶ ہزار مربع میل) مشرقی پاکستان (۲۵۴ ہزار مربع میل) کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ مزید برآں آزادی کے موقع پر مغربی پاکستان کئی لحاظ سے مشرقی پاکستان کی نسبت کہیں زیادہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ مگر یہ عوامل دونوں حصوں کے درمیان تعلقات کی مضبوطی کا باعث بننے کی بجائے تعلقات کی راہ میں حائل ہو کر رہ گئے۔

حالیہ آئینی مباحثے میں اس بات کی یاد دہانی کراتی جانے لگی ہے کہ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے قرارداد لاہور میں مطالبہ کیا تھا کہ ”وہ علاقے جن میں مسلمان عذوی اکثریت میں ہیں جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں۔ تو انہیں آزاد مملکتوں کے قیام کے لئے گروپ بنانے چاہئیں جن کے تحت گروپوں میں شامل یونٹ خود مختار اور اقتدار اعلیٰ کے مالک ہوں۔“ دوسرے لفظوں میں قرارداد لاہور میں دو آزاد مملکتوں کا تصور پیش کیا گیا تھا جن میں سے ایک بھٹیگر ہندوستان کے شمال مغرب میں اور دوسری شمال مشرق میں قائم کی جائے گی تاہم اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہوگا کہ جنگل کی مسلمان قیادت نے ۱۹۴۶ء میں رضا کارانہ اور پورے جوش و جذبے کے ساتھ ایک متحدہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ اور اس کے قیام کے لئے مکمل حمایت کا اعلان کیا تھا۔

یہ ایک آزادانہ فیصلہ تھا جو پوری رضا مندی کے ساتھ کسی دباؤ یا مجبوری کے کسی شائبہ تک کے بغیر کیا گیا تھا۔ مگر اس سے اس دعویٰ کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ اس انتظام کے تحت بڑے پارٹنر نے اس پارٹنر شپ سے علیحدگی اختیار کر لے کر فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا یہ فیصلہ خواہ یہ دوسرے پارٹنر کے لئے کتنا ہی بد مزہ کیوں نہ تھا، بہر حال قابل احترام ہونا چاہیے تھا۔



۲ مارچ ۱۹۷۱ء سے شیخ مجیب الرحمن اور عوامی لیگ پر ان مصائب کی بڑی حد تک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس نے مشرقی پاکستان میں بسنے والے بنگالیوں، بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں سمیت سب کو اپنی پیٹ میں لے لیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا جرم ان کی شکوک و فدا داریاں تھیں۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت کراتے جانے والے عام انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا جس کی شق ۲۰ آئین کے بنیادی اصولوں کے علاوہ مندرجہ ذیل پر مشتمل تھی:

(۱) "پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگا جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے معروف ہوگا۔ اور جس میں صوبے اور دوسرے علاقے جو اب شامل ہیں یا بعد ازاں شامل ہوں گے، سب ایک وفاق میں اس طرح متحد ہوں گے کہ پاکستان کی آزادی، علاقائی سالمیت اور قومی استحکام کو یقینی بنایا جاسکے اور وفاق کے اتحاد میں کسی بھی انداز سے رکاوٹ نہ پڑے۔"

"(۴) تمام اختیارات بشمول قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی امور، وفاقی حکومت اور صوبوں کے درمیان اس طرح تقسیم کئے جائیں گے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہوگی یعنی زیادہ سے زیادہ قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات۔ لیکن وفاقی حکومت کے پاس بھی مناسب اختیارات ہوں گے بشمول قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات کے تاکہ وہ خارجہ اور داخلی امور سے متعلق اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے اور ملک کی آزادی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت سے متعلق اپنے فرائض انجام دے سکے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ لیگل فریم ورک آرڈر کی شعول اور عوامی لیگ کے منشور میں شامل چھ نکات کے درمیان اختلافی معاملات کو عوامی لیگ اور آئین ساز اسمبلی میں نمائندگی کرنے والی دوسری جماعتوں کے درمیان طے کیا جانا تھا۔ اس دوران میں شیخ مجیب الرحمن اور عوامی لیگ کی قیادت میں شامل ان کے دوسرے ساتھی عوام کو بار بار اپنے اعلانات کے ذریعے یقین دہانی کراتے رہے کہ ان کے چھ نکات پاکستان کو مضبوط بنانے کے لئے تشکیل دیئے گئے تھے اور مشرقی پاکستان میں ان نکات کی مدد سے عوام کا اطمینان اور اعتماد حاصل کیا جاتے گا اور ان کے ذریعے صوبائی خود مختاری کی ضمانت فراہم کی جاسکے گی۔



واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ تمام اعلانات اصل عزائم کو چھپانے کے لئے کئے گئے تھے۔ حقیقت مغربی پاکستان میں قید سے رہا پاتی تھے ہی شیخ مجیب الرحمن براستہ لندن جو نئی ڈھاکہ پہنچے تو انہوں نے اعلان کیا کہ آزاد مشرقی بنگال ان کا خواب تھا جو وہ گوشہ بچیس برس سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں ہے کہ آخر کار یہ خواب حقیقت بن گیا ہے۔

انتخابی ہم کے دوران کے اعلانات سے دوسرا مقصد حاصل ہوا۔ انہوں نے صوبائی خود مختاری کی حمایت کرنے والے مگر مغربی پاکستان سے مکمل علیحدگی کی مخالفت کرنے والوں کا اعتماد حاصل کئے رکھا۔ اور دوسری جانب انہوں نے حکام اور مغربی پاکستان میں سیاسی قیادت کو گوگو کی کیفیت میں رکھا جس کا خیال یہ تھا کہ ان کے اور عوامی لیگ کے درمیان آئینی اختلافات کو بات چیت کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔

انتخابات میں عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں مکمل فتح حاصل ہو گئی۔ انہوں نے آئین ساز اسمبلی کی ۳۱۳ میں سے ۹۷ نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور اس کے ساتھ ہی ان کا روئے تیزی کے ساتھ تبدیل ہونا شروع ہو گیا اور اس کا اصل مقصد جلد ہی مکمل کر سامنے آ گیا۔ فردری کے پہلے ہفتے میں ہندوستان کی جانب سے اپنے علاقے پر پاکستانی پروازوں کی بندش سے عوامی لیگ کو یقین ہو گیا کہ مشرقی پاکستان میں متعین مغربی پاکستانی فوجوں یونٹوں کو تیزی کے ساتھ الگ نہیں پہنچا پتی جا سکے گی۔ اسی لمحے سے چھ نکات پر گفت و شنید کا دروازہ بند ہو گیا اور عوامی لیگ کا روئے سخت ہو گیا۔ عوامی لیگ جو کہ پہلے ہی کافی مضبوط پوزیشن میں تھی اس نے خود کو نیم فوجی تنظیم کی حیثیت سے منظم کرنا شروع کر دیا۔ فردری کے اواخر تک اس کی نفی کی تعداد مشرقی پاکستان میں متعین مغربی پاکستانی فوجوں یونٹوں سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ اس وقت تک شیخ مجیب الرحمن نے یقیناً اس امر کا اہتمام کر لیا ہو گا کہ فوجی کارروائی کی صورت میں الیٹ پاکستان رائفلز اور دوسرے مشرقی پاکستانی فوجی عناصر خود کو عوامی لیگ کے احکامات کا تابع بنا دیں گے۔ اور یہ بات بعد کے واقعات سے ثابت ہو گئی۔ پاکستانی مسلح افواج کو ابتدا ہی سے جس وسیع تر مستعمرات کا سامنا کرنا پڑا اس سے ثابت ہو گیا کہ مستعمرات کی تیاری اگر برسوں پہلے نہیں تو مہینوں پہلے ضرور کر لی گئی تھی۔ اور اس کا غالب امکان ہے۔ ساہل سال سے سرحد پار سے اسلحہ اور گولہ بارود سلائی کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات



سے شیخ مجیب الرحمن کے خلاف اگر تہ سازش کیس کے الزامات مسلم ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۴ء کے انتخابات میں عوامی لیگ کی کامیابی کے بعد بھی شیخ مجیب الرحمن کو مستعجل جدوجہد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ آئین ساز اسمبلی کا ۳ مارچ کو اجلاس ملتوی ہونے کے باوجود اسے غیر ضروری پریشانی کا سامنا نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کی پوزیشن بے حد مضبوط تھی جسے نہ تو بدلایا جاسکتا تھا اور نہ ہی نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔

چھ نکات پر ممکنہ حد تک پیچھے ہٹنے کے بعد بھی یہ بات مسلم تھی کہ مکمل صوبائی خود مختاری وہ کم سے کم صورت تھی جس کا اُسے یقین دلایا جاسکتا تھا مگر اس پر اسے مرکز میں حکومت قائم کرنے پر راضی ہونا چاہیے تھا۔ اُس کی پارٹی مشرقی پاکستان میں بھی برسرِ اقتدار ہوتی۔ وہ پارٹی لیڈروں کے درمیان ملے جلے والے سمجھوتے کے مطابق مسودہ آئین مرتب کراسکتا تھا۔ اور اس صورت میں صدر اُس آئین کی توثیق کرنے کا پابند ہوتا۔

وزیراعظم کی حیثیت سے وہ ایسی تمام عدم مساوات کو دور کر سکتا تھا جس کا اس کے بقول مشرقی پاکستان کو نشانہ بننا پڑا تھا۔ درحقیقت ایسا کرنا اس کا ایک آئینی فرض ہوتا کیونکہ لیگل فریم ورک آرڈر کی شق ۲۰ (۵) (ب) کے تحت آئین کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا جاتا تھا کہ ایک خاص عرصہ کے دوران صوبوں اور ایک ہی صوبے کے مختلف علاقوں کے درمیان پائی جانے والی اقتصادی اور دوسری عدم مساوات کو قانون سازی اور دوسرے اقدامات کے ذریعہ ختم کر دیا جائے گا۔

برسرِ اقتدار پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے وہ جامع اصلاحات پر مبنی ایسا پروگرام وضع کر سکتا تھا جو اُس کے خیال میں انتظامیہ کے ہر شعبے کی حقیقی ضروریات اور مشرقی پاکستان کے مفادات کے مطابق ہوتا۔ اگر مغربی پاکستان اُس کی دانشمندی اور اس کی پالیسیوں کا معترف ہو جاتا تو پاکستان ایک درخشاں مستقبل کی راہ پر گامزن ہو جاتا۔ جس کے حصول کا عزم اور تکمیل کے امکانات دونوں روشن ہوتے۔ اگر مغربی پاکستان خود کو نظر انداز شدہ اور ناخوش محسوس کرتا تو شیخ مجیب الرحمن علیحدگی کی پیشکش کر سکتا تھا اور اس پر باہمی افہام و تفہیم کے ساتھ ملکر آمد ہو سکتا تھا۔ انتخابات کے نتائج نے اسے بہت بڑا موقع اور چیلنج دیا تھا۔ اس نے یہ موقع ضائع کر دیا اور چیلنج قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے تصادم اور کشمکش کا راستہ اپنالے کو ترجیح دی۔



شاید وہ اپنے خواب کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ انتخابات میں حاصل ہونے والی فتح نے اس کے پاؤں پکڑ

لتے تھے اور وہ اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ شاید اس کے لئے اب یہ سوچنا بہت تاخیر کی بات بن کر رہ گیا تھا کہ وہ ایک متحدہ پاکستان کو مضبوط، مستحکم اور خوشحال بنانے کے لئے اس کی رہنمائی کرنے کے امکانات پر غور کرتا۔ شاید سونار بنگلہ کی چمک نے دوسری تمام باتوں سے زیادہ اس کے ذہنی افق کو چندھیا کر رکھ دیا تھا۔ اگر ایسا تھا تب بھی وہ اپنا مقصد پر امن طریقے سے تصادم اور خون خرابے کے بغیر بھی حاصل کر سکتا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ انتخابات کے نتائج نے اسے کامیابی کی جس منزل پر لا کر رکھ دیا تھا وہ اپنی پوزیشن کے اثرات و مضمرات کا پوری طرح جائزہ لیتا اور اپنی پارٹی کی صفوں میں خاص طور پر اپنے رضا کاروں میں مکمل نظم و ضبط پیدا کرنے پر زور دیتا تاکہ وہ اس کی منزل کے حصول کے لئے پُر امن مگر مؤثر قوت ثابت ہوتے۔ اس نے ان کو احساس دلایا ہوتا کہ ان کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو اب وہ ان کے ہاتھ میں ہے بشرطیکہ صورتحال کو احتیاط کے ساتھ سنبھالا جاسے اور یہ کہ انہیں خود پر قابو رکھنا چاہیے اور لوگوں کی جانب توجہ نہ دینی چاہیے۔ سب سے بڑھ کر ہر قسم کی شور و شائش اور تشدد کو کھل دینا چاہیے۔ ان کے رہنما اصول نظم و ضبط، تابع فرمانی، خدمت اور ملٹی برانصاف سلوک ہونے چاہئیں۔ پارٹی کو بلا تفریق اختیار مشرق پاکستان کی سرحدوں کے اندر خود کو سلامتی کی محافظ اور ہر شہری کے حقوق کی نگہبان ہونا چاہیے تھا۔ اگر ان سب باتوں کا عملی اظہار کیا جاتا اور یہ ایک مسلم حقیقت بن جاتا تو شیخ مجیب الرحمن کہیں زیادہ مضبوط پوزیشن کے ساتھ آئینی بحث میں شریک ہونے کے قابل ہو جاتا۔ مغربی پاکستان کے نمائندوں کی جانب سے چھ نکات یا ان کے کسی حصے کے متعلق خواہ کسی ہی مخالفت یا مزاحمت کی جاتی وہ مؤثر نہ ہوتی کیونکہ اس صورت میں یہ سمجھا اور محسوس کیا جاتا کہ اس کا واحد مقبول علیحدگی ہو گا۔ یہ درست ہے کہ ملک میں مارشل لا نافذ تھا مگر ایسی صورت میں جب کوئی بھی طے شدہ ضوابط کے خلاف کچھ نہ کر رہا ہو تو مارشل لا درحکام کیا کر سکتے تھے؟ کسی مقصد کے تحت متحد ہونے والی قوم کی اخلاقی قوت کو کوئی مارشل لا یا فوجی طاقت نہیں دبا سکتی۔ چھ نکات کی کامیابی کا مطلب فی الواقع علیحدگی ہوتا۔

مگر شیخ مجیب الرحمن نے خود ہی اس راستے کو منتخب نہ کیا۔ اس کی ہدایات کے مطابق عوامی لیگ نے سال کے اواخر ہی سے مسلح حکمت عملی اختیار کر لی تھی جو اس کے اپنے تجزیہ کے مطابق انتخابی

ہم کے دوران بے حد مؤثر ثابت ہوتی تھی۔ اس نے ۲ مارچ سے صوبائی انتظامیہ پر عمل قبضہ کر لیا اور



اب وہ دہشت گردی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ مارچ کے پہلے تین ہفتوں کے دوران اس کی جانب سے کی گئی وسیع پیمانے کی مار دھاڑ اور تشدد نے ۲۵ مارچ سے جوانی رُخ اختیار کر لیا۔ ایک عربی محاورے کے مطابق: جب دونوں فریق غلط کاری کے مجرم ہوں تو غلط کاری کی ابتدا کرنے والے کو جرم کی زیادہ سزا جھگڑتا پڑتی ہے۔

جنرل یحییٰ خان نے ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو قوم کے نام پیغام میں کہا:-

”میں نے اپنے ۶ مارچ کے خطاب میں آپ کو بتایا تھا کہ افواج پاکستان کا فرض ہے کہ وہ ملکی استحکام، سالمیت اور سلامتی کی حفاظت کریں۔ میں نے انہیں اپنا فرض ادا کرنے اور حکومت کی بالادستی بحال کرنے کا حکم دیا ہے۔“

یہ فیصلہ بہت بادلِ نخواستہ کیا گیا تھا۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان ایک مسلح بغاوت کی پیٹ میں آچکا تھا اور بغاوت کو کچلنے اور انتظامیہ کی معمول کی کارکردگی کو بحال کرنے کے لئے فوجی کارروائی ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کارروائی کے خلاف فوری مسلح مزاحمت کی گہرائی اور گیرائی نے ظاہر کر دیا کہ فوجی کارروائی میں تاخیر کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی۔ مگر اس سے فوجی کارروائی کا دائرہ وسیع تر کرنے کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا۔ عوامی لیگ کے رضا کاروں نے قابلِ افسوس کارروائی کی تھی اور ایسے افسوسناک واقعات پیش آئے تھے جنہوں نے شاید مسلح افواج کے نہ صرف جبر کو آزمایا تھا بلکہ ان کے غیظ و غضب کو بھی بھرپور کا دیا تھا۔ مگر اس سے مؤخر الذکر کی جانب سے کی گئی کارروائی کا جواز ثابت نہیں ہوتا جس نے اپنے فرائض کی حدود سے تجاوز کیا اور جسے جوانی حملوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مسلح افواج کو اس سے کہیں کم انسدادی کارروائی کی اجازت تھی۔

ملک میں آئندہ آئینی ڈھانچے کے سلسلے میں کئے جانے والے اقدامات کی روشنی میں مارشل لاہ ضوابط کی خلاف ورزیوں پر صرف متعین شدہ قواعد و ضوابط کے تحت ہی سزائیں دی جاسکتی تھیں۔ جنرل یحییٰ خان کے حکم نے اس غلط مفروضے کی گنجائش رکھی کہ مسلح افواج کے ذریعے مخالف سیاسی اور آئینی نظریات رکھنے والوں کا صفایا کر دیا جاتے۔ اس قسم کے غلط مفروضے کو ڈھاکہ سے تمام غیر ملکی صحافیوں کے انحصار سے بھی تقویت ملی جن سے کہا گیا تھا کہ اس قسم کے خراب حالات میں ان کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ جیسا کہ برطانوی پارلیمنٹ کی ایک رکن مسز جیلا نائٹ نے بعد ازاں جنرل



یہی خان کو بتایا کہ غیر ملکی نامہ نگار اور صحافی مشرقی پاکستان کے شورش زدہ علاقوں میں اپنے فرائض اپنی ذمہ داری پر ادا کر رہے تھے اور انہوں نے نہ تو تحفظ کی کسی ضمانت کی توقع رکھی اور نہ ہی اس کا مطالبہ کیا۔ خطرات سے کھیلنا تو ان کے فرائض کا ایک حصہ ہے۔

جنرل یحییٰ خان نے تسلیم کیا کہ نامہ نگاروں کا اختلاہ ایک غلطی تھی۔ یہ پہلی ناش غلطی ثابت ہوئی۔ انتظامیہ نے بیرونی دنیا کے ساتھ رابطے کے سب سے بڑا ذریعہ کو اگر اپنا دشمن نہیں بنایا تھا تو کم از کم اس کی ہمدردیاں ضرور دکھودی تھیں۔ جان بوجھ کر خود پر مسلط کی گئی اس مشکل صورتحال میں انتظامیہ کو مجبوراً ایسے ذرائع کے ساتھ کام کرنا پڑا جو پاکستان کے خلاف گہری دشمنی کا رنگ لاتے ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان کے واقعات کی ایک انتہائی گمراہ کن اور فرضی تصویر بیرونی دنیا تک پہنچتی رہی اور اس طرح ٹوڑ ٹوڑ کر پیش کیا جانے والا منظر ابھی تک درست نہیں کیا جاسکا۔

بنگلہ دیش کا پریس اس غلط تاثر سے ابھی تک فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کی ایک مثال ہی یہاں کافی ہوگی۔ ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ”بنگلہ دیش آبروز“ نے ہفتہ ۲۰ مئی ۱۹۷۲ء کو کے۔ ایم۔ سیف الاسلام کے نام سے ایک مضمون شائع کیا جس کی سرخی تھی: ”ہماری آزادی کی جدوجہد میں غوثین کا حصہ“۔ مضمون کا ایک بڑا حصہ ”ان مبینہ مظالم پر مبنی تھا جو افواج پاکستان نے مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء کے موسم بہار اور موسم گرما کے دوران ٹوڑے تھے۔ مضمون نگار کے مطابق ان مظالم کا ارتقا اب ایک طے شدہ شیطانی پالیسی کے تحت کیا گیا تھا جس پر جنرل یحییٰ خان کا رہنمائی تھا۔ مضمون میں کہا گیا تھا کہ ”یحییٰ، ٹکا، فرمان علی، نیازی اور دوسرے جنرل جن میں سے بیشتر شیعہ یا قادیانی تھے انہوں نے ایک پلان بنایا تھا۔۔۔“ مضمون نگار شرا نگیز پلان کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔

راٹم الحروف جو خود ایک احمدی (قادیانی) ہے اسے اس سراسر بے بنیاد دعویٰ کو پڑھ کر ایسا شدید صدمہ ہوا کہ اس نے مضمون میں دیتے گئے جملوں کے ناموں کے بارے میں یہ تصدیق کرنے کے لئے سخت محنت کی کہ ایک احمدی جنرل آفیسر یا سپاہی جس کے طرز عمل میں اس قسم کا شائبہ تک ہی ہو جس کا کہ مضمون میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے کوئی احمدی تو نہیں۔ اسے ذاتی طور پر یقین تھا کہ ان میں سے کوئی بھی احمدی نہیں ہے۔ پوچھ گچھ کے بعد اسے اطمینان ہوا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور مزید یہ کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں کسی ایک احمدی جنرل نے بھی خدمات انجام نہیں



دی تھیں۔

مضمون کے متن میں دو بار قادیانی جرنیلوں کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا مقصد بالکل واضح ہے کہ اس فرقتے کو بدنام کیا جاتے اور اس کے خلاف نفرت اور بدگمانی پیدا کی جاتے جس کے خلاف اگرچہ نظریاتی وجوہ کی بنیاد پر پہلے ہی شدید تنقید کی جاتی ہے مگر اس فرقتے کے کٹر مخالفین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ لوگ کردار میں اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کے علمبردار ہیں۔ یہ بات بھی سب کو بخوبی معلوم ہے کہ کمیونٹی بے حد منظم ہے اور اس کا نظم و ضبط انتہائی سخت ہے۔ اور اگر اس کا کوئی فرد (ان مظالم کا مرتکب ہوتا) خواہ وہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو تادم تحریک کے ایک عام رکن کی حیثیت سے بھی اس میں شامل نہیں رہ سکتا تھا اور اس کی رکینٹ معطل کر دی گئی ہوتی۔

۱۹۷۱ء کے پورے برس کے دوران انتظامیہ نے جان بوجھ کر ۲ مارچ کے بعد سے غیر بنگالیوں کے خلاف عوامی لیگ کی مسخ سرگرمیوں سے متعلق خبروں کی اشاعت پر مشرقی پاکستان سے باہر پابندی لگا دی تھی یہاں وہ ان خبروں کی اشاعت سے مغربی پاکستان میں مقیم بنگالیوں کے خلاف تشدد کی جوابی کارروائی کی لہر چل نکلے۔ ۱۹۷۱ء کے بڑے عرصے کے دوران مشرقی پاکستان میں ظلم و تشدد کے خلاف ٹوڑے جانے والے مظالم کی خبریں عام ہو جانے اور مغربی پاکستان میں پہنچنے کے باوجود کسی ایک بھی مشرقی پاکستانی کو نہ تو مارا بیٹھا گیا، نہ زک پہنچائی گئی اور نہ ہی کسی تعصب پر مبنی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ آزادی صحافت پر عائد کی جانے والی پابندی کے اس پہلو نے عملی طور پر اس کا جواب ثابت کر دیا۔ یہاں بیان شدہ یہ نظریہ مصنف کی کسی بعد کی سوچ کی عکاسی نہیں کرتا کہ ۲ مارچ کے بعد جنرل یحییٰ خان اور مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ گیا تھا کہ چھ نکات میں شامل عوامی لیگ کا مکمل صوبائی خود مختاری کا مطالبہ تسلیم کر لیا جاتے اس کا ملکی مطلب دونوں حصوں کی علیحدگی تھا۔ ۸ مارچ کو مصنف نے اپنے ایک دوست کے نام ایک خط لکھا جو ایک مغربی پاکستانی سیاست دان کے بہت قریبی دوست ہیں۔ خط کے مندرجات حسب ذیل تھے :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بیگ

۸ مارچ ۱۹۷۱ء  
ڈیرسر



دن آثار اور فرائض کی بنا پر جن کا ذکر جبرائیل میں آتا ہے (واللہ اعلم بالصواب) خاک کے ذہن میں جو انکار جبرائیل سے گندارش خدمت ہیں۔

شرقی اور مغربی پاکستان کو باہم جکڑنے والی زنجیر خلیج فارس، لہ الدین جی ہو سکتی تھی ورنہ آب و ہوا، زبان، حرکات، رنگ روپ، خدو خال، لباس، حتیٰ کہ بدلتے ہوئے گھر، محلے، کھانا اور ذہنی افکار سب مختلف۔

اب اتحاد و عقود اور دین کی نسبت جذبات تو نسبت کاغذی۔  
آدمی سارے عالم میں حق و خود اختیاری کی پرتشیش، شرقی اور مغرب میں آبادی کی نسبت ۷ اور ۶۔ اور قیاس کی نسبت ۹ اور ۵۱۔

شرقی مملکت علیحدگی پر توجہ ہے۔ مغرب کے جاقو میں کوئی ناطع ہر جہاں اس کے خلاف نہیں ہو سکتی تو شرق سننے اور ٹوڑنے پر آمادہ ہیں۔

تاریخ شاید ہے کہ جبرائیل ہی صرف لا حاصل ہے بلکہ خود کشی کے مترادف ہے۔  
اگر فرق کی خلیج خدا تو راستہ حامل ہوئی تو پالی نہ جاسکتی۔

لفضان مایہ کی تفریق کی صورت تو ہو سکتی ہے۔ لفظان جان کی تفریق نہیں ہو سکتی اور شہادتت جہاں کی تفریق تو بہر صورت لازم ہے۔

پھر جبرائیل اگر کوئی دن تیرا بعد گزارہ ہو سکتی تو باہمی ربط بڑھنے کی کوئی صورت نہیں۔  
اس لئے خداوند یا ناخواستہ سراسر آجائیلہ جی کا طریق کام آ سکتا ہے۔

اس کے رستے میں بہت سی مشکلات ہیں۔ آج تو شاید باہمی دفاعیت کے نیت سکیں۔ قیام دن بعد شاید یہ امکان بھی جاتا رہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ موجودہ صورت میں اس کا معروف تو حق نہیں اور سرخی باحسان جی کا راستہ کھل رہا ہے۔

دونوں کو مشکلات کا سامنا ہو گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں تو وہ یقیناً بفضلہ برقرار ہے۔ اگر کسی حقیقت کی صورت نہ بر جاتی جائے تو شاید کل کو اپنے اپنے گھر کا جائزہ لینے کے بعد نئی طریق دوستانہ تعاون اور برادرانہ روابط کے پیدا ہونے چاہئیں۔

وجودہ صورت بہت سے خطرات کا موجب ہے اور ابھی سے جب سنائی اور شہادتت کا سامنا ہے۔

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ آمین۔



مسلم قوم کی تاریخ اب چودہ صدیوں پر محیط ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح اس نے بھی بہت سے عروج و زوال دیکھے ہیں مگر اسے اب تک ایسی شدید جذباتی اور سرخ دم کی ہوتی شرمندگی، توہین اور ذلت کی خود ہی دہکاتی ہوتی بھٹی سے کبھی نہیں گزرنا پڑا تھا جو ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں اس کا مقتدر بنی۔ اس کے انگارے ابھی تک پوری طرح بجھے نہیں پاتے۔ تیرھویں صدی کے وسط میں جب سقوطِ بلند ہووا اور وحشی تاتاریوں نے مسلم سلطنت کے مشرقی حصے کو بڑی حد تک روند ڈالا تو مسلم قوم وسیع تر تباہی سے دوچار ہوئی۔ پندرہویں صدی میں سپین سے فردوسی نند اور ازابیلا کے ہاتھوں مسلمان موروں کا انحراف بھی ایک افسوسناک المیہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر بوقیامت ٹوٹی وہ بھی انتہائی خوفناک تھی۔ ان تمام واقعات میں مسلمانوں کو غیر مسلم حملہ آوروں، ناانصافیوں اور دہشت گردوں کے مظالم کا نشانہ بننا پڑا۔ مشرقی پاکستان میں ۷۲۔۱۹۷۱ء کے واقعات مسلمانوں کی جانب سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں پر شرمناک و خبیانہ مظالم کا مظاہرہ تھے۔ مسلمان کے بُرے طرزِ عمل سے انسانیت اور اسلام کا قتل عام کیا گیا۔ ان کی توہین کی گئی اور ان کا وقار مجروح کیا گیا۔ پاکستان کے سارے نظریہ اور اس کی اساس کو غلط ثابت کیا گیا اور اس کے محافظوں اور علمبرداروں نے خود ہی اس کا مذاق اڑایا۔ ۱۹۴۰ء کے دعووں اور اعلانات کو ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل میں کس تضاد اور بُری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

ہم شاید اس المیہ کے سب سے قریبی شاہد ہیں اور اس کے مختلف مراحل کے بارے میں ذمہ داری کے تعین کے لئے مطلوبہ شہادت تلاش کرنے کے زیادہ قابل ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی پہلو مصنف کے مقصد سے قریبی تعلق نہیں رکھتا کہ اس ناکامی کے اسباب تلاش کئے جائیں اور دریافت کیا جائے کہ اس قسم کے واقعات کے اعادہ کو روکنے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔



مطالبہ پاکستان کو کس چیز نے پروان چڑھایا، بلاشبہ اس میں مسلمانوں کو غیر مسلم اکثریت کے ہاتھوں میں حیثیت انقواء امتیازی سلوک اور مادی خوشحالی کے ضمن میں شدت سے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ یہاں بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں اور انہیں بڑھا چڑھا کر بیان بھی کیا جاسکتا ہے مگر ایسا کر نا ضروری نہیں ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خوف حقیقی تھا اور اس کی بنیادیں بھی کافی مضبوط تھیں۔ مگر کیا اس خوف نے مسلمانوں کو جن کی تعداد اس وقت ساڑھے بارہ کروڑ سے زائد تھی اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ملک کی تقسیم پر اصرار کریں اور اس طرح اپنے ان غیر مشکوک اور یقینی مفادات کو خطرے میں ڈال دیں۔ جو ایک متحدہ ہندوستان کے باسی ہونے کی حیثیت سے انہیں مل سکتے تھے۔ اور اپنی آبادی کے خاطر خواہ حصے کو مجبوراً ہندوستان میں رہ جانا سے غیر مسلم اکثریت کے متعصب فرقوں کی دشمنی کے حوالے کر دیں۔ اور نئی مملکت کی سلامتی اور استحکام کو جو وہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اگر دشمن نہیں تو ایک محاصرت رکھنے والے ملک کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں جو اس کے مقابلے میں کتنی گنا طاقتور اور اسلحہ سے بہتر طور پر لیس تھا جس کی انہیں اپنی نئی مملکت کے بارے میں توقع تھی؟ یقیناً نہیں۔ پھر وہ کیا بات تھی جس نے مسلمانوں کو نئی مملکت کے قیام پر آمادہ کیا تھا اور نہ صرف ان مسلمانوں کو جنہیں اس میں شامل ہونے کی توقع تھی بلکہ انہیں بھی جن کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس مملکت میں جزا فیائی اعتبار سے کبھی شامل نہیں ہو سکیں گے، وہ بھی اس مملکت کے قیام پر مقرر تھے۔ یہ ایک مستقل خدشہ تھا کہ ایک بار مسلمان ہندو غلبہ رکھنے والے ملک میں شامل ہو گئے تو ان کی اخلاقی اور روحانی اقدار خطرے میں پڑ جائیں گی۔

ان کا جوش و خروش بیسویں صدی کے وسط میں قائم ہونے والی ایسی مسلم ریاست کے نقصان کے بارے میں تھا جس میں اسلام کی تمام تر اقدار کو زندگی کے تمام شعبوں اور اس کی آبادی کے تمام حصوں کے لئے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم یکساں نافذ کیا جاتے گا۔ اس کا اعلان مسلم لیگ کے ڈیکلریشن، سرکردہ مسلمان شخصیات کے بیانات و اعلانات، ہجوموں کی طرف سے بار بار دہرائے جانے والے نغزوں اور ۱۹۵۶ء کے آئین سے پہلے منظور کی جانے والی قرارداد مقاصد میں کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء کے لیگل فریم ورک آرڈر میں بھی کیا گیا تھا۔

”۲۱۔ آئین کی تہذیب میں اس بات کی یقین دہانی کرائی جاتے گی کہ:-



(۱) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنی زندگیاں قرآن و سنت کی روشنی میں اسلامی اصولوں کے مطابق گزار سکیں اور

(۲) پاکستان کے شہریوں کی حیثیت سے اقلیتوں کو اپنے اپنے مذاہب پر کاربند رہنے اور آزادی سے عمل کرنے کے حقوق، سہولتیں اور تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

”۲۲۔ آئین میں ریاستی پالیسی کے رہنما اصول متعین کیے جائیں گے جن کے ذریعے ریاست کی مندرجہ ذیل صورتوں میں رہنمائی کی جائے گی:-

(۱) اسلامی طرز زندگی کا فروغ۔

(۲) اسلام کے اخلاقی معیاروں کی پابندی۔

(۳) پاکستان کے مسلمانوں کو قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم دینے کی سہولیات کی فراہمی۔

(۴) اس بات کی یقین دہانی کہ قرآن اور سنت میں مذکور اسلامی تعلیمات اور ضروریات کے منافی

کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔“

اس طرح برتھنگیر کے مسلمانوں نے خداوند تعالیٰ کے حضور پوری عاجزی کے ساتھ دعا کی کہ انہیں

ہندوستان میں ایک اسلامی سرزمین عطا کی جاتے جہاں پر اس کا مقدس نام بلند کیا جاسکے۔ اور جہاں

قرآن مجید میں اس کی ارشاد کردہ اقدار کو نافذ کیا جاسکے جس کی بہترین مثال انسانِ کامل پیغمبر اسلام

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات مبارکہ تھی۔ اور دنیا کے سامنے ایک مکمل فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا جاسکے

جو ایک بامقصد سبق کی حیثیت سے سامنے آسکے۔ یہ بات بڑی حد تک آئیڈیلزم پر مبنی نظر آتی ہے

اور تقریباً ناقابلِ عمل بھی۔ یہ درحقیقت ایک بہت بڑی ذمہ داری خود قرآن مسلمانوں پر عائد کرتا ہے۔

”اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے صحیح راستے کی طرف

راہنمائی کرتا ہے۔ صحیح راستے پر تمہاری راہنمائی کر کے ہم نے تمہیں معزز قوم بنا دیا تاکہ

تم بنی نوع انسان کے لئے راہنمائی کر کے والے اور گواہ بن جاؤ اور ہمارا پیغمبر مبعوث کیا۔“

راہنما اور تم پر گواہ بن جاتے۔“ (سورۃ ۲ آیات ۴-۱۴۳)

دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کو متحقق کی جا رہی ہے کہ رسول اللہ کی راہنمائی پر عمل کر کے وہ

بنی نوع انسان کے لئے ایک مثال کا کام دیں۔ اسی نظریہ کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے:-



”تم بہترین قوم ہو کیونکہ تمہیں بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم انہی کے کاموں میں تعاون کرنے والے اور بُرائی کو رد کرنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہو۔“ (سورۃ ۳- آیت ۱۱۱)

اس ذمہ داری کو مطالبہ پاکستان کے ساتھ منسلک کر کے مسلمانوں نے خود پر دہری ذمہ داری عائد کر لی مثال کے طور پر کسی سرکاری عہدے پر فائز شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے فرائض و ریاستداری اور فرض شناسی کے ساتھ انجام دے مگر یہی فرض اس شخص پر زیادہ بھاری اور اہم ہو گا جو خود کو اس عہدے کے لئے پیش کرے۔ اس کی وضاحت قرآن میں بھی کی گئی ہے۔ خدائی قانون میں کہا گیا ہے :-

”اگر تم میری نعمتوں کو فلاحی انداز میں استعمال کرو گے تو میں یقیناً ان میں کمی گنا اضافہ کروں گا۔ لیکن اگر تم ان کا غلط استعمال کرو گے تو میری سزا یقیناً بہت سخت ہے۔“ (سورۃ ۱۲- آیت ۸)

اس کے ایک اطلاق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

”یاد کرو جب مریمؑ کے بیٹے یسوعؑ سے اُس کے حواریوں نے پوچھا: کیا تمہارا خدا اس بات پر تیار ہے کہ وہ آسمان سے کھانوں سے بھری ہوتی ایک نیزا تار دے؟ اُس (یسوعؑ) نے ان کو ملاحت کی، اگر تم صحیح مومن ہو تو اللہ کی بادشاہت کو یاد رکھو۔ مگر انہوں نے اصرار کیا: ہم اس کے ذریعے اپنے دلوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارا خدا واقعی قادر مطلق ہے اور ہم اس چیز کا بھی یقین کرنا چاہتے ہیں کہ تم (یسوعؑ) نے ہمیں سچ بتایا تھا اور یہ کہ ہم اس بات کے گواہ بننا چاہتے ہیں۔ اس پر مریمؑ کے بیٹے یسوعؑ نے دعا کی: اللہ! ہمارے آقا! آسمانوں سے ہماری جانب کھانوں سے بھری ہوئی میز بھیج تاکہ سب سے پہلے یہ ہمارے لئے دعوت کا سامان بنے اور آخر میں ہمارے لئے تمہاری ایک نشانی بن جائے۔ اور میں اپنی طرف سے یہ عطا فرماؤں گا کیونکہ تم ہی سب سے بہتر رائق ہو۔ اللہ نے کہا: میں یقیناً اسے نیچے تمہارے پاس بھیجوں گا مگر تم سے جو کوئی بھی اس کے بعد ناشکر گزاری



کرے گا تو میں اسے سخت سزا دوں گا مگر اس کے علاوہ میں کسی دوسرے کو سزا

نہیں دوں گا۔ (سورۃ ۵ آیت ۱۶ - ۱۱۳)

قرآن حکایت کا ریکارڈ نہیں ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے ایک خاص مقصد کے تحت کہا گیا ہے۔ اس میں رہنمائی، انتباہ اور نصیحت ہے۔

قرآن مجسم نصیحت ہے۔ یہ بے کار گفتگو نہیں ہے۔ (سورۃ ۸۶ آیت ۱۵-۱۴)

”ان میں، ان کے (واقعاتی) ریکارڈ میں سمجھداروں کے لئے ایک سبق ہے۔“ (سورۃ ۱۲ آیت ۱۱۲)

حواریوں نے سیوٹ سے کہا کہ وہ دعا کرے کہ اس کی قوم کو اپنی تاریخ کے آغاز اور آخری حصے میں فراوانی سے نوازا جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ دعا قبول کی جائے گی مگر نعمتوں کا کفران (ناشکری) مثالی سزاؤں کو دعوت دے گا۔

مسلمانوں نے بھی اسی قسم کی نعمت کے لئے دعا کی۔ مالک کائنات اور جہانوں کے بادشاہ نے ہمیں دنیا پر ایک سلطنت عطا کی تاکہ اس سرزمین کے مالک ہوتے ہوئے ہم قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے تیرے احکامات بجالائیں اور تیری خوشنودی کے خواستگار ہوں۔ حق تعالیٰ کا جواب دہی تھا جو اس نے سیوٹ کے حواریوں کی دعا کے جواب میں دیا تھا۔ میں تمہیں یقیناً اس نعمت سے سرفراز کروں گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انتباہ بھی تھا۔ مگر تم میں سے جو کوئی بھی اس کے بعد ناشکری کرے گا جیسا کہ انہوں نے کی تو میں شدید عذاب نازل کروں گا اور جس میں کسی دوسری قوموں کو مبتلا نہیں کروں گا۔

پاکستان خالصتاً انعام خداوندی تھا۔ اکثریتی فرقے کے لئے پاکستان کا نظریہ ہی ایک لعنت تھا۔ اس کا مقصد مقدس تجارت کے ٹکڑے کر دینا تھا۔ یہ ایک ایسا خلاف مذہب خیال تھا جو کسی صورت میں قابل قبول نہ تھا۔ اس میں سندھ طاس کو دوسروں کے حوالے کرنے کا سوال اٹھتا تھا جو کہ سچا اور اصل آریاؤں کا تھا۔ اور وہ بھی ٹیچر (ناپاک) مسلمانوں کے حوالے کرنے کا سوال جس کا تصور ہی ہندوؤں کے لئے بھی ایک تھا۔ برطانوی وزیر اعظم ایٹلی جس کے ہاتھ میں آخری فیصلہ تھا وہ اس خیال کے قطعی خلاف تھا۔ اس کا ایک ساتھی جو اس کی راستے کو متاثر کر سکتا تھا سرسٹیفورڈ کرکس تھا جو انڈین نیشنلسٹ کانگریس کا مستقل چارٹر تھا اور برطانوی کابینہ میں اس کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس معاملے میں



وزیر اعظم کے فیصلے کو آخری شکل دینے کے لئے چنا گیا آلہ کار (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) جس کو اس کی درخواست پر مکمل اختیارات دے دیئے گئے تھے مسٹر جناح سے انتہائی پرفاش رکھتا تھا اور پاکستان کے تصور کو مجنونا نہ کہتے ہوئے نہ ٹھکاتا تھا۔ اس کے ہمسفروں میں سیولی، اسمے، ایبل، دی پی مینن، کیپٹن جاسن شامل تھے۔ کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جس کے پاس پاکستان کے متعلق کوئی کلمہ خیر تھا یا جو اس تجویز کے پیش کرنے والوں سے ہمدردی رکھتا تھا۔ آخر میں نہرو، ٹیلر، ماڈنٹ بیٹن اور اسٹلی یہ سب اس پاکستان کو جس سے یہ بے حد نفرت کرتے تھے، اسے تیزی سے ظہور میں لانے کے متحد ہو گئے۔ اگرچہ وہ اس کی گرم خور و عا در کٹی پھٹی صورت پر تیار ہوتے۔ انہیں یقین واثق تھا کہ جب حقیقت سے سامنا ہو گا تو مسٹر جناح اس سے کتر اہیں گے۔ نہیں تو یہ پیدا ہی مردہ حالت میں ہو گا یا بیدار آتش کے فوراً بعد ختم ہو جاتے گا۔ ان کے یقین واثق پر پانی پھیر دیا گیا۔ مسٹر جناح بالکل نہیں کتر اتے۔ اور پاکستان مردہ حالت میں معرض وجود میں نہ آیا۔ اگرچہ اس کا وجود گہرے گھاؤ لگا کر چھپائی کر دیا گیا اور اس کی تخلیق کے مصائب قتل عام اور غن خرابے کی انتہا تک پہنچے۔

پاکستان اپنی تخلیق کے طوفانوں میں قائم رہا۔ اس کے بھی خواہوں کے نزدیک یہ ایک معجزہ تھا۔ جبکہ اس کے مخالفین کے نزدیک یہ ایک غیر فطری، بچہ پا پودا تھا جس کے مقدہ میں تباہی لکھ دی گئی تھی۔ سچائی یہ تھی کہ یہ اس کے باشندوں اور رہنماؤں کے لئے ایک چیلنج تھا جس کے پیچھے اندھیرا اور آگے روشنی تھی۔

بھلا جو شخص خدا کی خوشنودی کا طالب ہو وہ اس شخص کی طرح (حیثیت کا مرتب)

ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں گرفتار ہو؟ (سورۃ ۳ آیت ۱۶۳)

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بدمعنی اور قتل عام نے بے خبری میں اچانک آن گھیر لیکن اس سے

اس کا کوئی توجہ پذیر اینہیں ہوتا کہ وہ انتقامی کارروائی کے جذبے سے مغربی پنجاب میں اپنے غیر مسلم ہمسایوں پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ ان کی پہلی ناکامی تھی ۱۹۴۷ء کے نصف آخر میں پنجاب کا ایک بڑا حصہ دشت و ہیبت کا نظارہ پیش کر رہا تھا جس کی اس سے پہلے نظر نہیں پائی۔ لاپرواہی، ہراس اور قتل عام نے انسانوں کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ تاہم کسی بھی لحاظ سے یہ نقصان درست نہیں ہو گا کہ کوئی فرقہ مکمل طور پر یا اس کی اکثریت اس میں ملوث تھی۔ درحقیقت طول و عرض میں پھیلی ہوئی منظم ٹوٹ مار، مار دھار اور قتل و غارت گری کے اس



منظر میں وفاداری، سچی خیر خواہی اور ذاتی قربانی کی بہت سی روشن مثالیں بھی ہمیں جن کا مطمح مشرکہ انسانیت تھی جنہوں نے اسے مکمل بے حُرمتی سے بچا لیا۔ تاہم نکتہ یہ ہے کہ آزمائش کی اُس گھڑی میں مسلمان بحیثیت قوم اسلامی اقدار کو سر بلند رکھنے میں ناکام رہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وہ دو قوموں کے درمیان مسلح جنگ کی صورتحال نہیں تھی جس کے اپنے قانون قاعدے ہوتے ہیں اور جس میں محاذ کے ایک طرف کی فوجیں دوسری جانب کی فوجوں پر غلبہ حاصل کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر یہ تو اندھی جذباتی انگیزت کا معاملہ تھا جس میں اخلاقی اقدار یا ان کی پاسداری کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس اندھی جذباتیت کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ناکامی اور وقار سے گرجانا تھا۔ عام صورتوں میں اخلاقی اقدار اور معیاروں سے وابستہ رہنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہوتا جبکہ ان سے انحراف کی ترغیب موجود نہ ہو۔ امتحان تو صرف بحر انوں اور کشمکش میں ہوتا ہے جب جذبات بھر پور ہوتے ہوں اور اشتغال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔

اگر جیسا کہ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو ”قرآن مجید میں بیان شدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے“ کے خواہاں تھے تو رہنمائی کا فقدان نہیں تھا۔ یقیناً ان کے لئے وہی عمل مناسب تھا جو ذیل میں بیان کیا گیا ہے :-

”اگر تم بدلہ لینے کی خواہش رکھتے ہو تو سزا کو اپنی تکلیف کے مطابق رکھو لیکن اگر تم صبر سے کام لو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے“ (سورۃ ۱۶ آیت ۱۲۷)

”یقیناً اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو خود پر قابو رکھتے ہیں اور وہی فلاح

پانے والوں میں سے ہیں“ (سورۃ ۱۶ آیت ۱۲۹)

”تمہیں یقیناً تمہارے اموال اور تمہاری جانوں سے آزما دیا جائے گا اور تم ان سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان سے حوالہ اللہ کے ساتھ تریک ٹھہراتے ہیں لیکن اگر تم صبر کرو اور جو امر بڑا حمت نہ کرو تو یہ بڑے حصے کی بات ہے“ (سورۃ ۳ آیت ۱۸۷)

کسی دُخم کی سزا اُسی قدر زخم کے برابر ہے۔ مگر وہ جو معاف کر دے اور اس طرح اصلاح کا موجب بنے تو اس کا اجر اللہ کے پاس ہے۔ یقیناً اللہ غلط کاروں



کو پسند نہیں کرتا۔ ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ ان کے ساتھ کی گئی بُرائی کا اُسی قدر بدلہ لے لیں۔ گناہ تو ان پر ہے جو دوسروں کے ساتھ بُرائی کرتے ہیں اور زمین میں بلا جواز فساد پھیلاتے ہیں۔ انہیں دردناک عذاب دیا جاتے گا مگر ایسا شخص جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو مگر اس نے صبر کے ساتھ اسے برداشت کیا اور (زیادتی کرنے والے کو) معاف کر دیا تو یہ درحقیقت بڑے حوصلے کی بات ہے۔

(سورۃ ۴۲ آیت ۴۲ تا ۴۴)

”بھلائی اور بُرائی ایک جیسی نہیں۔ بُرائی کو بہترین چیز سے ختم کرو۔ اور دیکھو وہ اور تم جن کے درمیان دشمنی تھی اب ایسے ہیں جیسے کوئی گہرا دوست مگر اس (چیز) کو کوئی نہیں پاسکتا سوائے اُن کے جو ایمان والے ہیں اور نہ ہی اس کو وہ پاسکتے ہیں مگر جن کو بھلائی میں سے بہت بڑا حصہ عطا کیا گیا ہے۔“

(سورۃ ۲۱ آیت ۳۵ - ۳۶)

”ماہم بحران اور آزمائش کی گھڑی میں اسلامی اقدار کے مظاہر کے کا پہلا ہی موقع ضائع کر دیا گیا جس سے بڑے سنگین شکوک و شبہات ابھرے کہ جیسا کہ اعلان کیا جاتا رہا۔ کیا واقعی مطالبہ پاکستان کے پس پردہ کوئی مخلصانہ مقصد کار فرما تھا؟ انسانی فطرت اپنے اعمال کے لئے کتنی طرح کے مسکت بہانے تراش لیا کرتی ہے مگر اس سب کے باوجود ضمیر کی چھوٹی سی خاموش زبان کو چُپ نہیں کرایا جاسکتا۔

”حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کی کار فرمائیوں سے آگاہ ہے۔ اس کے

باوجود وہ (کتنی طرح کے) بہانے تراش لیتا ہے۔“ (سورۃ ۵۵ آیت ۱۵ - ۱۶)

جس طرح مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو نکلنا پڑا اسی طرح مغربی پنجاب سے غیر مسلموں کو نکال دیا گیا انہیں نکلنا پڑا۔ فرار کی اس انفرافری میں انہیں اپنے منقولہ اثاثے اپنے گھروں میں چھوڑنا پڑے مشرقی پنجاب سے مسلم ہاجرین کی بڑی تعداد روزانہ بے سروسامانی اور تحیف و نزار جسمانی حالات میں مغربی پنجاب میں آرہی تھی جن میں سے بہت سے شدید زخمی بھی ہوتے تھے۔ انتظامیہ، عوام الناس، پراثریٹ تنظیموں، ایجنسیوں اور انفرادی طور پر لوگوں نے ان ہاجرین کو روٹی، کپڑا



اور ملکان کے علاوہ ہر قسم کی دوسری امداد بھی بہم پہنچاتی یہاں بھی ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہوا۔ ظاہر ہے کہ مغربی پاکستان سے جانے والے غیر مسلم باشندوں کے چھوڑے ہوئے اثاثے انتظامیہ نے اپنے قبضے میں لے لئے تھے اور انہیں مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلم ہجرت کی آباد کاری کے مقصد کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا جبکہ ایک اعلیٰ سطحی سمجھوتہ دونوں ملکوں کی انتظامیہ کے درمیان عمل میں آنا تھا۔ غیر منقولہ اثاثوں کے معاملات تو کم و بیش اطمینان بخش طریقے میں جلد ہی نمٹاتے گئے مگر منقولہ اثاثوں کو اس قدر تیزی اور مطلوبہ کمزوری نگہانی کے تحت سنبھالنے کا کام ممکن نہیں پایا گیا۔ اس کے نتیجے میں ان اثاثوں کی نوعیت کے باعث ٹوٹ مار کو فروغ ملا۔ اس ٹوٹ مار کے مرتکب غریب اور اپنا سب کچھ لٹا بیٹھنے والے لوگ نہیں تھے بلکہ اکثر و بیشتر ایسے لوگ تھے جو کسی چیز سے محروم نہ تھے اور نہ ہی انہیں کسی نقصان کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ لوگ مقامی بااثر ہاجروں کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض تو معروف اور خوشحال لوگ تھے۔ ان مردہ غور بدر و جوں نے اپنے منہ لگی سٹری بسا نہ مارتی ہوتی لاشوں کے گوشت سے بھر لئے جو اخلاقی کوڑھ سے سڑا ہوا تھا اور بے شک انہوں نے یہ زہر اگلی نسل میں منتقل کر دیا۔

اسلام بتاتا ہے کہ انسان جسم، ذہن اور روح کا مجموعہ ہے اور یہ کہ یہ عناصر مسلسل ایک دوسرے کو اپنا رد عمل منتقل کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بد عنوان ہو جائے تو دوسرے بھی بد عنوان ہو جاتے ہیں۔ ایک مکمل طور پر صحت مند جسم کی کارکردگی کے لئے اسلام قواعد و ضوابط مقرر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کھانے پینے کے اصول مرتب کرتا ہے۔ ان چیزوں کے استعمال سے روکتا ہے جو نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور ہدایت کرتا ہے کہ خالص اور مکمل غذا میں بھی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنی چاہئیں۔

”اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو (رزق) دیا ہے اس میں سے حلال چیزوں میں سے جو چاہو (آزادی کے ساتھ) کھاؤ اور اللہ کے احکام کی پیروی کرو جس پر تم یقین رکھتے ہو۔“ (سورۃ ۵ آیت ۸۹)

”اے بنی نوع انسان زمین میں حلال چیزوں میں سے جو چاہو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔“ (سورۃ ۲ آیت ۱۶۹)



”اے آدم کے بیٹو! اپنے ذہنوں اور جسموں اور عبادت گاہوں کو ہر بار پاک صاف کر لیا کرو اور حلال چیزوں میں سے جو چاہو کھاؤ مگر اعتدال سے نہ گزر جانا۔ یقیناً وہ (اللہ) اعتدال سے گزر جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔“  
(سورۃ ۷، آیت ۳۲)

”اللہ نے تمہیں جو حلال اور طیب چیزیں عطا کی ہیں ان میں سے جو چاہو کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ اور وہی تو ہے جس کی تم عبادت کرتے ہو۔“  
(سورۃ ۱۶، آیت ۱۱۵)

”حلال اور طیب چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں ہدایت میں اور نافرمانی نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرا عذاب تم پر نازل ہو جائے۔ اور وہ جس پر میرا عذاب نازل ہو جائے یقیناً تباہ و برباد ہو جائے۔“ (سورۃ ۲۰، آیت ۸۲)  
اور اب حرام کی ایک تشریح :-

”اے ایمان والو! شراب نوشی، بخواء، بت پرستی اور (مشرکانہ بدعتیں) جادوگری تو شیطان کے جیلے اور تدبیریں ہیں۔ اس لئے ان سب سے باز رہو تاکہ تم بھولو پھلو۔“ (سورۃ ۵، آیت ۹۱)  
جائیداد اور اثاثوں کے حصول اور ان کی تقسیم کے لئے سخت قواعد مقرر کئے گئے ہیں جائیداد صرف قانونی اور جائز ذرائع سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر :-

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ مگر تم باہمی رضامندی سے تجارت کر سکتے ہو۔ اور نہ ہی (ایسا کر کے) خود کو ہلاکت میں ڈالو۔ یقیناً اللہ تم پر رحم کرنا چاہتا ہے۔ مگر تم سے جو کوئی بھی ناجائز طریقے سے اور انصافی سے دوسروں کا مال کھاتے گا ہم اسے (جہنم کی) آگ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔“ (سورۃ ۴، آیت ۲۰-۲۱)

”آپس میں ایک دوسرے کا مال حرام طریقوں سے نہ کھاؤ اور نہ ہی دھوکہ اور غلط بیانی سے کام لو۔ نہ ہی اپنی دولت کو رشوت کے طور پر حاکموں کو پیش کر دو تاکہ تم دوسروں



کے مالوں کو نا انصافی کے ساتھ ہتھیالو۔“ (سورۃ ۲: آیت ۱۸۹)

یقیناً وہ لوگ جو یتیموں کا مال نا انصافی کے ساتھ کھاتے ہیں تو وہ اپنے پیٹوں کو

آگ سے بھرتے ہیں اور وہ دہکتی ہوئی آگ میں ڈالے جائیں گے۔“ (سورۃ ہم آیت ۱۱)

یہاں اس بات پر زور دیا جاسکتا ہے کہ تشدد اور لوٹ مار میں عورت عوام الناس کی اکثریت اسلامی اقدار سے نا بلکہ سختی۔ مگر بالواسطہ طور پر یہ اس بات کا اعتراف ہو گا کہ پاکستان کی بنیاد ہی موجود نہ تھی۔ درحقیقت پاکستان کے قیام کی اصولی مخالفت کرنے والوں کی دلیل یہی تھی کہ بیسویں صدی کے وسط میں ایک ایسی ریاست کے قیام کا تصور ہی فرسودہ تھا جس کے نظریات اور اقدار کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہو۔ اس سے انتشار پھیلے گا۔ مذہب ایک جدید ریاست کے لئے اب ہمہ جہتی اقدار اور معیاروں کا خزانہ نہیں ہو سکتا جس کی جدید ریاست کو اپنے شہریوں کے سلسلے میں عائد ہونے والے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ضرورت ہے اور نہ ہی یہ زندگی کے تمام شعبوں میں لوگوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھ سکتا ہے۔ اس نظریے کو پاکستان کے تجویز کنندگان نے چیلنج کیا اور اس کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس کے جواب میں دعویٰ کیا گیا کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں اور دقت کے ہر مرحلے پر رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔

مصطفیٰ اس دعویٰ کی مکمل طور پر تائید کرتا ہے۔ مگر اس کی مقبولیت کا انحصار اس کے عملی مظاہرے پر ہو گا اور یہی وہ مقام ہے جہاں ناکامی ہوتی۔ اگر عوام اس وقت اسلامی اقدار سے آگاہ نہیں تھے جب پاکستان کے قیام کا دعویٰ کیا جا رہا تھا اور اس کے لئے شدت کے ساتھ کوششیں کی جا رہی تھیں تو کم سے کم یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت یہ دعویٰ قبل از وقت تھا۔

تاہم اس بات کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قرارداد لاہور کی منظوری اور اگست ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے درمیان کے عرصہ میں مسلم قیادت کی تمام تر توانائیاں قیام پاکستان کی جدوجہد کی طرف مبذول رہیں اور یہ کہ مسلم عوام کی اسلامی اقدار سے متعلق تعلیم و تربیت اور رہنمائی کی طرف توجہ دیتے کا وقت نہیں ملا۔ مزید برآں عثمان بے خبری میں ۱۹۴۷ء کی آفت کی لپیٹ میں آ گئے اور حالات و واقعات کی تیز رفتاری اور دباؤ نے قیادت کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ہی فراہم نہ کیا۔ جذباتی طور پر اٹھ کھڑے ہونے والے قیادت سے محروم جو نظم و ضبط کی پابندیاں مشکل ہی



سے قبول کرتے ہیں۔ یہ سب سے شدت سے پوچھا جانے والا سوال ہے اور یہی الزام کی شدت کو کم کرنے کے لئے جواز کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برقیغیر کا اوسط درجے کا مسلمان اسلامی ثقافت کی بنیادی اقدار کے سوا اعلیٰ اخلاقی اور روحانی اقدار سے یکسر نا بلد تھا۔ صدیوں کی لاپرواہی کے نتیجے میں ہونے والے نقصان کی تلافی کے لئے گزشتہ برسوں میں صورتحال کی اصلاح کے لئے تعلیم، رہنمائی اور تربیت کی غرض سے ایک وسیع تر اور مسلسل تحریک بلاتاخیر شروع کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کا احساس ۱۹۷۰ء کے میگل فریم ورک آرڈر میں بھی کیا گیا جس کی شق ۲۲ میں کہا گیا تھا کہ آئین ملکی پالیسی کے رہنما اصول متعین کرے گا جن کے تحت ملک کی مندرجہ ذیل معاملات میں رہنمائی کی جائے گی۔

(۱) اسلامی طرز زندگی کا فروغ۔

(۲) اسلامی اخلاقی اقدار کا نفاذ۔

(۳) پاکستان کے مسلمانوں کو قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم دینے کی سہولیات بہم پہنچانا۔

امید کی جاتی ہے کہ مذکورہ مفید مقاصد کا حصول محض ایک مقدس خواہش تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کے حصول کے لئے ایک زوردار تحریک چلائی جائے گی جو کبھی ماند نہیں پڑنے دی جاتے گی۔ ابھی تک اس اہم ضرورت کی جانب انتظامیہ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک جو بھی کوشش کی گئی ہے اس کا تعلق فرقہ وارانہ مذہبی تنظیموں اور مخیر افراد اور ارادوں کی کوششوں تک ہی محدود رہا ہے۔ بعض معاملات میں تو ایسا بھی ہوا ہے کہ جہاں معیار کے اعتبار سے یہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ وہاں تعداد کے لحاظ سے یہ ناکام ثابت ہوتی ہے جو اگرچہ بے حد قیمتی اور اہم ہے مگر جہاں اس کے سمندر کی ضرورت ہے اس کے مقابلے میں یہ بالکل بے مایہ رہی ہے۔





## ۱۰

پاکستان نہ تو مُردہ بچے کی شکل میں معرض وجود میں آیا اور نہ ہی اسے تخلیق کے بعد کسی مصنوعی نگہداشت کے ماحول میں رکھنے کی ضرورت پڑی بلکہ اس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنی تمام سنگین مشکلات پر قابو پایا اور بھرپور ترقی کی راہ پر گامزن بھی ہو گیا۔ ہندوستان کے ساتھ اس کے دو بڑے تنازعات کی وجہ سے جن کا تعلق کشمیر اور دریائے سندھ اور اس کے دو معاون دریاؤں ستلج اور بیاس کے پانیوں کی تقسیم سے تھا۔ اسے اپنی ترقی کی راہ میں کسی حد تک مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر اس سے پاکستان کو اپنی آزادانہ پالیسیوں کی تشکیل اور بین الاقوامی معاملات میں اپنا الگ موقف اختیار کرنے سے نہیں روکا جاسکا۔ اقتصادی شعبے میں ترقی کی رفتار حوصلہ افزا تھی۔ ابتدائی سفر مغربی پاکستان کے لئے مشرقی پاکستان کی نسبت آسان تھا۔ پہلے عشرے کے اختتام پر اس شعبے کی حد تک صورتحال اول الذکر کے لئے موخر الذکر کی نسبت زیادہ موافق تھی۔ ایوب خان کے دور میں مشرقی پاکستان میں ترقی کی رفتار تیز ہو گئی اور اس نے مغربی پاکستان کو پیچھے چھوڑنا شروع کر دیا۔ یہ صورتحال جو کہ جاری تھی اس قدر غیر تسلی بخش نہیں تھی مگر ایک پریشان کن عنصر، ہندوستان کے مقابلے میں بھاری بھر کم فوجی تیاری کو برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ اس کے جواب میں مشرقی پاکستانیوں کے دہنوں میں رد عمل پیدا ہوا۔

عام ملکوں کے مقابلے میں پاکستان پر فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ کہیں زیادہ تھا۔ یہ قرآن مجید اور رسول اللہ کی زندگی کے مطابق پاکستانیوں کی زندگیوں کو ڈھالنے کا پابند اور علمبردار تھا۔ پاکستان کی پالیسیوں کی تشکیل میں اس فرض کی ادائیگی کے حوالے سے کس حد تک شعور موجود تھا اور پاکستانی مسلمانوں کے ”قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق زندگیاں گزارنے“ کے لئے کیا اقدامات کئے گئے تھے؟



وعدے کو غیر سنجیدگی سے پورا نہیں کیا جاسکتا۔  
 ”اپنا ہر عہد پورا کرو کیونکہ تم سے اس کی بازپرسی کی جائے گی۔“

(سورۃ ۱۷ آیت ۳۵)

”خدا کے ساتھ کئے گئے وعدے کی بازپرسی کی جائے گی۔“

(سورۃ ۲۳ آیت ۱۶)

”اللہ کے ساتھ وعدے کو پورا کرو جو تم اس کے ساتھ کر چکے ہو۔ اور اپنے عہدوں کو بچتہ کرنے اور اللہ کو یقین دہانی کرانے کے بعد انہیں مت توڑو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔“ (سورۃ ۱۶ آیت ۹۲)

مومنوں کی صفات میں شامل ہے: ”وہ اپنے وعدوں اور عہدوں کی پاسداری کرتے ہیں۔“ (سورۃ ۲۳ آیت ۹ اور سورۃ ۷۰ آیت ۳۳)

ایک جدا گانہ مملکت عطا کئے جانے کی دعا کرنے اور اللہ کی نعمت پاکستان کی صورت میں عطا کئے جانے کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کا اولین اور سب سے بلند تر نصب العین اُس وعدے کی تکمیل ہونا چاہیے تھا جو انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا کہ وہ خود کو اُن اقدار سے روشناس کریں گے جن کی بالادستی اور جن کے نفاذ کے لئے انہوں نے ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔  
 بندے کے لئے سب سے مقدم اپنے رب کی فرمانبرداری ہے۔

”میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں۔“

(سورۃ ۵۱ آیت ۵۷)

عربی لفظ عبادت کا اصل مکمل فرمانبرداری کو بیان کرتا ہے جس طرح ایک نوکر اپنے مالک کی خواہشوں کا نمونہ بن جاتا ہے چنانچہ انسان کو اس لئے تخلیق کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنے۔  
 ”اے بنی نوع انسان! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور اُن

لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم ہر باتوں سے بچ سکو۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۲)

تمام انسان ایک ہی خدا کے بندے ہیں اور یہ ان کی انسانیت کی قدر مشترک ہے۔ یہ صرف اس زندہ حقیقت کا شعور ہے کہ ہر انسان میرے خدا کی مخلوق ہے جو انسانوں کے مختلف طبقوں کے درمیان



اتفاق رائے پیدا کرتا ہے۔ خدا کے وسیلے سے انسان کا دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق ہی وہ رابطہ ہے جو انسانیت کو متحد کرنے کا فرض انجام دے سکتا ہے اور اختلاف رائے کو ختم کر سکتا ہے۔ صرف یہی وہ بندھن ہے جو باقی رہ سکتا ہے اور ہر کشمکش اور بحران پر قابو پا سکتا ہے۔ خلی کر قریبی رشتہ دار ہیں اور انتہائی گہری دوستیاں تک ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو سکتی ہیں۔

”اتم سب اللہ کی رستی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ بازی نہ کرنا۔ اور اپنے رب کی مہربانی کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اُس نے اپنی عظمت سے تمہارے دلوں کو محبت سے بھر دیا اور تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے تم آگ کے گڑھے کے رہانے پر پہنچ چکے تھے اور اس نے تمہیں بچا لیا۔ اس طرح اللہ تم پر اپنے احکامات واضح کرتا ہے تاکہ تم رہنمائی حاصل کر سکو۔ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ اچھائی کی طرف بلا تے، بھلائی میں شریک ہو اور بُرائی کو روکنے والی ہو۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو چھوٹیں پھلیں گے۔“

(سورۃ ۲ آیت ۱۰۴-۱۰۵)

یہ آیات مبارکہ آپس میں اُس اخوت کا تقاضا کرتی ہیں جس طرح ایک ریشمی ڈوری میں موتی ایک ساتھ پروتے ہوئے ہیں۔ اس کی خلاف ورزی کچھ ہوتے منتشر گر وپوں اور لونیٹوں کی صورت ہوگی جو آگ کے گڑھے میں گر جانے کے خطرے سے دوچار رہیں گے۔

کیا کوئی مثال اس سے بھی نوثر اور دلنشین پیرائے میں بیان کی جا سکتی ہے؟ اللہ کی رستی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے کے فوائد اس قدر وسیع ہیں کہ ان کی کوئی انتہا نہیں۔

اقدار کے اس نظام میں خالق کائنات کے ساتھ وفاداری اولین اور بنیادی شرط ہے۔ دوسری تمام اقدار اس کے تحت آتی ہیں۔ درحقیقت دوسری اقدار اسی وقت درست اور جازب ہیں جب وہ اس اعلیٰ ترین قدر کے تحت ہوں۔ یقیناً مجھے راست بازی کو قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو راست بازی پسند ہے اور یہ اُس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مجھے بُرائی سے نفرت اور اس کی مذمت کرنی چاہیے کیونکہ یہ مجھے اللہ سے دُور کر دے گی۔ قرآن حکیم اس بنیادی ترغیب کا بار بار اعادہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:-



”سچا وہ ہے جو اُس کے ساتھ کئے گئے وعدے کو پورا کرتا ہے اور جو اللہ کی طرف سے عائد کئے گئے فرض کا خیال رکھتا ہے اور راست باز ہے۔ اور یقیناً اللہ راست بازوں کو پسند کرتا ہے۔“ (سورۃ ۳ آیت ۷۷)

”اللہ اپنے فرض کا احساس رکھنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔“

(سورۃ ۹ آیت ۸۳)

”اللہ صدقہ و خیرات کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔“

(سورۃ ۲ آیت ۱۹۶-سورۃ ۳ آیت ۱۳۵)

”اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو ہر ممکن حد تک اپنے فرض کا خیال رکھتے ہیں۔“

(سورۃ ۲ آیت ۲۲۳)

”اللہ صبر کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔“ (سورۃ ۲ آیت ۱۷۷)

”اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اُس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا لیکن اگر وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے سوا تمہاری مدد کر سکتا ہے؟ مومنوں کو اللہ ہی پر تکیہ کرنا چاہیے۔“

(سورۃ ۳ آیت ۱۶۰-۱۶۱)

”وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور اللہ سے ڈرتے رہے اور اپنے فرائض بجالاتے رہے یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہوں گے۔“ (سورۃ ۲۴ آیت ۵۳)

”اللہ کے حضور اپنے فرائض بجالانے والے کے لئے اللہ مشکلات سے نکلنے

کی راہ پیدا کر دے گا اور اُس وقت اُس کو (امداد) بھیجا کرے گا جب اسے اس کی توقع نہ ہو۔ جو اللہ پر تکیہ کرتا ہے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ اور اللہ یقیناً اپنا مقصد حاصل کر لے گا (مگر) اللہ نے ہر چیز کے لئے کوشش مقرر کر رکھی ہے۔“

(سورۃ ۶۵ آیت ۲-۴)

”اللہ کے حضور اپنے فرائض بجالانے والے بندے کے لئے اللہ آسانیاں

پیدا کر دے گا۔“ (سورۃ ۶۵ آیت ۵)



”اللہ کے حضور اپنے خرافقہ بجالانے والے بندے کے لئے اللہ تمام برائیوں کو دور کر دے گا اور اس کے اجر میں اضافہ کر دے گا۔“ (سورۃ ۶۵ آیت ۶)

دوسری طرف ”اللہ انتشار اور بدامنی کو پسند نہیں کرتا۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۰۶)، اور نہ ہی ان کو جو بدامنی پھیلاتے ہیں۔ (سورۃ ۵ آیت ۶۵)، اور برائیاں کرنے والوں کو (سورۃ ۲۸ آیت ۷۸)، نا انصافی کرنے والوں کو (سورۃ ۲ آیت ۱۸۱)، گناہگاروں کو (سورۃ ۳ آیت ۵۷ اور سورۃ ۴۲ آیت ۴۰)، قانون شکنی کرنے والوں کو (سورۃ ۲ آیت ۱۹۱)، حدود سے بڑھ جانے والوں کو (سورۃ ۷ آیت ۵۶)، مسلم کافروں اور عادی گناہگاروں کو (آیت ۲ سورۃ ۲۷۷)، حملہ آوروں کو (سورۃ ۲۸ آیت ۷۷)، جارحیت کرنے والوں کو (سورۃ ۱۶ آیت ۲۴)، بے بنیاد دعویٰ کرنے والوں کو (سورۃ ۳۱ آیت ۱۹ اور سورۃ ۵۷ آیت ۲۴)، اور دھوکہ دہی کرنے والوں کو (سورۃ ۸ آیت ۵۹)۔

کچھ اقدار ایسی ہیں کہ ان کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور کچھ منفی اقدار کو ختم کرنا ناگزیر ہے۔ نہ تو ان میں مستقل شمولیت اختیار کی جاتی ہے اور نہ ہی انہیں مکمل طور پر ختم کیا جاتا ہے۔ شمولیت کے لئے منتخب کی جانے والی اور شرکت سے باز رہنے والی اقدار کی ایک درجہ بندی ہے جو اللہ کی رضا کے متلاشی انسان کو انسانی کاوشوں کے دوران اس راہ میں اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو دور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ایک ایسا نظام موجود ہے جو مشق اور تربیت کے راستہ کا کام دیتا ہے۔

”اللہ تم کو انصاف کرنے اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔“ (سورۃ ۱۶ آیت ۹۷)

اس سسٹم پیلنے کے آخر میں سرکشی اور قانون شکنی ہے یعنی جان، مال، وقار، سلامتی اور فرد کے ذہنی سکون یا معاشرے اور انسانیت کے خلاف ہر قسم کی قانون شکنی۔ کسی بھی مہذب ملک میں اس قسم کا رویہ قابل مواخذہ جرم مناسب ہے۔ ملکہ قانون کی پشت پر سزا کی قسم عموماً ایسی ہوتی ہے جو آج کے دور



میں بڑے پیمانے پر ہونے والے جرائم کے خلاف اکثر صورتوں میں ایک موثر انسدادی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کی جاسکتی۔ علاوہ انہیں جرم کے ثبوت کے لئے کارروائی کے اختتام پر قانون کے تحت سزا دینے سے قبل شہادتوں کو پکھا جاتا ہے تاکہ جلد باری یا غلط فیصلے کے خلاف تحفظات فراہم کئے جاسکیں۔ یہ قانون کی خامی نہیں ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ قانون کھلی جوتی برائی موجود ہونے کے باوجود اس کو مکمل طور پر روکنے کے کبھی قابل نہیں ہوتا۔

اس کے بعد غلط رویے کا نمبر آتا ہے۔ یعنی ایسا طریقہ عمل جو دوسروں کو ناراض یا مشتعل کرے، بڑے اطوار اور غنڈہ گردی وغیرہ۔ اس کا زیادہ تر دائرہ کار سول قانون کی گرفت ہی میں نہیں آتا۔ اور آخر میں یہ کہ نہ صرف غلط رویے کی مکمل ممانعت کر دی جاتی ہے بلکہ بُرائی کے مانع کو بُرائی سے بچنے، بُرائی میں ملوث ہونے اور بُرے خیالات کے خلاف پابندیاں عائد کر کے اسے صاف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ان پابندیوں کی پشت پر اللہ کی ناراضگی کا عنصر کارفرما ہوتا ہے جس کا ایک مومن کے ذہن پر سب سے قوی اور سب سے موثر اثر ہوتا ہے جو خدا کی ذات پر اخلاص کے ساتھ یقین رکھتا ہے اور جس کی زندگی کا واحد مقصد ہی محض اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔

تاہم صرف بُرائی سے بچنے ہی کی مسلمان سے توقع نہیں کی جاتی۔ درحقیقت یہ اُس کا نصف بھی نہیں ہے جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ بلکہ مقصدِ حیات کو مکمل طور پر حاصل کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اور یہ بذاتِ خود اسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچاتے رکھے گی۔ مگر ایسا کر کے بھی وہ (مسلمان) اپنی منزل اور اپنے مقصدِ حیات سے بہت پیچھے ہوگا۔ اچھائی کرنے کے بعد بھی اسے نیکی کی سہی کرتے رہنا چاہیے۔ اسے نیکی کے لئے خود کو کامل بنانا چاہیے۔ درحقیقت بُرائی سے بچنا اور نیکی اختیار کرنا اگرچہ دو الگ الگ راستے ہیں مگر یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ایک سے دوسرے کو تقویت ملتی ہے دونوں کے مختلف مدارج ہیں۔

وسیع تر مفہوم میں نیکی کے بھی تین درجے ہیں۔ بنیادی یا اولین درجہ انصاف پسندی ہے۔ اور اس کا مفہوم بطور اصلاح کے بھلائی کے جواب میں بھلائی کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے اخلاقی فرض کی ادائیگی کہا جاسکتا ہے یعنی فرد کے ذمے عائد اخلاقی فرائض کی ادائیگی یا جیسا کہ روگے ویسا بھروگے



کا مقبول عام سنہری اصول۔

دوسرا بہتر درجہ خیر خواہی کا ہے۔ یعنی رضا کارانہ طور پر کسی صلہ یا توقع کے بغیر نیکی کرنے کی خواہش۔ تیسرا درجہ رضا کارانہ جذبے سے بھی آگے جا کر نیکی اور بھلائی کرنے کا ہے جیسے ایک ماں کے جذبات کا بہاؤ جو اسے اپنے بچے کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے لئے کسی شعوری کوشش کی ضرورت نہیں ہو کرتی۔ اس کے برعکس یہ ایک خوبی اور صفت کے طور پر کام کرتا ہے اور اگر اسے روکا جائے تو اس کے کرنے والے کو شدید مایوسی اور احساس ناکامی ہوتا ہے یہی وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

”اللہ ان سے خوش ہو گیا اور وہ اللہ سے خوش ہو گئے“ (سورۃ ۹۸ آیت ۹)

اللہ پر نہ تو کسی کی اجارہ داری ہے اور نہ ہی ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمام جہانوں کو تخلیق کیا، انہیں برقرار رکھتا ہے اور ان کی تکمیل کے لئے مرحلہ بہ مرحلہ ان کی رہنمائی کرتا ہے (سورۃ ۲ آیت ۲) لفظ اللہ خدا کا متبادل نام ہے اور قرآن حکیم میں اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ استعمال جامع ہے نہ کہ قابل تقسیم۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو آگاہ کر دیں۔

”ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نیکشف کیا گیا اور اس پر جو تمہیں بتایا گیا۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہے اور ہم اسی کی اطاعت کرتے ہیں“ (سورۃ ۲۹ آیت ۴۷)

رسول پاکؐ کو حکم دیا گیا کہ وہ اعلان کریں۔

”میں خدا کی نازل کردہ کتاب پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے تم لوگوں کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے ہمارا اور تمہارا آقا صرف اللہ ہے۔ ہم اپنے اعمال کے لئے اور تم لوگ اپنے اعمال کے لئے مجاہدہ ہو۔ ہمارے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور ہم سب کو اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے“ (سورۃ ۲۷ آیت ۱۶)

آج کے دور میں جہاں تک مادی اغراض و مقاصد اور پالیسیوں کا تعلق ہے تو ملکوں کے مختلف گروپوں اور اقوام کے مائدہ عقائد اور عودوں میں سے کسی کا انتخاب کرنے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر ہے جب مجر و خیالات کو ٹپوں شکل میں منتقل کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو اختلافات رونما ہوتے ہیں مگر یہ ہمارا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ تو اُس خاص ذمہ داری کو پورا کرنے سے متعلق ہے جو پاکستان پر ایک اسلامی



حکومت ہونے کی حیثیت سے قائم ہوتی ہے۔ پاکستان اپنے قیام ہی سے اسلامی اقدار کی سر بلندی اور اپنے تمام لوگوں کے فائدے کے لئے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کا پابند ہے۔ پاکستان کے معاملے میں مادی فوائد کا پہلو بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں تھلا سکتا بلکہ یہ اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھا اور اس حوالے سے یہ کم اہم نہیں ہے بلکہ یہ ان ملکوں کے حوالے سے کہیں زیادہ بڑھ کر اہم ہے جو مادی مقاصد کے حصول سے زیادہ کسی چیز کے حصول کا عزم نہیں رکھتیں۔

مثال کے طور پر ایک سرکاری ملازم کو اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں دیانت دار، باضمیر اور صحتی ہونا چاہیے کیونکہ یہ اس معاہدے کا حصہ ہے جس کے تحت اُس نے کسی ملک میں ملازمت حاصل کی ہے اور اس لئے سمجھی کہ اس کے فرائض کی بطریق احسن ادائیگی سے اس ملک، اس کے عوام اور خود اُس سرکاری ملازم کو فائدہ پہنچے گا۔ ایک مسلمان سرکاری ملازم کے معاملے میں یہ تمام تر وجوہات اور بھی مؤثر اور بلند تر ہو کر اس مقصد کے تحت آجاتیں گی کہ فرائض کی عمدہ طریقے سے ادائیگی سے اسے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی اور فرائض میں کوتاہی سے وہ اللہ کی ناراضگی مول لے گا۔

فرد کو دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملات میں دیانتدار ہونا چاہیے تاکہ اسے نیک نامی اور اچھی شہرت ملے اور اس لئے بھی کہ منصفانہ طرزِ عمل خود اس کے اپنے مفاد میں ہوگا اور اس سے اسے فائدہ پہنچے گا۔ ایک مسلمان کے لئے یہ سوچیں ضمنی ہیں۔ اسے اعلیٰ اخلاقی کردار کا معیار برقرار رکھنا پڑتا ہے کیونکہ ایسا کرنے میں ناکامی کی صورت میں اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

”ناپ اور تول میں کمی کرنے والوں کے لئے خرابی ہے جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیں کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ یہ ایک بڑے سخت دن کو اٹھاتے جاتیں گے جس دن تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔“ (سورۃ ۸۳ آیت ۲ تا ۷)

کسی بھی نارمل اور ہندبہ شخص کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ محبت اور نرمی کے ساتھ پیش آنا چاہیے کیونکہ یہ فطری تقاضا ہے اور اس لئے بھی کہ اس قسم کے طرزِ عمل سے گھر میں ہم آہنگی اور شادمانی پیدا ہوگی۔ مسلمان کو بھی ایسا کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے اللہ راضی ہوتا ہے اور اس معاملے میں کوتاہی سے اللہ ناراض ہوتا ہے۔



”اُن کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آؤ۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو (عجب نہیں) کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔“ (سورہ ہم آیت ۲۰)

”اور اُسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ (اُن کی طرف مائل ہو کر) آرام حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور مہربانی پیدا کر دی جو لوگ غور کرتے ہیں اُن کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔“ (سورہ ۲۰ آیت ۲۰)

نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے :-

تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ بہتر برتاؤ کرتا ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ایسا شخص جو دیانتداری کے ساتھ روزی کتا ہے اور اس سے اللہ کی رضا کے لئے اپنے اہل خانہ کی پرورش کرتا ہے تو ہر وہ فقیر جو وہ انہیں فراہم کرتا ہے اس پر اسے خیرات اور عبادت کا ثواب دیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ اسلام مقصد کی بندی اور خلوص کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ مسلمان کا رویہ ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے جس کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہو۔ اس قسم کا مقصد بُرائی کی ہر قسم کے خلاف مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ان اصولوں اور مقاصد پر کاربند شخص بحران کے زمانے میں بھی مشکوک اور کمزور رویے اختیار نہیں کرے گا جبکہ ان مقاصد سے محروم ایک عام کھوار کا آدمی دباؤ یا ترغیب اور تحریص کے سامنے گھٹنے ٹیک سکتا ہے۔ یہ اصول ملکوں کے معاملے میں بھی اُسی قدر درست اور سچا ہے کسی بھی ملک کی پالیسیاں اور طرز عمل اس کے سرکردہ سیاستدانوں کے اعلیٰ ترین اخلاقی معیار سے بلند تر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی عموماً اس کی سطح اسی قدر بھی بلند ہو سکتی ہے۔ پاکستان نے اپنے اسلامی ریاست ہونے کا اعلان کر کے خود اس کو اس امر کا پابند بنایا ہے کہ اس کے اندر تمام سرگرمیوں اور شعبہ ہائے زندگی میں تمام اعمال اور اقدار کو قرآن کے مطابق بنایا جائے گا جس کی توضیح و تشریح پیغمبر اسلامؐ نے کی ہے۔

پہلا کام جو سامنے آیا وہ آئین کی تشکیل تھا۔

آئین ساز اسمبلی کو آئین کی تشکیل میں نورس لگے اور جب اسے اپنا لیا گیا تو یہ مُردہ پیدا ہونے



والے پتے جیسا ثابت ہوا۔ اس دوران میں آئین ساز اسمبلی ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت تیار شدہ عبوری آئین کے تحت مجلسِ قانون ساز کی حیثیت سے بھی کام کرتی رہی عبوری دور میں ایسا کرنا اگر نہ تھا مگر یہ عرصہ مختصر ہونا چاہیے تھا چنانچہ کچھ عرصے بعد جب قانون ساز اسمبلی کی اہم مصروفیت بن گئی تو آئین سازی کے کام نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی۔

ایک اور عنصر جس نے بالواسطہ مگر بے حد یقینی طور پر اسمبلی کے پارلیمانی امور کی جانب زیادہ جھکاؤ میں اہم کردار ادا کیا وہ ستمبر ۱۹۴۸ء میں سر طحانؔ اور اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کی اموات کا دورہ اس وقت تھا۔ ان دونوں اعلیٰ شخصیتوں کے رخصت ہوجانے سے اسمبلی روز بروز اقتدار کے لئے جنگ کا اکھاڑ بنتی گئی۔

جب ۱۹۵۶ء میں آخر کار آئین نافذ کیا گیا تو اس کی روح اسلامی نہ رہی تھی بلکہ یہ عبوری آئین کا چربہ بن کر رہ گیا تھا۔ قرآن حکم دیتا ہے کہ سرکاری اختیارات اُن لوگوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں جو اس کام کے لئے سب سے عوزوں ہوں۔ جن لوگوں کو اس قسم کے اختیارات دیتے جاتیں انہیں تائید کی گئی ہے کہ وہ انہیں انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ استعمال کریں۔ ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دی گئی ہے کہ ان معیاروں سے انحراف کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ لوگوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ قانون کا احترام اور اس کی تعمیل کریں۔ اختلافات کو قرآن حکیم اور نبی اکرمؐ کے ارشادات و توضیحات کی روشنی میں حل کیا جائے۔ تمام اختیارات ایک امانت ہیں اور انہیں اسی جذبے اور روح کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیے۔

”خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے۔ بے شک خدا سُنَّا اور دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحبِ حکومت ہیں اُن کی بھی۔ اور اگر تم میں کسی بات پر اختلاف ہو تو اگر تم خدا اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اُس کے رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کرو۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا انجام بھی بہت

اچھا ہے“ (سورۃ ہم آیت ۵۹ تا ۶۰)



”حکومت کا نظم و نسق باہمی مشاورت سے چلایا جانا چاہیئے۔“ (سورۃ ۲۲ آیت ۳۹)

یہاں بنیادی شرط سرکاری اختیارات کے استعمال سے متعلق رکھی گئی ہے جس میں مقتضایہ انتظامیہ اور عدلیہ تینوں شامل ہیں مقتضی سب سے اہم مشاورتی ادارہ کے فرائض بھی انجام دے سکتا ہے۔ اس کے ارکان کی مقرر کردہ واحد استعداد جماعی سرکاری اختیار کے استعمال کے سلسلے میں دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے فرائض بطریق احسن ادا کرنے کے اہل ہوں۔ اس معیار کے حوالے سے جواب میں دو سطروں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس طرح حق راتے دہی کا استعمال ایک مقدس فرض بن جاتا ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ دو سطروں کی مناسب تربیت کا انتظام کیا جاتے۔ جب یہ سلسلہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں آگے بڑھ رہا ہو تو دو سطروں کو بعد کے مراحل میں ایک معقول انداز میں کنٹرول کرنا ضروری ہے جس کی بنیاد عملی تجربے پر رکھی گئی ہو۔ برطانیہ میں عالمگیر بالغ راتے دہی کے اصول کا فروغ ایک سست رفتار اور بتدریج عمل کے ذریعے ہوا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہ یہ کہا جا رہا ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی نہیں کر سکا۔ بلکہ اس بات پر انتہائی زور دینا مقصود ہے کہ جب تک حلقہ انتخاب کو واضح طور پر اس بات کا ادراک نہ ہو کہ اس سے کیا توقع کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں اس کے فرائض کی نوعیت کیا ہے تو یہ نظام اطمینان بخش طریقے سے کام نہیں کر سکتا۔ پاکستان کے معاملے میں فرض کی ادائیگی کی اس مقدس نوعیت پر اور بھی زیادہ زور دینے کی ضرورت تھی اور اس ذمہ داری کی بھی جس سے دو سطروں کو عہدہ برآ ہونا تھا مزید برآں دو سطروں میں اس فرض کی ادائیگی کے حوالے سے ان کے رویے کے احتساب کا احساس دلایا جانا بھی ضروری تھا۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن میں مذکور مقدس حوالہ جات کا ذکر محض زور خطابت یا نذر تحریر دکھانے کے لئے نہیں ہے۔ اس کا صورتحال کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ اور یہ یاد دہانی یا وارننگ کے طور پر یا غور و فکر وغیرہ کے مقصد کے تحت بیان کیے جا رہے ہیں۔ موجودہ صورتحال کے حوالے سے کہ اللہ سب کچھ سن رہا ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے دراصل ایک یاد دہانی ہے کہ اللہ مظلوم کو جس کے ساتھ مقدس احکامات کے برعکس زیادتی کی جاتے گی اس کی آہ و فغاں کو سننے کا اور یہ کہ وہ (اللہ) خود دیکھ لے گا کہ مظلوم کی آہ سُنی جاتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ اپنے دو ط کے حق کے استعمال کے انداز اور حوالے سے ہر دو ط



خود کو خدا کے سامنے جوابدہ پاتے گا۔ صرف اسی قسم کے احتساب کی واضح اور باشعور موجودگی میں راستے دہی کے حق کے دیانتدارانہ و الشہداء اور ایسے اہل افراد پر مشتمل ادارے کے قیام کو یقینی بنایا جاسکتا ہے جو انہیں ان کے ذمہ عائد کئے گئے فرائض کو پوری وابستگی اور ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے کے قابل بنا سکتا ہے۔

حق بالغ راستے دہی کا آفاقی اصول ایک آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کو مطلع نظر بنایا جاسکتا ہے اور جس کے حصول کے لئے مسلسل کوششیں کی جانی چاہئیں۔ اس کے بجائے یہ ایسی آزمائشی اصطلاح بن چکا ہے جسے اپنا تہیہ منی ہے مبادا ملک کو پس ماندہ اور احترام کے قابل نہ سمجھا جائے۔ دکھاوے کی غرض سے یہ ایک بالکل غلط خیال ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس قسم کے دوسرے بہت سے خیالات غلط ہیں۔ اور یہ بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اور ہو چکا ہے جب دوٹو غیر تربیت یافتہ اور جذباتی لوگ ہوں جو بڑے پیغمبر سیاست دانوں کے عیاری پر مبنی نعروں کے زیر سایہ ہوں تو حق بالغ راستے دہی کا مثالی اصولی ظلم، نا انصافی اور انسان کے لئے مصائب کا آلہ بن کر رہ جاتا ہے۔

پاکستان میں بھی اسی عمومی رجحان کی پیروی میں جدید پارلیمانی نظام کو وہ ناگزیر ڈھانچہ فراہم کئے بغیر اختیار کر لیا گیا جس کے بغیر پارلیمانی نظام کے کسی لحاظ سے بھی اطمینان بخش طریقے پر کام کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ آفاقی حق بالغ راستے دہی کا اصول ایک ایسی قوم کے لئے اختیار کرنا جو اس کے ساتھ وابستہ ذمہ داری کے احساس سے بے بہرہ ہو دراصل طویل عرصہ میں تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

”بھلا جس شخص نے اپنی عمارت کی بنیاد خوفِ خدا اور اس کی رضا پر رکھی وہ اچھا ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد گرجانے والی کھائی کے کنارے پر رکھی کر وہ اُس کو دوزخ کی آگ میں لے گری۔“ (سورۃ ۹ آیت ۱۰۹)

وہ لوگ جن کو انتظامی اور عدالتی اختیارات دیتے گئے ان پر بھی فرما دیا گیا کہ وہ اپنے اختیارات کو انصاف کے ساتھ استعمال کریں۔ آیت کے ابتدائی الفاظ بتاتے ہیں کہ جہاں تک دنیاوی اختیارات کا تعلق ہے اس کا ماخذ عوام ہیں۔ یہ عوام ہی ہیں جنہیں کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں پر اعتماد کا اظہار کریں جو ان فرائض کی ادائیگی کے لئے سموزوں میں۔ پھر جن کے ہاتھوں میں اقتدار سونپا جاتا ہے اُن کو



اس بات کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس اقتدار یا اختیار کو انصاف کے ساتھ استعمال کریں۔  
اسلام عدل کا انتہائی اعلیٰ تصور پیش کرتا ہے۔ انصاف دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ  
کیا جانا چاہیے۔

”اے ایمان والو! خدا کے لئے انصاف کی گواہی دینے کھڑے ہو جایا کرو  
اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ  
بھی پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب  
اعمال سے باخبر ہے۔“ (سورۃ ۵ آیت ۹)

عدل و انصاف کے قیام کے لئے سچی گواہی کا میسر آنا بنیادی عنصر ہے۔ قرآن حکیم نے اس پر  
بہت زور دیا ہے۔

”اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لئے سچی گواہی دو خواہ  
اس میں تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ اگر کوئی امیر ہے  
یا فقیر تو خدا ان کا غیر خواہ ہے۔ سو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا۔ اگر  
تم سچ کو چھپاؤ گے یا اس سے بچنا چاہو گے تو (جان رکھو) خدا تمہارے سب کاموں سے  
واقف ہے۔“ (سورۃ ۴ آیت ۱۳۶)

غیر منقسم ہندوستان کے عہد ہی سے اعلیٰ سطحی عدلیہ کی آزادی اور دیانتداری ایک روایت بن  
چکی تھی جو پاکستان کو وراثت میں ملی اور جس کو قیام پاکستان کے بعد بھی برقرار رکھا گیا۔ فوجداری مقدمات  
کا فیصلہ کرنے والی ماتحت عدالتیں تب اور اب تک انتظامیہ کے کنٹرول میں تھیں اور یہ انتظامیہ کی  
جانب سے وقتاً فوقتاً دباؤ کے قوی شہرے آزاد نہیں رہی ہیں۔ تادم تحریر یعنی نومبر ۱۹۷۲ء میں آئین  
کے زیر غور مسودہ کے مطابق عدلیہ کو انتظامیہ سے مکمل طور پر الگ کر دینے کی تجویز رکھی گئی ہے۔  
یہ صحیح سمت میں ایسا اقدام ہے جو بہت عرصہ پہلے کیا جانا چاہیے تھا۔

تاہم سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ جھوٹی شہادت دینے کا ہے جو پورے برصغیر میں  
وبائی مرض کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ سنگین اخلاقی بد نظمی ہے جو انصاف کی بنیادوں کو ہلاک رکھ دیتی  
ہے اور جس کی جانب ان تمام لوگوں کو سنجیدگی کے ساتھ فوری طور پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے جو



پاکستان کے عوام کی اخلاقی صحت اور خوشحالی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بد قسمتی سے اب تک اس سلسلے میں کی جانے والی کوئی بھی کوشش اسے ختم کرنے میں ناکام رہی ہے۔

انتظامی مشینری کے کئی شعبوں میں بد عنوانی کے اسے ناکارہ بنا رکھا ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنے دور حکومت کے آغاز میں انتظامیہ سے بد عنوانی ختم کرنے کے لئے بھرپور کوشش کی اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی رہے مگر اس دور حکومت کے تقریباً وسط کے دوران سیاسی پارٹیوں کی بحالی کے بعد سے صورتحال بڑی حد تک نرم ہو گئی اور جلد ہی پُرانی چیزیں اور معمولات دوبارہ اُسی افسوسناک ڈگر پر چل نکلے کئی لحاظ سے تو یہ مرض اس عہد سے پہلے موجود حالات سے بھی شدید تر ہو گیا جنرل یحییٰ نے ایسے متعدد آئینہ سرون کے خلاف کارروائی کی جن پر بد عنوانی کا شبہ تھا۔ اور موجودہ حکومت (بھٹو حکومت) نے اس سے بھی کہیں زیادہ بڑی تعداد میں نااہلی اور بد عنوانی کی بنیاد پر لوگوں کو ملازمتوں سے الگ کیا ہے۔ مگر یہ سب وقتی اقدامات تھے اور انہیں جانبداری سے یکسر پاک بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ کس حد تک مؤثر ثابت ہوتے ہیں یہ دیکھنا بھی باقی ہے۔

یہاں بھی بد نظمی کا تعلق اخلاقیات سے ہے اور اس سے اسی کے مطابق نمٹنا چاہیئے۔ اس کا واحد مؤثر طریقہ لوگوں میں اخلاقی شعور کو بیدار کرنا ہے تاکہ جھوٹی گواہی دینے والے، رشوت دینے اور لینے والے اور اسی قسم کی دیگر برائیوں کے مرتکب فرد کو احساس دلایا جاسکے کہ وہ جن لوگوں کے سامنے اٹھنا میٹھتا ہے اور زندگی گزارتا ہے اُس نے ان میں اپنا وفادار کھو دیا ہے جب تک بُرائی کو ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا تب تک کوئی دھمکی یا کسی قانونی سزا کا خدشہ بھی مؤثر ثابت نہیں ہو سکے گا۔ کوئی بھی قوم جو اعلیٰ اخلاقی روایات کا معیار برقرار رکھنا چاہتی ہے اُسے اس معاملے میں خبردار رہنا ہوگا۔ بد کرداری کو ناپسند کرنے میں ناکامی دراصل اخلاقی اور روحانی اقدار کے زوال کی علامت ہے جو پریشان کن ہے۔ قرآن حکیم نے پہلے لوگوں کی مثال دے کر اس پر زور دیا ہے :-

” (اور) بُرے کاموں سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہیں تھے۔

بلاشبہ وہ (ایسا کر کے) بُرا کرتے تھے۔“ (سورۃ ۵ آیت ۸۰)

کوئی شخص رشوت لینا یا اس کا مطالبہ کرتا ہے اور درحقیقت وہ بھی جو اس کی پیش کش کرتا ہے

اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس میں ایمان کی کمی ہے۔ ایسا شخص اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ فائدہ



پہنچانے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور یہ کہ اللہ ہی اپنی رحمت سے اپنی تمام مخلوقات کو رزق پہنچاتا ہے۔ ایسے شخص کا ایمان تو صرف روپے پیسے اور دوسرے مادی وسائل پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ انہی ذرائع کو ایک معیار اور طاقت سے منسوب کرتا ہے جو کہ دراصل صرف خدا سے تعلق رکھتی ہے :

”یقیناً وہ اللہ ہی ہے جو رزق دینے والا، زود آور اور قوی ہے۔“

(سورۃ ۵۱ آیت ۵۹)

ایسا شخص مملکت کی خدمت کا عہد توڑنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی دینداری اور سندھ کی خدمت کرنے کی عہد شکنی کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کے اس فعل سے انتظامیہ بدنام ہوتی ہے۔ اس کے طرز عمل کی خرابی سے اٹھنے والی لہروں کے دائرے پھیلتے ہی چلے جاتے ہیں۔

اس کا تعلق سماجی اقدار سے ہے جن میں موجودہ حوالے سے معاشی اقدار بھی شامل ہیں اور اس کے باعث قرآن و سنت سے روگردانی کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بُرائی کی کھلم کھلا نشاندہی کرنے کی بھی کئی نہیں مگر عمل منقود ہے۔ یہ بذاتِ خود شدید دوسلے پن کی علامت ہے جس کی قرآن نے شدت کے ساتھ مذمت کی ہے :

”اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو۔ خدا اس

بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔“ (سورۃ ۶۱ آیت ۲، ۳)

جب یہ عادت کردار کا حصہ بن جاتی ہے تو منافقت کہلاتی ہے۔ اور یہ ایسی بُرائی ہے جو شدید ترین عذاب کو دعوت دیتی ہے قرآن کا فیصلہ ہے :

”منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔“ (سورۃ ۴ آیت ۱۴)

اسلام اس بنیاد سے آغاز کرتا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور کسی کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہے اور یہ کہ طرۃ امتیاز صرف تقویٰ ہے۔

”اے بنی نزع انسان! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا

اور تمہاری توہین اور قبیلے بناتے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اور خدا کے نزدیک

تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بیشک خدا سب کو جانتے

والا اور سب سے خبردار ہے۔“ (سورۃ ۴ آیت ۱۴)



”نور اور وسعت حکمت خداوندی کا حصہ ہے مگر اس سے کسی کو فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔  
 ”اور اُسی کے نشانات (اور تصرفات) میں سے ہے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا۔  
 اور تہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لئے (ان باتوں میں)  
 بہت سی نشانیاں ہیں۔“ (سورۃ ۳۰ آیت ۴۴)

چنانچہ کوئی قوم یا گروہ رنگ، نسل، زبان یا وراثت کے لحاظ سے کسی دوسری قوم یا گروہ کو  
 خود سے کمتر تصور نہیں کر سکتا۔

”مومنو! کوئی قوم کسی (دوسری) قوم سے تمسخر نہ کرے۔ ممکن ہے وہ لوگ  
 اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتیں سے تمسخر کریں۔ ممکن ہے وہ اُن سے  
 اچھی ہوں۔“ (سورۃ ۴۹ آیت ۱۲)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:  
 ”عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، گودے کو کالے پر یا کالے کو گودے پر  
 کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ تم تمام ایک دوسرے کے بھائی ہو۔“

تعمیم ہندوستان کے موقع پر پنجاب جس بدامنی اور شورش کا نشانہ بنا اس کے دوران ہر کوئی  
 خوشی خوشی ہاجرین کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کر لے کے ساتھ ساتھ انہیں آرام اور تسلی دینے میں مصروف  
 تھا یہ ہاجرین انتہائی کمپرسی کے عالم میں اپنا سب کچھ ڈاکر پاکستان پہنچے تھے اور ان کی حالت بہت  
 خستہ تھی۔ ان میں سے اکثر بری طرح زخمی اور معذور تھے۔ کسی اقیانوس کے بغیر انسانیت کا وہ مظاہرہ دلوں کو  
 گردا دینے والا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں بلاشبہ وہ لحاظ سے روشن لمحہ تھا۔ جب سب کچھ خطرے میں تھا  
 اور اسی سب کی ضرورت تھی تب کسی میں کوئی تعصب نہ تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کو ٹھہر جانا چاہیے تھا۔ اسے  
 روک کر صدیوں پر پھیلا دینے کی ضرورت تھی اور اُس سے اس طرح استغاثہ کیا جانا چاہیے تھا کہ انسانیت  
 کی وہ رُوح جو بیدار ہو چکی تھی اسے ماند پڑنے یا بجھنے نہیں دیا جانا چاہیے تھا پھر ایک سچے اسلامی سماجی  
 اور اقتصادی نظام کی بنیاد رکھی جانی چاہیے تھی۔ بڑھانے والی جھٹی میں اس قدر مواد ڈالنا چاہیے تھا  
 کہ اس سے ایک نیا اور مکمل طور پر مفید ڈھانچہ معرض وجود میں آجاتا، مگر یہ موقع ضائع کر دیا گیا۔  
 مشکلات نے جو کچھ عطا کیا تھا اسے نظر انداز کر دیا گیا اور تین آسانی میں کھو دیا گیا۔ حضور نبی اکرمؐ



نے فرمایا تھا:

”میں اپنی قوم کے لئے مشکلات سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ میں اس کو ملنے والی

آسانوں سے ڈرتا ہوں۔“

اگر مشکل کا ایک بار مقابلہ کر لیا جاتے اور اس کو بانٹ لیا جاتے اور اسے ایک حلیج کی حیثیت سے خوش آمدید کہتے ہوئے زندگی کا دیکھ بٹا لیا جاتے تو بلند یوں کو چھوٹا آسان اور پُر لطف ہو جاتے جیسا کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے معاملے میں تھا۔

”وہ لوگ جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں۔ اور جو

کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور غلش) نہیں پاتے۔ اور ان کو اپنی جانوں

سے مقدم رکھتے ہیں خواہ وہ خود غریب ہی کیوں نہ ہوں۔ اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا

لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔“ (سورۃ ۵۹ آیت ۱۰)

ہمیں بھی ایسا ہی موقع فراہم کیا گیا تھا اور اگرچہ ہم اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے مگر ہم نے اس کو ایک مصیبت کے طور پر لیا اور پھر اسے فراموش کر دیا تاکہ ہم زیادہ آزادی کے ساتھ خود کو ان اغراض و مقاصد اور نظریات کے لئے وقف کر سکیں جو اب تک ہمارے ہاتھ نہ آ سکے تھے۔ ہم اس مرحلے کو ایک آزمائش اور امتحان کے طور پر پہچاننے میں ناکام رہے جو ہمیں ان مذموم اغراض سے دور رکھنے کے لئے نازل کیا گیا تھا تاکہ ہم ذاتی اغراض سے دُور رہ کر انسانیت کی بھلائی کے لئے کام کر سکیں اور خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔

”اور ہم کسی قدر خوف، بھوک اور مال و جان اور بچوں کے نقصان سے تباہی

آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔ ان لوگوں

پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر

جانے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے۔

اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔“ (سورۃ ۲ آیت ۱۵۶ تا ۱۵۸)

انسان کو موزوں صلاحیتوں اور اوصاف سے لیس کیا گیا تاکہ وہ ان کے مناسب استعمال سے

خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بھلائی اور فائدہ کا باعث بنے۔



”ہم نے انسان کو تکلیف (کی حالت) میں (محنت کرنے والا) بنایا ہے۔ کیا وہ خیال رکھتا ہے کہ اس پر کوئی تابو نہ پاتے گا؟ کہتا ہے کہ میں نے بہت سامان برباد کیا۔ کیا اُسے یہ لگتا ہے کہ اس کو کسی نے نہیں دیکھا بھلا، ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور زبان اور دوسو ہونٹ (نہیں دیئے)؟ (یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر و شر) کے دونوں راستے بھی دکھا دیئے۔ مگر وہ گھائی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ (یعنی محنت کی راہ نہ چلا اور مشکل کام نہ کیا) اور تم کہتے ہو کہ گھائی کیا ہے؟ کسی کی گردن کا چھڑانا (یعنی غلام کو آواز دکرانا) یا بھوک کے دن یتیم رشتہ دار یا فقیر مسکین کو کھانا کھلانا پھر ان لوگوں میں بھی (داخل ہوا) جو ایمان لاتے اور صبر کی نصیحت کی اور لوگوں پر شفقت کرنے کی وصیت کرتے رہے یہی لوگ صاحبِ سعادت ہیں۔“

(سورۃ ۹۰ آیت ۵ تا ۱۹)

”بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو نقطۂ مخلوط سے پیدا کیا تا کہ اُسے آزمائیں۔ تو ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔ (اور) اُسے راستہ بھی دکھایا۔ (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا۔“ (سورۃ ۷۶ آیت ۲ تا ۴)

”اور (نیکو کار) باوجودیکہ ان کو خود کھانے کی خواہش (اور حاجت) ہوتی ہے فقیروں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں کہ) ہم تم کو خالص خدا کے لئے کھلاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکر گزاری کے طالب۔ ہم تم کو اپنے پروردگار سے اُس دن کا ڈر لگتا ہے جو (چہروں کو) کریمہ النظر اور (دلوں کو) سخت مضطر کر دینے والا ہے۔ تو خدا اُن کو اُس دن کی سختی سے بچائے گا اور نازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔“ (سورۃ ۷۶ آیت ۹ تا ۱۲)

یہاں یہ تصور نہیں کیا جانا چاہیے کہ اسلام زندگی میں فلسفہ ربہانیت (ربکا دنیا) کا نفاذ کرنے والا دین ہے۔ درحقیقت یہ اس کی منہا بھی کرتا ہے (سورۃ ۵۷ آیت ۲۸) اسلام زندگی کو قبول کرنے پر زور دیتا ہے اور اس سے روگردانی کی اجازت نہیں دیتا؛



”پوچھو تو کہ جو زینت (اور آرائش) اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں ان کو حرام کس نے کیا؟“ (سورۃ ۷، آیت ۳۲)  
اسلام صرف اس بات سے منع کرتا ہے کہ کسی مقصد کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے اسے زندگی کا مطمح نظر اور مدعا بنالیا جائے۔

”لوگوں کو ان کی خواہشات کی چیزیں یعنی عورتیں، بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور رویشی اور کھیتی باڑی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔ (مگر) یہ سب دنیا ہی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔“ (سورۃ ۳، آیت ۱۵)

دولت اور جائیداد کے حصول سے منع نہیں کیا گیا۔ جائز ذرائع سے جس میں تجارت، صنعت، کان کنی اور زراعت وغیرہ شامل ہیں ان سب سے بھرپور انداز میں انفرادی یا شرکت کی بنیاد پر جماعتوں اور کارپوریشنوں کی شکل میں اجتماعی کام کر کے دولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ مگر ناجائز طریقوں سے منع کیا گیا ہے جیسے قمار بازی (سورۃ ۵، آیت ۹۱ تا ۹۲) رشوت (سورۃ ۲، آیت ۱۸۹) سود پر روپیہ دینا (سورۃ ۲، آیت ۲۷۶ تا ۲۸۲) اور دھوکہ دہی اور جعل سازی کے تمام ذرائع (سورۃ ۴، آیت ۳۰)

میان داری اور جائز طریقوں سے حاصل کردہ دولت ایک مقدس نعمت ہے اور تمام مقدس نعمتوں کی طرح اسے مفید کاموں اور مقاصد کے لئے خرچ کیا جانا چاہیے۔ اسلام جائیداد کی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے قانونی تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ کئی جاری فرائض بھی عائد کرتا ہے۔ ان میں سے بعض کو قانون کی مدد سے موثر بنایا گیا ہے جبکہ دوسروں کو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے رضا کارانہ طور پر ادا کیا جاتا ہے۔

”اسلام کے اقتصادی نظام کا مقصد یہ ہے کہ دولت مسلسل گردش میں رہے۔ اس کی تقسیم زیادہ سے زیادہ لوگوں میں ہو اور اس کو اس طرح استعمال کیا جاتے کہ اس سے لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو فائدہ پہنچے۔ اسے صرف خوشحال لوگوں کے درمیان ہی گردش نہیں کرتے رہنا چاہیے۔“ (سورۃ ۵۹، آیت ۸)



اس مقصد کے لئے کئے گئے بعض اقدامات خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔  
ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ یہ گردشِ زر کو روکتی ہے اور اس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچنے کا عمل ٹرک جاتا ہے۔

”اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے راستے میں خرچ نہیں کرتے۔ اُن کو اُس دن کے عذابِ الیم کی خوشخبری سنا دو جس دن وہ مالِ دوزخ کی آگ میں (غوب) گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے اُن (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور بیٹھیں داغی جاتیں گی (اور کہا جائے گا) کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ کچھو۔“ (سورۃ ۹ آیت ۳۴-۳۵)

”جو لوگ اپنا مال دن رات اور پوشیدہ اور ظاہر (راہِ خدا میں) خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کا صلہ پورہ دو گنا دے پاس ہے۔ اور ان کو قیامت کے دن نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ غم۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۷۵)

دولت کے تمام ذرائع۔ زمین، اس کی تمام تر صلاحیتیں اور خزانے سورج، چاند، سیارے، ہوائیں، جو بادلوں کو اُڑاتی پھرتی ہیں، بارش، زیرِ زمین پانی کے ذخیرے، دریا، سمندر سب کے سب خدا تے بزرگ و برتر کی جانب سے انسانیت کو تحفہً دیتے گئے ہیں۔ وہ کسی کی جاگیر نہیں ہیں۔ دولت ان ذرائع پر انسانی محنت اور مہارت اور سرمایہ سے پیدا کی جاتی ہے۔ اسلام کے مطابق پیدا کی جانے والی دولت صرف مہارت، سرمایہ اور محنت کے درمیان تقسیم نہیں کی جانی چاہیے۔ بلکہ اس کا ایک حصہ معاشرے کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے الگ سے مختص کیا جانا چاہیے۔ قرآن میں اس حصے کو زکوٰۃ کا نام دیا گیا ہے جو مال کو پاک کر دیتی ہے اور اس میں اضافہ کا سبب بھی بنتی ہے یہ سب سے بڑا ذریعہ آمدن ہے جسے ریاست کو اکٹھا کر کے عوام کی خدمت میں خرچ کرنا چاہیے۔ یہ پیدا شدہ دولت کو پاک کرتا ہے اور باقی ماندہ حصہ مہارت، سرمایہ اور محنت کے درمیان جائز طریقے سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ معاشرے کی بھلائی کے لئے خرچ کی جانے والی یہ رقم عوام کی فلاح و بہبود میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ مختلف اشیاء اور آمدنی کی اقسام کے اعتبار سے اس کی شرح مختلف ہو سکتی ہے مگر اوسطاً اس کی شرح دھاتی فیصد سالانہ ہے جو اسوال کی ظاہری قدر و قیمت کے لحاظ سے متعین کی جاتی ہے۔



زکوٰۃ سے مستفید ہونے والوں میں غریب اور ضرورت مند شامل ہیں۔

”اور ان لوگوں کا (حق ہے) جن کی تالیفِ قلب منظور ہے۔ اور غلاموں کو آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض اتارنے میں) اور خدا کی راہ میں مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کیا جانا چاہیے یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔“

(سورۃ ۹ آیت ۶۰)

کوئی مقصد یا دنیا ہی کام جس سے عوام الناس کو فائدہ پہنچے اس میں بھی زکوٰۃ کی رقم سے تعاون کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کا نظام وراثت دولت کی وسیع تر تقسیم کو فروغ دیتا ہے۔ دولت کو ماسوا سے فلاح و بہبود کے کاموں کے ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہونا چاہیے جو اپنی مفید نوعیت کے باعث اپنی افادیت خود ثابت کر دیتے ہیں۔ وصیت کی صورت میں بھی کوئی شخص ایک تہائی سے زائد اپنے مال و دولت پر اختیار نہیں رکھتا باقی دو تہائی ترکہ کو بھی مرحوم کے قرضوں اور دیگر واجبات کی ادائیگی کے بعد اس کے درمیان ان کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا ہے جن میں کسی کو کمی بیشی کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ نہ ہی مرنے والا ان حصوں میں کوئی ترمیم و اضافہ کر سکتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان مرنے والا اپنے پیچھے والدین، بیوہ، بیٹے اور پٹیلیاں چھوڑ جاتے تو وراثت میں اس کے پسماندگان کا حصہ مقرر ہے۔ ایک ہی قسم کا کوئی وارث اسی قسم کے کسی دوسرے وارث سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح ہر نسل میں مرنے والے کی جائیداد اس کے متعدد وارثوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو لوگ وارثوں میں شامل نہیں بھی ہوتے انہیں بھی ورثہ میں سے کچھ نہ کچھ مل جاتا چاہیے۔

”جو مال ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ مریں محوڑا ہو یا بہت اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی یہ حصہ خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ اور جب میراث کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج آجائیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دے دیا کرو اور ان کے ساتھ شیریں کلامی سے پیش آیا کرو۔“ (سورۃ ۴ آیت ۸-۹)

مال و دولت اور جائیداد کا انتظام و انصرام احتیاط کے ساتھ کیا جانا چاہیے اور خاص طور پر جب اس کے مالک نابالغ اور یتیم ہوں۔



”اور نادانوں (نابالغوں) کو اُن کا مال جسے خدا نے تم لوگوں کے لئے سبب معیشت بنایا ہے، مت دو۔ (مال) اس میں سے اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو۔ اور ان سے معقول باتیں کہتے رہو۔ اور یتیموں کو بالغ ہونے تک کام کاج میں مصروف رکھو۔ پھر (بالغ ہونے پر) اگر ان میں عقل کی کچھ دیکھو تو ان کا مال اُن کے حوالے کر دو۔ اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑے ہو کر تم سے اپنا مال واپس لے لیں گے) اس کو فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔ جو شخص آسودہ حال ہو اس کو (ایسے مال سے قطعی طور پر) پرہیز رکھنا چاہیے۔ اور جو بے مقدر ہو وہ مناسب طور پر (یعنی بقدر خدمت) کچھ لے لے۔ اور جب اُن کا مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو گواہ کر لیا کرو۔ اور حقیقت میں تو خدا ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔“

(سورۃ تم آیت ۶-۷)

”اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو (ایسی حالت میں ہوں کہ) اپنے بعد نکتے نہ بچتے چھوڑ جائیں اور اُن کو اُن کی نسبت خوف ہو (کہ ان کے مرنے کے بعد ان بیچاروں کا کیا حال ہوگا) پس چاہیے کہ یہ لوگ خدا سے ڈریں اور معقول بات کہیں“ (سورۃ تم آیت ۱۰)

قرآن حکیم میں بیان کر دہ ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے مسلم قانون نے قواعد و ضوابط کا ایک مکمل مؤثر اور جامع نظام تشکیل دیا ہے۔ مثال کے طور پر:-

”اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو۔ اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھاتی ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔“ (سورۃ ۱۴ آیت ۲۷-۲۸)

یہ ایک وعید ہے جس کے پیچھے ایک مضبوط اخلاقی دباؤ ہے۔ تاہم ماہرین قانون نے اس صورت حال کے پہلے حصے کے اسناد کے لئے دیوانی قانون تشکیل دیا ہے۔ مرنے والے کے رشتہ داروں کی بعض اقسام اس کی میراث میں سے حصہ دار ہیں قانون دانوں نے رشتہ دار کے ”حصے“ کے لئے یہ تشریح کی ہے کہ اگر ایک شخص مفلس ہو جائے اور اپنی گزشتہ اوقات کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ ان لوگوں سے مدد کا طالب ہو سکتا ہے جو کہ اس کی اچانک موت کی صورت میں اس کے وارث ہوں۔ اور وہ ان لوگوں سے



۔۔ اسی تناسب سے امداد طلب کر سکتا ہے جس تناسب سے وہ لوگ اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد میں حصہ دار ہوں گے۔ اگر اس کے وارث اس کی گزراوقات کے لئے امداد نہ دیں تو ایسا شخص اس مقصد کے لئے عدالتی حکم نامہ حاصل کرنے کا مجاز ہے۔

وراثت کی تقسیم اور اس کا انتظام شہری حقوق کے زمرے میں آتا ہے مگر شہری حقوق کے معاملے میں بھی جن کو عدالتی احکام کے ذریعے نافذ العمل کرایا جاسکتا ہے صحتی اخلاقی و باوجود محض روحانی ہے۔ یعنی ان احکام کی تعمیل کر کے اللہ کی رضا حاصل کرنا یا ان کی خلاف ورزی کر کے اُس کی ناراضگی کو دعوت دینا۔

”یہ تمام احکام خدا کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کرے گا خدا اس کو بہشتوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی (مقررہ) حدوں سے نکل جائے گا اس کو خدا دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ذلت کا عذاب ہوگا۔“ (سورۃ ۴ آیت ۱۴-۱۵)

جہاں قرض حسنة اور صدقات و خیرات کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے وہاں سود پر رقوم کے لین دین کو غیر سماجی قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنے ہی ہم جنسوں کا استحصال کرتا ہے اور اس کے باعث دولت کم سے کم ہاتھوں میں مرکوز ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔

”اے ایمان والو! گناہ گنا سود نہ کھاؤ۔ اور خدا سے ڈرو تا کہ نجات حاصل کرو۔

اور (دوزخ کی) آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحمت کی جاتے۔“ (سورۃ ۲ آیت ۱۳۱ تا ۱۳۲)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جتن نے پھٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سود (لینا)۔ حالانکہ سودے کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کے پاس خدا کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اُس کا۔ اور (قیامت میں) اس کا معاملہ خدا کے پُروردہ اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔



”خدا سُو کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے۔ اور خدا کسی ناشائستہ گنہگار کو دوست نہیں رکھتا جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے ان کو ان کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) ان کو بڑے خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے مومنو! خدا سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سُو باقی رہ گیا ہے اُس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) خدا اور رسول سے جنگ کرنے کے لئے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کر لو گے (اور سُو چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو (اُسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک ہمت (دو) اور اگر (نذر قرض) بخش ہی دو تو تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اور اُس دن سے ڈرو جبکہ تم خدا کے حضور میں کوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ لے پاتے گا۔ اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۷۶ تا ۲۸۲)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن حکیم میں استعمال کردہ ”ربو“ کی اصطلاح ”سُو“ پر معنوی اعتبار سے پوری طرح منطبق نہیں ہوتی۔ ”سُو“ کی اصطلاح ”ربو“ کے عمومی متبادل کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے۔

صرف یہی نہیں۔ اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے تمام قواعد و ضوابط میں ایک خاص درجہ بندی کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے ہم نے ابھی دیکھا ہے کہ ”ربو“ کو کیسے ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ مگر جہاں تک نذر اصل کا تعلق ہے تو اس میں استثناء ہے کہ اگر مقرض تنگ دست ہو تو اسے ”کشائش“ حاصل ہونے تک ہمت دی جانی چاہیے۔ اور اس کے بعد ایک شرعی کوشش کی گئی ہے کہ اگر اس قسم کی صورت حال میں تم صدقے یا خیرات کے طور پر اصل زر سے سے معاف کر دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے بشرطیکہ تم اس بھلائی کا علم رکھتے ہو۔

کم سے کم ناگزیر کا ذخیرہ کو رُو دانی، اخلاقی اور مادی تمام دائرہ کار میں لازمی بنا دیا گیا ہے اور زیادہ کامیابیوں کے حصول کے بعد رضا کارانہ جذبہ کی شدت ابھارنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان میں پانچ مرتبہ نماز باجماعت لازمی ہے جبکہ دیگر نمازیں اور نوافل وغیرہ انفرادی اور رضا کارانہ طور پر ادا کئے جاتے ہیں۔



نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے آخری پہر میں اس مقصد کے لئے اٹھ جائیا کرتے تھے اور کبھی کبھی قبل از دوپہر بھی نوافل وغیرہ ادا کیا کرتے تھے۔ آپ کی سنت پر بھی بہت سے لوگ عمل کرتے ہیں۔ پھر دعاؤں کا سلسلہ ہے جس کی تینا کبھی بھی دل میں کسی بھی وقت جاگ سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے جس سے خیالات کو ہمیشہ آباد رکھا جانا چاہیے۔ رمضان کے روزے تمام صحت مند افراد پر سوا مے چند مستثنیات کے فرض ہیں۔ باقی ہمیشہ میں رسول اللہ صوموار اور جمعرات اور ان کے علاوہ بعض دوسرے دنوں کے روزے بھی رکھا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد ان کی سنت پر عمل کرتی ہے۔

حج بیت اللہ استطاعت رکھنے والے ہر مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے مگر کئی مسلمان ایک سے زائد حج کرتے ہیں عمرہ (جسے حجِ اسغر بھی کہا جاتا ہے) ایک رضا کارانہ عبادت ہے جو سال کے دوران کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے۔

”جو کوئی (رضا کارانہ طور پر) نیک کام کرے تو خدا اقدار شناس اور داناست۔“

(سورۃ ۲ آیت ۱۵۹)

معاشی شعبے میں ہم دیکھتے ہیں کہ دولت اکٹھی کرنے کے ناپسندیدہ ذرائع پر پابندیاں نافذ کی جاتی ہیں جیسے ذخیرہ اندوزی منع ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی پر زور دیا جاتا ہے اور زکوٰۃ ادا کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس امر پر شدید زور دیا جاتا ہے کہ فاضل دولت رکھنے والے لوگ ان لوگوں کے ساتھ تعاون کریں جو ضرورت مند ہیں۔ اس پر مختلف طریقوں سے زور دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس مقصد کے لئے کوئی رقم مقرر نہیں کی گئی، کسی تناسب کا ذکر بھی نہیں کیا گیا مگر پورے قرآن حکیم میں اس پر زور دیا گیا ہے۔

یہاں چند ایک عمومی احکامات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

”پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔“

اس طرح خدا تمہارے لئے اپنے احکام مکمل کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچو۔“

(سورۃ ۲ آیت ۲۲۰)

اب یہ ہر شخص کا معیار یا پیمانہ ہے کہ وہ کیا خیرات دے سکتا ہے یا اس کے پاس کیا اور کس قدر ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس کے تعین میں کئی عوامل کا فرما ہوں گے جن میں ذاتی ضروریات کی



شدت، ان سے متعلقہ فرائض کی اہمیت، وسائل کی خودی دستیابی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام کی مثالیں اور ضرورت مند کی ضرورت کی شدت وغیرہ شامل ہیں۔ آخری عنصر کے طور پر فیصلہ کن عوامل میں جن شخص سے سوال کیا گیا ہے اس کا مزاج اور اس کا خدا پر ایمان نمایاں ہوگا۔ تاہم یہ باور کیا جانا چاہیے کہ اسلام سادہ طرز زندگی کی تلقین کرتا ہے اور جملہ امور میں اعتدال کو پسند کرتا ہے۔ فضول خرچی کی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور فرد کو بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ ضرورت مندوں کے لئے صاحب استطاعت لوگوں کے اموال میں حصہ مقرر ہے خواہ یہ کم ہو یا زیادہ۔ (سورۃ ۵۱ آیت ۲۰، سورۃ ۷۰ آیت ۲۶) چنانچہ ایک مسلمان کے معاملے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیا جانا چاہیے۔

”صاحب استطاعت کو اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور جس کے رزق میں تلخی ہو وہ جتنا اُس کو خدا نے دیا ہے اس کے مطابق خرچ کرے۔ اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کے مطابق جو اس کو دیا گیا ہے۔ اور اللہ عنقریب تنگی کے بعد کشائش بخشنے کا۔“ (سورۃ ۷۵ آیت ۸)

یہ بڑی عجیب و غریب صورت حال ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے معاملے میں جس کا مطلب اپنے ہم جنسوں کی بھلائی کے لئے خرچ کرنا ہے، کم استطاعت رکھنے والے عموماً زیادہ مستعد اور زیادہ بنے ناب ہوتے ہیں بلنسبت اُن کے جن کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ تاہم مستثنیات دونوں صورتوں میں موجود ہوتی ہیں۔

اور جب کسی کے پاس دینے کو کچھ نہ ہو تو وہ کم از کم مشفقانہ انداز میں اظہار ہمدردی کر سکتا ہے۔

”اور اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو اُن (مستحقین) کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی سے بات کیا کرو۔ اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گروں سے بندھا ہو (یعنی بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ ہی بالکل کھول دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو) اور انجام یہ ہو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر پیچھاؤ۔ بے شک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور (جس کی روزی چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے



اور (ان کو) دیکھ رہا ہے۔ (سورۃ ۱۶ آیت ۲۹ تا ۳۱)  
 امداد اور مدد و نصرت کے مستحق کون لوگ ہیں اور ان کی جانب سے عام فرد پر عائد ہونے والے  
 فرائض کس طرح ادا کئے جانے چاہئیں کہ اللہ دینے والے شخص سے راضی ہو جاتے؟ بنیادی شرط  
 یہ ہے کہ اس کام کو خدمت کے جذبے کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر کیا جائے اور اس کو خوشی خوشی  
 بطریق احسن صرف اور صرف اللہ اور اس کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا  
 مقصد پیش نظر رکھ کر یہ کام کیا گیا تو نہ صرف پورا عمل ضائع ہو جاتے گا بلکہ اللہ کی ناراضگی کا بھی  
 اندیشہ ہے کیونکہ اس کا مطلب اللہ کے سوا کسی دوسرے کی خوشنودی طلب کرنا ہو گا جو ناقابل معافی  
 گناہ ہے۔

”اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ اور ماں باپ  
 اور قربت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں  
 اور رفقاء پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے  
 میں ہیں سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے  
 اور تکبر کرنے والے بڑا قی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ جو خود بھی تکبر کریں  
 اور دوسروں کو بھی تکبر سکھائیں۔ اور جو (مال) اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے عطا فرمایا  
 ہے اُسے چھپا چھپا کر رکھیں اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا  
 ہے۔ اور خرچ بھی کریں تو (خدا کے لئے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کے لئے۔ اور  
 خدا پر ایمان لائیں نہ روز آخرت پر (ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان ہے) اور جس کا  
 ساتھی شیطان ہو تو (کچھ شک نہیں کہ) وہ بُرا ساتھی ہے۔

”اور اگر یہ لوگ خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور جو کچھ خدا نے اُن کو  
 دیا تھا اس میں سے خرچ کرتے تو ان کا کیا نقصان ہوتا اور خدا ان کو خوب جانتا ہے۔  
 خدا کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا۔ اور اگر نیکی (کی) ہوگی تو اس کو دوچند کر دے  
 گا اور اپنے مال سے اجر عظیم بخشنے لگا۔

”بھلا اُس دن کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو



باتیں گے اور تم کو ان لوگوں کا حال (بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔ اُس روز کا فر  
اور پیغمبرؐ کے نافرمان آندو کریں گے کہ کاش ان کو زمین میں دفن کر کے مٹی برابر کر دی  
جاتی اور وہ خدا سے کوئی بات نہیں چُپا سکیں گے۔“ (سورۃ ہم آیت ۲۴ تا ۲۸)  
اللہ کی راہ میں رضا کارانہ خرچ کرنے کے جذبے کو ترغیب کے ذریعے اُبھارا جانا چاہیے۔  
ذیل میں اس کی ایک بہترین مثال دی جا رہی ہے۔

”جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اُس  
والے کسی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور  
خدا جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔ وہ بڑی کثرت والا اور سب کچھ جاسنخہ والا  
ہے جو لوگ اپنا مال خدا کے راستے میں صرف کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا  
(کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں اُن کا صلہ اُن کے پروردگار  
کے پاس (تیار) ہے۔ اور (قیامت کے روز) نہ اُن کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں  
گے جس خیرات کے دینے کے بعد (یلنے والے کو) ایذا دی جاتے اس سے تو نرم بات  
کہہ دینی اچھی (اور اس کی بے ادبی سے) درگزر کرنا بہتر ہے اور خدا بے پروا اور  
بُردبار ہے۔

”مومنو! اپنے صدقات (و خیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اُس شخص  
کی طرح برباد نہ کرو ینا جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے۔ اور خدا اور  
روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر  
تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اُسے صاف کر ڈالے۔ (اسی طرح)  
یہ (ریا کار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور خدا ایسے ناشکروں  
کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

”اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور غلو صنیعت کے ساتھ اپنا مال  
خرچ کرتے ہیں اُن کی مثال ایک بانگ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ (جب) اس پر  
مینہ پڑے تو دنگ پھل لائے۔ اور اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر چھوڑ ہی سہی۔ اور خدا تمہارے



کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

”مجلات میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور اس میں اس کے لئے ہر قسم کے میوے ہوں۔ اور اُسے بڑھا پا آپکڑے اور اس کے ننھے ننھے پتے بھی ہوں۔ تو (ناگہاں) اس باغ پر ساگ کا بھرا ہوا بگولا پلے اور وہ جل (کر راکھ کا ڈھیر ہو) جاتے۔ اس طرح خدا تم سے اپنی آیات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو (اور سمجھو)۔

”مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کھاتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو۔ اور بڑی اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ (اگر وہ چیزیں تمہیں دی جائیں تو) بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کر لو، ان کو کبھی نہ لو۔ اور جان رکھو کہ خدا بے پروا (اور) قابل ستائش ہے۔ (اور دیکھنا) شیطان (کا کہنا نہ ماننا وہ) تمہیں تنگ دیتی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کے کام کرنے کو کہتا ہے۔ اور خدا تم سے اپنی بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے۔ اور خدا بڑی کثرت والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی۔ اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔

”اور تم (خدا کی راہ میں) جس طرح کا خرچ کر دیا۔ کوئی نذر مانو خدا اس کو جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے اور (اس طرح کا دینا) تمہارے گناہوں کو بھی دور کر دے گا۔ اور خدا کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔

”اے محمد! تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور مومنوں کو مال خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہیں کو ہے اور تم جو خرچ کر دو گے خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کر دو گے۔ اور جو مال تم خرچ کر دو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جاتے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں کیا جاتے گا۔



”(اور ہاں تم جو خرچ کر دو گے تو) اُن ماحوت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رُکے بیٹھے ہیں اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے (اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں) یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے اور تم قیامت سے ان کو صاف پہچان لو (کہ حاجت مند ہیں اور شرم کے سبب) لوگوں سے (مُنہ پھوڑ کر اور) پست کر نہیں مانگ سکتے اور تم جو مال خرچ کر دو گے کچھ تنگ نہیں کر خدا اس کو جانتا ہے۔ جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہراً (راہ خدا میں) خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کا صلہ پروردگار کے پاس ہے اور ان کو قیامت کے دن نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ غم۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۶۲ تا ۲۷۵)

مغرب میں خیرات کا تصور دوسری بہت سی اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ زیادہ مبینگی اور غیر شخصی بنادیا گیا ہے۔ خیراتی مقاصد کے لئے عطیات کی ادائیگی کو فرد کی مہ شریعے میں حیثیت کے ساتھ ایک لازمی فرض کی حیثیت دے دی گئی ہے جیسے کہ اس پر انکم ٹیکس کا تعین اس کی آمدنی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ مغرب میں چیک روانہ کرنے کے ساتھ ہی یہ فرض ادا ہو جاتا ہے اور فرد سکون کا سانس لیتا ہے۔ ”اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا“ یہ تصور اسلام میں نہیں ہے جس پر بار بار زور دیا گیا ہے۔

”خرچ“ سے مراد صرف مادی ذرائع یا روپیہ پیسہ ہی نہیں ہے۔ متقی لوگ وہ ہیں کہ ”جو کچھ ہم نے انہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۷۱) ”اے ایمان والو جو مال (ہم نے تم کو دیا ہے) اس میں سے اُس دن کے آنے سے پہلے خرچ کر لو جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہو اور نہ دوستی اور سفارش ہو سکے۔ اور کفر کرنے والے لوگ ظالم ہیں۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۷۵)

”اے پیغمبر! میرے مومن بندوں کو کہہ دو کہ نماز پڑھا کریں اور اُس دن کے آنے سے پیشتر جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہو گا اور نہ دوستی (کام) آئے گی، ہمارے دیتے ہوئے مال میں سے درپردہ اور ظاہراً خرچ کرتے رہیں۔“ (سورۃ ۲۴ آیت ۳۲)

”اور جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اُس میں سے اُس (وقت) سے پہلے خرچ کر لو کہ تم سے کسی کی موت آجائے تو (اُس وقت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! تُو نے مجھے تھوڑی سی



اور جہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک کاموں میں داخل ہو جاتا۔ اور جب کسی کی موت آجاتی ہے تو اللہ اُس کو ہرگز جہلت نہیں دیتا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُس سے خوب واقف ہے۔

(سورۃ ۹۳ آیت ۱۱-۱۲)

اللہ کی راہ میں دولت، اشیاء، ذہانت، جذبات اور درحقیقت خود اپنا آپ پیش کرنے کی صلاحیت رکھنا اور دوسروں کو اُن کاموں کی دعوت دینا خالق کائنات کی نعمتیں ہیں تاکہ انسان ان سے فائدہ اٹھا کر صحیح معنوں میں مال دار بن سکے۔

”دیکھو تم وہ لوگ ہو جو خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کے لئے بلا سہ جاتے ہو۔ تو تم میں ایسے شخص بھی ہیں جو بھگی کرنے لگے ہیں اور جو بھگل کرتا ہے اپنے آپ سے بھگل کرتا ہے اور خدا سے نیاز ہے اور تم محتاج۔ اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آتے گا اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے۔“ (سورۃ ۴ آیت ۳۹)

اپنی ذات کو خدمتِ خلق کے لئے وقف کر دینا خدا کی راہ میں دوسری چیزیں خرچ کرنے کے معاملے میں افضل ترین ہے اور ایسا کرنا لینے والے پر کوئی احسان نہیں بلکہ یہ تو دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے۔ اگر سوال کرنے کے وقت دینے والا ساقی کو کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو وہ ساقی سے زبانی اظہارِ ہمدردی کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آ سکتا ہے۔ (سورۃ ۱۷ آیت ۲۹) مگر فرقہ و موال کہتے جانے تک انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ مانگنے والا اس سے کب مانگتا ہے۔ بلکہ استطاعت رکھنے والے کو ان لوگوں کی ضروریات کا خود ہی خیال رکھنا چاہیے جو سوال نہیں کرتے۔ (سورۃ ۲ آیت ۲۷) یا اپنی حاجت بیان کرنے سے خود کو معذوریات میں (سورۃ ۵۱ آیت ۲۰)۔ سورۃ ۷۰ آیت ۶۶ صاحبِ استطاعت کو معاشرے کے تمام نادار افراد کے لئے ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار بھی۔

مثال کے طور پر ہمسایہ کے کچھ حقوق میں جن کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور خواہ ہمسایہ ان کا اظہار نہ کرے یا ان کو نہ بھی جانتے تب بھی ان کو پورا کیا جانا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے ہمسایہ کے حقوق کے بارے میں اس قدر تاکید کیا ہے کہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید اسے وراثت میں بھی حصہ دیا جاتے گا۔“



ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا :

”کوئی بھرے ہوتے پیٹ کے ساتھ کس طرح سو سکتا ہے جبکہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔ ہمسایہ کے ساتھ بل بٹ کر کھانے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے۔ خواہ یہ (کھانا) کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی سالن بناتے تو یہ بالکل آسان ہے کہ اس میں ایک پیالہ پانی اور ڈال دے تاکہ اس میں ہمسایہ کو بھی شریک کیا جاسکے۔“ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے استفسار کیا: ”اگر میرے پاس کھانے کو تھوڑا سا ہو اور میرے دو ہمسایہ ہوں تو میں کس کو ترجیح دوں؟“ آپ نے فرمایا: ”اُس کو جس کے گھر کا دروازہ تمہارے دروازے کے قریب ہو۔“

یہ تم ہماری خصوصی توجہ اور مہربانی کا مستحق ہونا چاہیئے۔

”اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے۔ اور اگر تم ان کے ساتھ مل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو تکلیف میں ڈال دیتا۔ بے شک خدا غالب (اور) حکمت والا ہے۔“ (سورۃ ۲ آیت ۲۲۱)

عیدین میں سے ایک عید کے موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ نے کلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ کچھ لڑکے آپس میں کھیل رہے ہیں مگر ایک چھوٹا سا لڑکا ان کے پاس خاموش اور اُداس کھڑا ہے۔ حضورؐ اُس کے پاس گئے۔ اُس کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور معلوم کیا کہ وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل میں شامل کیوں نہیں ہو رہا۔ لڑکے نے جواب دیا کہ اُس کا والد انتقال کر چکا ہے اور یتیم ہونے کے بعد اس کے پاس عید کے موقع پر پہننے کو نئے کپڑے نہیں ہیں کہ وہ انہیں پہن کر دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیل میں شامل ہو سکے۔ حضورؐ اس لڑکے کو اپنی اہلیہ حضرت عائشہؓ کے پاس لے گئے اور فرمایا ”عائشہ! تم نے ایک بیٹے کی خواہش کی تھی۔ یہ رہا تمہارا بیٹا۔ اس کو نہلاؤ اور نئے کپڑے پہناؤ اور پھر اس کو اس کے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے بھجوا دو۔“

حضورؐ نے ارشاد فرمایا :



”جو یتیم کے ساتھ شفقت سے پیش آیا اور اُس کا خیال رکھا تو وہ جنت میں اس طرح میرے ساتھ ہو گا جس قدر میری شہادت کی انگلی میری درمیانی انگلی کے ساتھ ہے۔“

یتیم کسی بھی قوم کا ایک قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں اور ایک مقدس فرض بھی۔ یتیموں کی مناسب نگہداشت اور پرورش بے شمار عنایات خداوندی کا موجب بنتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”وہ گھرانہ عنایات خداوندی کا خصوصی مرکز ہے جس میں کسی یتیم کی بہ طریق احسن پرورش کی جاتے۔“

راقم الحروف کی یادداشتوں میں سے ایک نہایت خوبصورت اور دل کو گرمادینے والی یاد دس سال پہلے الجزائر میں لڑکیوں کے ایک بورڈنگ سکول کے دورے سے متعلق ہے۔ یہ سکول ساحل سمندر کے بالمقابل ایک بلند پہاڑی پر خوبصورت عمارت میں قائم کیا گیا تھا اور اس میں الجزائر کے مجاہدین آزادی کی بچیاں زیر تعلیم تھیں جنہوں نے اپنی جانیں مادر وطن کی آزادی کے لئے قربان کی تھیں۔ ان بچیوں کو یتیم نہیں بلکہ شہداء کے بچوں کے قابلِ فخر نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ نظم و ضبط انتہائی اعلیٰ درجے کا تھا۔ ہمیں لڑکیوں کا ایک کمرہ دیکھنے کی دعوت دی گئی جس میں ایک سے زائد لڑکیاں رہائش پذیر تھیں۔ جو بھی ہم کمرے میں داخل ہوتے تو تمام کی تمام لڑکیاں سب کام چھوڑ کر خوشی سے جیتے ہوئے ہماری طرف پکس اور ہم سے یوں لپٹ گیتیں جیسے ہم ان کے اپنے گھر کے افراد ہوں۔ وہ بے حد سرور اور خوش تھیں اور پُر اعتماد بھی کہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں یہ جاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی کہ اس طرح کے سکول پورے ملک میں موجود تھے جن میں لڑکیاں زیر تعلیم تھے۔

عربی لفظ ”سکین“ جس کا ترجمہ حاجت مند کیا جاتا ہے اس سے عاجزی اور فروتنی کا مفہوم نکلتا ہے۔ عاجزی کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ ممکن ہے ایسے شخص کو محض اعتماد میں اضافہ کی ضرورت ہو۔ ایک مزدور نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا۔ آپ نے اُس شخص کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اُن کو پھینک دیا اور محبت کے ساتھ فرمایا:

”یہ ہاتھ اللہ کو بے حد عزیز ہیں۔ یہ ہاتھ اللہ کو بہت محبوب ہیں۔“

زہیر نے مدینہ کے نواح میں بڑیاں کاشت کر کھئی تھیں جہاں سے وہ ہفتے میں دوبار اپنی پیداوار مدینہ طیبہ لے جاتے اور ایک گلی کی دیوار کے ساتھ رکھ کر انہیں فروخت کر ڈالتے۔ وہ ان بڑیوں میں سے کچھ



نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے اندا آپ اس کے جواب میں انہیں اُن کی ضرورت کی کبھی ایک چیز اور کبھی دوسری دے دیا کرتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے ”زہیر چار اگاؤں ہے اور ہم اس کا شہر“

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت زہیر کے ٹال کے پاس سے گزر رہے تھے۔ سورج کی تیش بہت تیز تھی اور زہیر اپنی مکرگلی کی طرف کئے کھڑے تھے جو پسینے سے شرابور بھی جھنڈے اُن کی طرف آہستی کے ساتھ بڑھے جس کا زہیر کو پتہ نہیں چلا اور آپ نے جس طرح کے پتے عموماً کیا کرتے ہیں اپنے بازو پھیلا کر زہیر کو اُن میں جکڑ لیا اور اپنی انگلیوں سے زہیر کی آنکھیں بند کر دیں جھنڈے کے ہاتھ بہت نرم تھے اور زہیر نے انہیں مَس کر کے محسوس کر لیا کہ انہیں کون جکڑ رہے ہوتے ہے صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زہیر نے اپنے بازو پیچے کی طرف پھیلا کر جھنڈے کو سختی کے ساتھ بھینچ لیا اور اپنا پسینے سے شرابور دھڑ جھنڈے کے ساتھ رکڑنا شروع کر دیا۔ آنحضرت نے اس پر ہنسنا شروع کر دیا اور بلند آواز میں کہا : ”ہے کوتی جو اس غلام کو خریدنا چاہتا ہے اس پر زہیر نے خود کو آنحضرت کی گرفت سے آزاد کر لیا اور گریہ زاری کے انداز میں کہا ”جھنڈو! مجھ جیسی حقیر چیز کو خرید کر کوتی کیا کرے گا“ آنحضرت نے اسے فوراً دلاسا دیا۔ ”ہنیں، ہرگز نہیں تم اللہ کی نظر میں بے حد قیمتی ہو۔ بخدا تم خدا کی نظر میں بے حد قابلِ قدر ہو۔“

یہ اللہ کی راہ میں خود کو پیش کرنے کی ایک مثال ہے جو سونا چاندی اور ہیرے جواہرات لٹانے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اور ہم میں سے ہر کوتی اس متاع کو فرائض کی کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔





۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی نے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد فراہم کر دی۔ ۱۸۴۵ء تک ہندوستان کا بڑا حصہ برطانیہ کے قبضے میں جا چکا تھا۔ برطانیہ کے خلاف آزادی کے لئے ۱۸۵۷ء میں غیر منسلک طور پر کی جانے والی کوشش ناکام ہو گئی۔ تقریباً دو صدیوں پر محیط اس عہد کے دوران مقامی تہذیب پر حکمران تہذیب کا اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ نوآبادیاتی حکمرانوں اور مقامی لوگوں کے درمیان سماجی رابطوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ یہ امر بالواسطہ طور پر مقامی تہذیب کے بڑی حد تک تحفظ کا باعث بنا۔ شہروں میں حاکم و محکوم کے درمیان فاصلے کا یہ بُعد بتدریج کم ہو گیا مگر دیہات اس سے محفوظ رہے۔

ذات پات کے کڑے نظام کے باعث ہندو ثقافت اس عرصہ میں سب سے کم متاثر ہوئی۔ مسلمانوں نے حکمرانوں کے خلاف ناپسندیدگی کا عنصر ختم ہونے، انگریزی نظام تعلیم اپنانے اور حکام کے ساتھ تعاون کے بعد خود کو مغربی ثقافت کے اثرات قبول کرنے کے لئے زیادہ آمادگی کے ساتھ پیش کر دیا۔ مسلمانوں کے مغرب میں تعلیم پانے کے بعد ان کی تہذیب پر مغربی اثرات دوسرے طبقوں کی نسبت زیادہ تیزی کے ساتھ اثر انداز ہونا شروع ہو گئے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا کیونکہ اس سے مسلمانوں نے اپنی سماجی اقدار اور تہذیب کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تقسیم ہندوستان کے وقت تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ بُری طرح کفینوز ہو چکا تھا اور تہذیبی اعتبار سے اس کی حالت درست نہ تھی۔

مسلمان علماء و جن میں سے بعض انتہائی باکدار اور بے داغ زندگیاں گزار رہے تھے اگرچہ خود انہوں نے غیر ملکی عادات اور طور طریقوں سے اجتناب رکھا مگر وہ عقائد کی چیمپلس میں اس بُری طرح سے اُلجھے رہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی خامیوں کی اصلاح کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ درحقیقت اس صورت حال کے انسداد کے لئے انہیں سخت محنت کرنا پڑی جس کے بعد ہی وہ کوئی راستہ نکالنے کے قابل ہوئے۔ مگر وہ



انتشار کو برداشت نہ کر سکے۔ اور یہی مؤثر اندادی کا ردائی کے نتیجے میں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اصلاحی ہم کے نتیجے میں یقیناً انتشار اس سے زیادہ ہی ہو تا جو پہلے سے مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھا۔ آزادی کا وقت قریب آنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے اکثر ایک سیاسی گروہ یا دوسری سیاسی جماعت سے وابستہ ہو گئے جو ان کے رجحانات اور مفادات سے مطابقت رکھتی تھی۔ چنانچہ اس جانب سے اس مسئلے کے حل کی زیادہ امید باقی نہ رہی۔

اسلام میں نہ تو طاعت ہے اور نہ چرچ کی کسی مذہبی حکومت یا تنظیم کا وجود ہے۔ یہاں ہر مردوزن سے توح کی جاتی ہے کہ وہ عقیدے کی ابتدائی شرائط، اس کے اصولوں اور تعلیمات سے آگاہی حاصل کرے تاکہ وہ قرآن حکیم کو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو بطریق احسن سمجھ سکے۔ یہ کم از کم علم ہے اور زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جو شخص اسلام کی محبت اور تعلیم میں سرشار ہو وہ اس دین عظیم کی بلند نیوں کی جانب گامزن رہ سکتا ہے۔ تاہم اسلام کے احکامات کے مطابق مسلمانوں کی ایک جماعت کو خود کو دین کے مطالعہ اور اس کی اقدار کی سر بلندی کے لئے وقف کرنے کو بھی کہا گیا ہے۔

”اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے۔ یہی لوگ ہیں جو نجات پانے والے ہیں۔“ (سورۃ ۲ آیت ۱۰۵)

”اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں۔ تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین (کا علم سیکھتے اور اس) میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے۔“

(سورۃ ۹ آیت ۱۲۲)

پاکستان کے معاملے میں یہ بات اور بھی ضروری تھی تاکہ پاکستان کے مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگیوں اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال لیتے جن کا ذکر قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا گیا ہے۔ جو کہ قیام پاکستان کی بنیاد ہے۔ علمائے کرام سیاسی قیادت کی نسبت (اس جانب زیادہ زور دیتے رہے تھے مگر ان دونوں طبقوں نے زبانی جمع خرچ کے علاوہ اس اہم جانب کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک بے حد فعال اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کیا جاتا جو عوام الناس کے



دلوں اور روح تک پہنچنا جس کے نتیجے میں وہ یکسوئی کے ساتھ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنا ہر خیال، ارادہ اور عمل صرف اس اہم مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دیتے۔ بعض یہ ایک اقدام تمام معاملات کو صحیح سمت میں گامزن کر دیتا۔ اس سے تمام غامبیاں دور ہو جاتیں اور قوم جسدِ واحد میں تبدیل ہو جاتی جس میں مسلم اور غیر مسلم بھی شامل ہوتے جو کہ سب کے سب ایک ہی خدا ہی مخلوق ہیں۔ اس سے بھائی چارے کی ایک ایسی فضا قائم ہوتی جس میں ہر کوئی دوسروں کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوتا۔

”اور ہر ایک (افرتے) کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے جہرہ (عبادت کے وقت) مذکور کیا کرتے ہیں تو تم نیکیوں میں سبقت حاصل کرو۔ تم جہاں ہو گے خدا تم سب کو جمع کر لے گا۔ بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔“ (سورۃ ۲ آیت ۱۴۹)

اس قسم کا انقلاب ۱۹۴۷ء کے موسم گرما یا خزاں میں شروع کیا جاسکتا تھا جب وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی مشکلات اور آفات نے دنیا کی بے ثباتی اور بے مائیگی کو نمایاں کر رکھا تھا جس کی چمک دمک سے لوگوں کی اکثریت چمٹی رہتی ہے حالانکہ اس کی نگاہ بالآخر اور زندہ جاوید اقدار کی سر بلندی کی لہروں کو موجزن ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کی بجائے پاکستانی زندگی اور اسی طرح سرحد کے اُس پار مصائب کے اس دریا سے گزرنے کے باوجود زندگی دوبارہ اُسی پرانی ڈگری پر لوٹ آتی اور وہی پرانے جھوٹے خدا دوبارہ سجا کر ان کی پوجا کی جانے لگی جو لوگ فراوانی کے عادی تھے اور اپنا سب کچھ تقسیم کے دوران گنوا بیٹھے تھے انہوں نے مال و دولت دوبارہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ اسے مافی کی طرح حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے بھی روادار نہ تھے جن کے پاس پہلے کی نسبت کچھ بھی نہ رہا تھا۔ پرانی زندگی پر نئی زندگی غالب آچکی تھی جو لوگ اس میں ملوث نہ ہوتے تھے اور جنہوں نے مہاجرین کی بحالی اور نئے ملک کی بنیادیں استوار کرنے میں کام کیا تھا اور جنہوں نے اس صورتحال کو ایک مستقل طرز زندگی کے طور پر نہیں اپنا لیا تھا وہ اپنی پرانی پوزیشن برقرار رکھنے کے لئے کوشاں تھے جس کا معیار بھی مسلسل بلند ہوتا جا رہا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات میں سے اگر محض ایک سادہ سا اصول عملی طور پر اپنا لیا جاتا تو یہ تقسیم ہندوستان کے بعد کی نئی اقدار میں ایک روشن مثال بن جاتا۔ اگر ہر گھرانے کا سربراہ خود پر یہ ذمہ داری عائد کر لیتا کہ اس کا پڑوسی یا اس کے بچے بھوکے نہیں سوئیں گے اور یہ کہ اس کے پاس جو کچھ بھی کھانے کو ہو گا وہ اس میں اپنے پڑوسی کو شریک کرے گا تو اس کا نہایت بھرپور اثر زندگی کے تمام



شعبوں پر پڑتا جس سے پاکستان میں بسنے والے ہر فرد کی سوچ، رویے اور نقطہ نظر میں مثبت تبدیلی آجاتی۔ یہ انسان کے ملک گیر بھائی چارے کا مظاہرہ ہوتا۔ اور یہ ایک ایسی مثال ہوتی جس پر ایشیا اور افریقہ کے دیگر ممالک میں بھی عمل کیا جاتا۔ اس منصوبے پر روزِ اول ہی سے پوری طرح عمل درآمد اگرچہ نہ ہو جاتا۔ اس سلسلے میں مسائل اور مشکلات بھی ہوتیں مگر مشکلات پر قابو پایا جاتا اور آہستہ آہستہ صورتحال نارمل ہو جاتی بشرطیکہ یہ سارا کام اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار ہو کر کیا جاتا۔ اس کے لئے کسی پراپیگنڈہ، تقاریر، اعلانات، احکامات یا اداروں کے قیام کی ضرورت نہ تھی بلکہ یہ معاملہ انسان اور انسان اور بھائی اور بھائی کے درمیان طے پا جاتا۔

”اور باوجودیکہ اُن کو خود طعام کی خواہش (اور حاجت) ہوتی ہے فقروں اور یتیموں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں کہ) ہم تم کو خالص خدا کے لئے کھاتے ہیں نہ تم سے عوض کے خواستگار ہیں نہ شکوگزار۔“ (سورۃ ۷۴ آیت ۹-۱۰)

یقیناً اس طرح کے پروگرام کے دوران بہت سے لوگوں کو دوسروں کے ساتھ شراکت کے دوران خود قلت اور تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ سب لوگوں کے لئے بہت اچھا ہوتا۔ ہمیں رمضان کے مقدس مہینے سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں تنگی ترشی کا سامنا کرنا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا اگر کتنی کتنی روز تک مسلسل آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو چند خشک بجوروں اور جو کی روٹی پر گزارا کرنا پڑتا جسے پانی میں بھگو کر کھایا جاتا تھا۔

جس روز کہ فتح ہوا اور اُس کے دروازے جلادین بیغمبر پر دوبارہ کھل گئے تو شہر کا انتظام سنبھالنے اور اسے درست کرنے میں آنحضرت کو کئی گھنٹے صرف کرنا پڑے جب یہ کام مکمل ہو گیا تو آنحضرت اپنے چچا حضرت ابوطالب کی صاحبزادی آمنہؓ کی ہانی کے مکان پر تشریف لے گئے اور اُن سے پوچھا کہ کیا اُن کے ہاں کھانے کو کچھ ہے؟ آمنہؓ نے کہا کہ اگر اُن کے ہاں کھانے کو کچھ ہوتا تو وہ خود آنحضرت کو کھانے کے لئے بلوا بھیجتیں۔

”کیا گھر میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ سوائے باسی روٹی کے ایک سخت ٹکڑے کے۔“

”یہ اچھا ہے۔ اسے پانی میں بھگو کر نرم کیا جاسکتا ہے۔ کیا اس کے ساتھ کھانے کی کوئی دوسری



.. چیز ہے؟

”بچے کچھ سر کے کچھ قطرے میں جو سیاہ ہو چکے ہیں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے کچھ قطرے اور باسی روٹی کے ساتھ کھانا کھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور اُمّانی سے فرمایا: ”اُمّانی! روٹی اور سر کچھ کی کیا خوب نعمت ہے۔“

قریش مکہ پر تاریخی فتح کے روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو کھانا کافی ثابت ہوا تھا ویسا ہی کھانا قیام پاکستان کے روز یہاں کے لوگوں کے لئے بھی کافی ہو سکتا تھا اور اس کے بعد بھی یہی کافی ہوتا اگر اسلام کے نام پر قائم کئے جانے والے ملک پاکستان میں اس فرض کا احساس اجاگر ہو جائے کہ کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوئے گا جبکہ پاکستان ان لوگوں نے قائم کیا تھا جنہوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیاں قرآن و سنت کے مطابق گزارنے کا عہد کر رکھا تھا۔

اس طرح قائم ہونے والی بھائی بھائی کے کی نفا جلد ہی پاکستان کی سماجی زندگی کے ہر شعبے پر چھا باقی اور ان تمام خرابیوں کا تدارک ہو جائے گا جو پاکستان کو اپنی تاریخ کے ابتدائی پچیس برسوں میں سامنا کرنا پڑا۔

انسانی حقوق کا اسلامی ضابطہ انتہائی متوازن، واضح، جامع اور مفید ہے اور یہ ان تمام مضوابط سے بدرجہ اتم بہتر ہے جو قبل اسلام اور بعد اسلام وضع اور نافذ کئے گئے ہیں۔ جو مشکل یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہماری وابستگی محض زبانی ہے جس پر شاذ ہی عمل کیا جاتا ہے۔ ہم اس پر عمل محض دوسروں کی نکالی کے شوق میں کرتے ہیں تاکہ ہمیں غیر مذہب یا غیر ترقی یافتہ نہ سمجھا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا مقصد اپنی قوم کی حالت کو بہتر بنانا اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا ہے اور ان اقدامات سے ہم جس حد تک بھی یہ مقصد حاصل کر لیں وہی بہتر ہے بلکہ عملی طور پر جب ہم ایسا کرتے ہیں تو ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہم کامیابی کے حصول کے لئے مطلوب تر اور مہنگا ترین راستہ اختیار کر رہے ہیں چنانچہ اس سے جو نتائج حاصل ہوں گے وہ معمولی، ادھر سے ادھر پھرتے ہی سے شرط ہوں گے۔

اسلام اور دوسرے مذاہب یا ”ازموں“ کے درمیان ایک بنیادی فرق جس کو ہمیشہ ذہن میں رکھا جانا چاہئے یہ ہے کہ دیگر مذاہب حقوق کے تعین اور حصول کی بات کرتے ہیں جبکہ اسلام فرائض کے تعین اور ان کی انجام دہی پر سختی کے ساتھ زور دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب زیادہ تر حقوق کے نفاذ میں پابندیوں



کامیابا لیتے ہیں جبکہ اسلام فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں رضا کارانہ عمل اور اس کی ترغیب پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ بحیثیت عقیدے کے اسلام مادی، اخلاقی اور روحانی تعلق کے باہمی اشتراک عمل کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس جانب پوری توجہ دیتے ہوئے اخلاقی اور روحانی اقدار کی مادی اقدار پر بالادستی کو مقدم رکھتا ہے۔ جبکہ دوسرے ازم "اپنے مقاصد کو بذات خود منزل کے طور پر حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں اسلام کا مقصد انسان کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق اور رابطہ استوار کرنا ہے۔ اور اس کے سوا باقی تمام چیزیں اور اعمال اسی منزل کی جانب چلنے میں مدد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی چیز کو منزل مقصود قرار دینا یا کسی دیگر مقصد اور عزم کو پانے کی کوشش کرنا سرکشی ہے جو اسلام کے منافی ہیں۔

اسلام کا رضانہ قدرت میں تنوع یا بؤقلمونی کی مذمت نہیں کرتا یہ تو اسے کثرت خداوندی سمجھ کر قبول کرتا ہے جن کا مطلب یہ ہوگا کہ اس رنگارنگی کے اپنے استعمالات اور افادیت ہے۔ ہر انسان کی انسانیت دوسروں کے ساتھ مشترک ہے مگر اس کے باوجود اس کی ایک اپنی شخصیت بھی ہوتی ہے۔ ہر شخص کی صلاحیتیں اور استعداد دوسروں سے مختلف ہوتی ہے اور انسانوں کا یہی وصف انسانی زندگی میں بھرپوریت کا عنصر پیدا کرتا ہے۔ مختلف استعداد اور صلاحیتوں کے استعمال کے نتائج بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دوسرے فصول میں ہر انسان کی تخلیق صلاحیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ اور ایک آزاد معاشرے میں ایسا ہونا بھی چاہیے۔ اسی طرح ہر شخص کا صلہ یا معاوضہ بھی دوسرے سے مختلف ہوگا۔ اسلام معاوضہ یا صلہ کو محدود یا پابند نہیں کرتا مگر اس کو خراج کرنے اور اس کے اطلاق کو منصفانہ طور پر بناتا ہے جو عمومی طور پر قانونی پابندیوں پر زیادہ تر ترغیب کے عمل سے عقیدے کے ذریعے یہ انسان کہ روح میں پوشیدہ اس خواہش کو بیدار کرتا ہے جو خدا تک پہنچنے کی متمنی ہے جو اس کی خواہش کے مطابق کام کرنا چاہتی ہے تاکہ اس کی رضا حاصل کی جاسکے۔ یہی خواہش نیکی کا غالب محرک بنتی ہے اور اسی کے تحت اعمال سرانجام دیتے جاتے ہیں۔

جن معاشروں میں ہر چیز کو پابندیوں کے ذریعے چلانے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں طبقاتی کشمکش و حقیقت کبھی ختم نہیں ہوتی صرف مادی اور فزیکل چیزوں کو لازمی پابندیوں کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔ جہاں اس قسم کے قواعد و ضوابط کے خلاف جذبات بیدار ہو جاتیں تو بے اطمینانی کو محض نعروں اور بیانات کے ذریعے ختم نہیں کیا جاسکتا جبکہ عقیدے سے جنم لینے والی رضا کارانہ کوشش جو خداوند تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کی جاتی ہے اس کے لئے دی جانے والی قربانی اطمینان و مسرت کا باعث بنتی ہے۔



یہ طبقائی تقسیم اور غربت کے جذبات کو ختم کرتی ہے اور الگ تنہا ہونے کا سوچ کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے اسلام علیہ السلام کی پسندی کو ختم کرتا ہے اور شرارت، باہمی اخوت اور مل بیٹھنے کو فروغ دیتا ہے۔

باہمی میل جول کے فروغ کے لئے اسلام سادہ طرز زندگی اختیار کرنے پر زور دیتا ہے اور تقصیر اور بناوٹ کی نفی کرتا ہے۔ مگر میں خطرات اور مشکلات اور بعد ازاں مدنیہ منورہ میں نسبتاً زیادہ تحفظ کے دلوں میں جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آسان زندگی گزار سکتے تھے آپ نے سادہ طرز زندگی اپناتے رکھا بلکہ نہایت ہی سادہ۔ آپ نے اپنے ادا اپنے ساتھیوں کے درمیان کوئی پابندیاں کھڑی نہیں کیں۔ اور کوئی بھی مسلمان آپ سے آسانی کے ساتھ مل سکتا تھا۔ آپ کم کھاتے اور جو کچھ بھی مل جاتا شکر کر کے کھا لیتے۔ پہننے کو جو کچھ بھی میسر آتا اُسی سے تن ڈھانپ لیتے۔

قیام پاکستان کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں سادگی ان لوگوں کا شعار ہونا چاہیے مٹی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ پر چلتے ہوئے اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کے خواہاں تھے۔ سماجی اوپینج نیچ کو ختم کر دیا جانا چاہیے تھا۔ اسلام کے منافی ہونے کے باعث تعیشت سے احتراز کیا جانا چاہیے تھا اور ان کی بجائے سادہ طرز زندگی میں آرام تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ آنحضرتؐ کا ذکر ہے چڑے کا تھا جس میں پتے اور گھاس پھوس بھرا ہوتا تھا۔ رہتے رہتے کہتے تھے وہ میاں اور طور طریقے جن سے ایک عام پاکستان نا آشنا تھا اور جن کے ساتھ وہ مانوس نہ تھا بیکسر ترک اور ممنوع قرار دیتے جاتے چاہتے تھے۔ پاکستان کو اسلامی سماجی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنا چاہیے تھا۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب حالات کے مطابق انتظامی شیرازی کو سادگی اپنانی چاہیے تھی سرخ نیستے کا خاکہ کیا جانا چاہیے تھا اور معاشرے کے ہر طبقے سمیت حضو مناسر کاری ملازم پر واضح کرنا چاہیے تھا کہ وہ صحیح معنوں میں عوام کا خادم ہے اور اس کی مسلسل کوشش ہونی چاہیے کہ وہ محنت، خوش اخلاقی اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرے تاکہ اللہ کی مخلوق کے لئے اس کی خدمت خدا کی بارگاہ میں مقبول ہو۔

پبلک کو بھی احساس دلایا جانا ضروری تھا کہ اُن میں سے جن کو اختیار دیا گیا تھا ان کے ساتھ تعاون کریں اور ان کی ہدایات پر عمل کریں تاکہ انجام کار ہر کام بطریق احسن انجام پاجاتے (سورۃ ۴ آیت ۵۰)

ملکہ پاکستان نے بیوروکریسی کے جھجکل سے نکلنے کی کوئی کوشش نہ کی جس میں اسے برطانوی عہد ہی سے جکڑا جاکا تھا۔ اور اُس کے عوام نے سیاسی ایجنڈیشن کے پرانے ہتھکڑے ترک نہ کئے جن میں



نعرے بازی، جلسے جلوس اور پولیس کے خلاف مزاحمت وغیرہ شامل تھی۔ عوام اور حکومت دونوں میں سے کسی نے اس کی شہادت پیش نہیں کی کہ اب مورخ حال یکسر بدل چکی تھی۔ اور یہ حکومت اور عوام اب دونوں ایک ہی سمت میں کھڑے تھے اور ان کی سلامتی ایک دوسرے کے قریب آجانے میں تھی۔ نہ کہ مخالف سمتوں میں بڑھتے چلے جانے میں۔

جلوس ہی حقوق کے مطالبات کے لئے طبقاتی رستہ کشی کا آغاز ہو گیا حالانکہ یہ وقت بے تابی کے ساتھ آگے بڑھ کر فرائض کے ادا کرنے کا تھا۔ خصوصاً ارشاد فرمایا تھا، ”تم میں سے ہر کوئی قوم کا خادم ہے اور ہر کوئی اس چیز کا جوابدہ ہے جو اس کی تحویل میں دی گئی ہے۔“

بین الاقوامی تنظیم محنت (آئی ایل او) کی تشکیل اور اُجرتوں کی ادائیگی کے پہلے ریگولیشن سے مدد لینے پہلے آنحضرتؐ نے حکم دیا تھا،

”مزدور کو اس کی محنت کا معاوضہ اُس کے بدن کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔“  
آپؐ کا ضابطہ محبت نہایت مختصر تھا۔

”وہ لوگ جو تمہارے لئے کام کرتے ہیں تمہارے بھائی ہیں جن پر اللہ نے تمہیں عازنی اختیار دیا ہے۔ انہیں اُسی طرح کھلاؤ جس طرح خود کھاتے ہو، اُسی طرح پہناؤ جس طرح خود پہنتے ہو اور اُن سے اُن کی استطاعت سے زیادہ کمٹن کام نہ لو۔ اگر تم انہیں کوئی مشکل کام کرنے کو کہو تو تم ضرور ان کے ساتھ اس میں شامل ہو جاؤ۔“

برائی اور فساد اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ عمل ہے جس کی قرآن میں بار بار مذمت کی گئی ہے۔ اسلام کے معانی ہی امن کے ہیں۔ اسلامی طریقہ تہنیت السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) ہے اور اس کا جواب بھی سلامتی ہی ہے وعلیکم السلام (اور تم پر بھی سلامتی ہو)۔

پاکستان کے عوام پر لازم تھا کہ وہ دنیا کے سامنے نظم و ضبط اور امن و سلامتی کا نمونہ پیش کریں۔ اس معاملے میں اگر وہ اپنی ہم عصر قوموں سے بدتر نہیں ہیں تو ان سے بہتر ہونے کا دعویٰ ابھی نہیں کر سکتے۔ جبکہ وہ توراتی طور پر اس بات کے پابند تھے کہ نظم و ضبط کی پابندی کریں اور امن کے راستوں پر چلیں۔ غلط کاروں کو اللہ کا عذاب فوراً ہی نہیں پکڑ لیتا۔ وہ ہلکتا دیتا ہے اور اصلاح کا موقع دیتا ہے مگر وہ جو گناہ کا سلسلہ جاری رکھیں انہیں بالآخر پکڑ لیا جاتا ہے۔



”اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کے سبب (فرما) پکڑنے لگے تو ایک (بھی) جاندار کو زمین پر نہ چھوڑے لیکن اُن کو ایک دقت مقرر تک بہت دیتے جاتا ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی بیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں“ (سورۃ ۱۶ آیت ۶۲) گزشتہ پچیس سال کے دوران پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے گئے عہد کی مسلسل، بار بار اور کھلے بندوں خلاف ورزی کی گئی جس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی کی صورت میں نکلنا لازمی تھا۔

(سورۃ ۱۶ آیت ۸)

”اور بہت سی بستیوں (کے رہنے والوں) نے اپنے پروردگار اور اُس کے پیغمبرین کے احکام کی سرکشی کی تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا اور اُن پر (ایسا) عذاب نازل کیا جو نہ دیکھا تھا نہ سنا سوا انہوں نے اپنے (بُڑے) اعمال کی سزا کا مزہ چکھ لیا اور ان کا انجام نقصان ہی تو تھا۔ خدا نے اُن کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ تو اسے اربابِ دانش جو ایمان لاتے ہو خدا سے ڈرو۔“ (سورۃ ۶۵ آیت ۹ تا ۱۱)

”اور سمجھتے تو بھی ہیں جو عقلمند ہیں جو خدا کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو نہیں توڑتے اور جن (رشتہ ہائے قرابت) کے جوڑے رکھنے کا حکم خدا نے دیا ہے اُن کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے اور بُرے حساب سے خوف رکھتے ہیں۔ اور جو پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (مصائب پر) صبر کرتے اور ناز پر ہتھ نہیں اور جو (بر مال) ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے پوشیدہ اور ظاہر اُخر چ کرتے ہیں اور نیکی سے بُرائی کو دور کرتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے لئے عاقبت کا گھر ہے۔ (یعنی) ہمیشہ رہنے کے باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادا اور بیٹیوں اور اولاد میں سے جو نیکو کار ہوں گے وہ بھی (بہشت میں جائیں گے) اور فرشتے (بہشت کے) ہر ایک دروازے سے اُن کے پاس آئیں گے۔ (اور کہیں گے) تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے اور عاقبت کا گھر خوب (گھر) ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے ساتھ عہدِ واثن کر کے اُسے توڑ ڈالتے اور جن (رشتہ ہائے قرابت) کے جوڑے رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے اُن کو قطع کر دیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہیں۔ ایسوں پر لعنت ہے اور ان کے



لے لے گھر بھی بُرا ہے۔ خدا جس کا رزق چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور (جس کا چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔ اور کافر لوگ دنیا کی زندگی پر خوش ہو رہے ہیں اور دنیا کی زندگی آخرت (کے مقابلے) میں بہت ہتھوڑا فائدہ ہے۔“ (سورۃ ۱۳ آیت ۲۰ تا ۲۷)

لہذا پھر مستقبل میں کوئی امید نہیں؛ اس کے برعکس ارشاد ہوتا ہے:

”ماریس ہونا تو (بس) مگر اہوں کا کام ہے۔“ (سورۃ ۱۵ آیت ۵۷)

”اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں سے کہہ دو کہ اے میرے بند و جنوں نے اپنی جائز و پرزیا دتی کی ہے خدا کی رحمت سے نا امید نہ ہونا۔ خدا تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آ واقع ہو اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ پھر تم کو مدد نہیں ملے گی۔ اور اس سے پہلے کہ تم پر ناگہاں عذاب آجائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ اس نہایت اچھی کتاب) کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوتی ہے، پیروی کرو کہ (مبارک اُس وقت) کوئی ششس کہنے لگے کہ (اتے ہاتے) اس غفلت پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی اور میں تو ہنسی ہی کرتا رہا۔ یا یہ کہنے لگے کہ اگر خدا مجھ کو ہدایت دیتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں ہوتا۔ یا جب عذاب (دیکھ لے) تو کہنے لگے کہ اگر مجھے پھر ایک دفعہ دنیا میں جانا ہوتا تو میں نیکی کاروں میں ہو جاؤں۔ (خدا فرماتے گا) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں مگر تو نے ان کو جھٹلایا اور شی میں آگیا اور تو کافر بن گیا۔ اور جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا تم قیامت کے دن دیکھو گے کہ ان کے مُنہ کالے ہو رہے ہوں گے۔ کیا غرور کرنے والوں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے؟ اور جو پرہیزگار ہیں ان کی (سعادت اور) کامیابی کے سبب خدا ان کو نجات دے گا۔ نہ تو ان کو کوئی سختی پہنچے گی اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور وہی ہر چیز کا نگران ہے۔ اُسی کے پاس آسمانوں اور زمین کی کُنیاں ہیں۔ اور جنہوں نے خدا کی آیات سے انکار کیا وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔“ (سورۃ ۳۹ آیت ۵۴ تا ۶۴)

اللہ تعالیٰ نے مننبہ کیا ہے:



”اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت

کو نہ بدلے۔ (سورۃ ۱۳ آیت ۱۲)

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم کرے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا طالب ہو۔  
”پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تُو، تمہیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں  
کے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ (سورۃ ۴ آیت ۲۴)

اللہ کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ انسان اپنے ساتھ خود زیادتی کرتا ہے۔

”خدا تو لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔“

(سورۃ ۱۰ آیت ۴۵)

”خدا نے ان کے ساتھ ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کیا۔“

(سورۃ ۹ آیت ۶۰۔ سورۃ ۲۹ آیت ۴۱۔ سورۃ ۳۰ آیت ۱۰)

اللہ انسان کو پسند اور ناپسند کا اختیار دیتا ہے مگر انسان جو تو رہتا ہے وہی کاٹتا ہے۔

”جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو ہم اُس کو اُسی میں سے دیں گے اور جو دنیا کی  
کھیتی کا خواستگار ہو اُس کو ہم اُس میں سے دیں گے۔ اور اُس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔“

(سورۃ ۴۲ آیت ۲۱)

”جو شخص دنیا کی آسودگی کا خواہش مند ہو تو ہم اس میں سے جسے چاہتے ہیں اور جتنا

چاہتے ہیں جلد دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لئے جہنم کو (ٹھکانا) مقرر کر رکھا ہے جس

میں وہ نعرین سُن کر اور (دراگاہِ خدا سے) راندہ ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو شخص آخرت کا

خواستگار ہو اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اُسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو

ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔ ہم اُن کو اور اُن سب کو تمہارے پروردگار

کی بخشش سے مدد دیتے ہیں۔ اور تمہارے پروردگار کی بخشش (کسی سے) رُک

ہوتی نہیں۔“ (سورۃ ۱۴ آیت ۱۹ تا ۲۱)

”اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہو تو وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو

(فحاش پر) مامور کر دیا تو وہ نافرمانیاں کرتے رہے۔ پھر اُس پر (عذاب کا) حکم ثابت



ہو گیا اور ہم نے اُسے ہلاک کر ڈالا۔" (سورۃ ۱۴ آیت ۱۴)  
 مگر جن لوگوں نے نادانی سے بُرا کام کیا پھر اس کے بعد توبہ کی اور نیکو کار ہو گئے  
 تو تمہارا پروردگار (اُن کے) توبہ کرنے اور نیکو کار ہوجانے کے بعد ان کو بخشنے والا اور  
 (اُن پر) رحمت کرنے والا ہے۔" (سورۃ ۱۹ آیت ۱۲۰)  
 "جب تمہارے پاس ایسے لوگ آیا کریں جو ہماری آیاتوں پر ایمان لاتے ہیں تو (ان سے)  
 سلام علیکم کہا کرو اور خدا نے اپنی ذات (پاک) پر رحمت کو لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی  
 تمہیں سے نادانی سے کوئی بُری حرکت کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور نیکو کار ہو  
 جائے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (سورۃ ۶ آیت ۵۵)

گناہ پر پکھتاؤ سے کام طلب اُس چیز سے مکمل طور پر مُنہ موڑ لینا ہے جو اللہ کی رضا کے خلاف ہے۔  
 اور نیکی کے ساتھ مضبوط تعلق استوار کرنا ہے۔ مگر یہ کوئی غار مولا نہیں ہے جسے بار بار دہرایا جاسکے۔  
 "بے شک خدا توبہ قبول کرنے والا (اور) مہربان ہے۔ خدا اپنی لوگوں کی توبہ قبول  
 کرتا ہے جو نادانی سے بُری حرکت کر بیٹھے ہیں۔ پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں  
 پر خدا مہربانی کرتا ہے۔ اور وہ سب کچھ جانتا (اور) حکمت والا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی  
 توبہ قبول نہیں ہوتی جو (ساری عمر) بُرے کام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب اُن میں سے  
 کسی کی موت آجود ہو تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن کی (توبہ قبول ہوتی ہے)  
 جو کفر کی حالت میں مرے۔ ایسے لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

(سورۃ ۴ آیت ۱۴ تا ۱۹)

زیر نظر معاملے میں سب سے اہم خطایہ ہوتی کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی زندگیوں، قرآن و سنت  
 میں مذکورہ اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کا جو عہد کیا تھا اس میں ناکام رہے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر ان  
 صفحات میں کیا گیا ہے۔ انہیں ہماری خطا میں ناپنے کے لئے پیمانے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی  
 تعلیمات کے مطابق زندگیوں گزارنے کے لئے ہمیں کئی لحاظ سے بالکل دوسری سمت چلنا ہو گا اس کے لئے  
 صاف بصیرت، بلند جوہلی اور انتہائی ضبط اور برداشت کے علاوہ انکساری اور سخیگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ  
 کے بتاتے ہوئے اصولوں سے مسلسل رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔



”جے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔ مگر انسان (مجیب مخلوق ہے کہ) جب اُس کا پروردگار اُس کو آزماتا ہے کہ اُسے عزت دیتا اور نعمت بخشا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی۔ اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اُس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ (اُٹھے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا۔ نہیں۔ بلکہ تم لوگ یمیم کی خاطر نہیں کرتے۔ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو۔ اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔ تو جب زمین کی بلندی کوٹ کوٹ کر پست کر دی جاتے گی اور تمہارا پروردگار (جلوہ فرما ہو گا) اور فرشتے قطار باندھ کر آمو جو ہوں گے اور وزخ اُس دن حاضر کر دی جاتے گی تو انسان اُس دن متنبہ ہو گا مگر تنبیہ (سے) اُسے (فائدہ) کہاں (مل سکے گا)۔ کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی (جاودانی) کے لئے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔ تو اس دن نہ کوئی خدا کے عذاب کی طرح کا (کسی کو) عذاب دے گا اور نہ کوئی ویسا بگڑنا بگڑے گا۔ اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اُس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے (ممتاز) بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔ (سورۃ ۸۹ آیت ۲۵ تا ۳۱)

ہم سب کو مقام الہی پر غلوس، سنجیدگی اور پورے خضوع و خشوع کے ساتھ مل پیرا ہونا چاہیے۔ ”مومنو! رکوع کرتے، سجدے کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ نجات پاؤ۔ اور خدا (کی راہ میں) جہاد کرو جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔ (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا)۔ اُسی نے پہلے (یعنی پہلی کنزوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے تو جہاد کرو) تاکہ بغیر تمہارے بارے میں شاید یہوں اور تم لوگوں کے مقابلے میں شاید ہو۔ اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا (کے دین کی رسی کو) پکڑے رہو۔ وہی تمہارا دوست ہے۔ اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔“ (سورۃ ۲۲ آیت ۷۸ - ۷۹)









# ایک دل ہزار داستان

آغا شرف کی تحریر کی رعنائی اور قلم کی شوفی نے ”ایک دل ہزار داستان“ کے نام سے ایک ایسی خود نوشت کو جنم دیا ہے جو سوانح نگاری کے فن میں سدا مسکرانے والا پھول ہے۔ جس میں نسیم حرکی سی درخشانی اور حشرید اماں شہاب کی سی سحر پاشی ہے۔ اس کا قلم اس کے تجربات، مشاہدات اور یادداشتوں سے واقعات کی بجلیاں گراتا چلا جاتا ہے۔ اس میں گل افشانی ہے اور آتش افشانی بھی۔ جب وہ خود ایک گکھام تھا تو صرف لاہور کے گلی کوچوں میں ہی اس نے چوکڑیاں نہیں بھریں۔ وہ برصغیر کے ہر قابل ذکر شہر اور اس شہر کے کونے کونے میں گیا۔ لکھنؤ، بمبئی، دہلی، آگرہ، ٹیگور کے شائقِ نکیتن، الہور اور اجنٹا کے غاروں کے گلشنِ ایجاد کا بھی گل گشت نہیں رہا۔ شیکسپیر اور ہیوگو کے دیس میں بھی گل شب افروز رہا۔ وہ برصغیر کے اس دور کی ادبی مجلسوں، سماجی، تمدنی رسوم و قیود اور رواجوں اور روایتوں اور سیاسی نشیب و فراز کا گل دستہ اس خوب صورتی سے باندھتا ہے کہ پڑھنے والا گل و لالہ اور گل نشاط کے سرور میں ڈوب جاتا ہے اور گزشتہ صدی پر محیط لاہور کی کیا گل کاری کی ہے۔ اس دور کی کوئی ہی سماجی، ادبی، فلمی اور سیاسی شخصیت ہوگی جس سے اس کی نشست و برخاست نہ رہی ہو۔ اس وقت کے پہلوان، کھیل، کھلاڑی، چیچو چیچ گندیریاں، گلی ڈنڈے، بیرو کوتر بازی، چنگ بازی، کرکٹ، تھیرڈیکل کمپنیوں، خاموش فلموں، ریڈیو، باغات، قہقہوں، تکیوں، مسجدوں، مندریوں، دسروں، دیوالیوں، بیساکھیوں، شبِ براتوں، شادی بیاہ کی رسموں، رواجوں اور میل جول کے طور طریقوں کا اس نے ایک گل کدہ سجا کے رکھ دیا ہے اور جب وہ اپنے مشاہدات اور واقعات کو تاریخ کا ٹچ دیتا ہے تو تحریر اور گل رخ ہو جاتی ہے۔

آغا شرف کی یادداشتوں پر مبنی کتاب ”ایک دل ہزار داستان“ دراصل ایک گل ہزارہ ہے یعنی لاتعداد پنکھڑیوں والا ایک پھول۔

قیمت :- ۱۵۰ روپے

آتش فشاں پبلیکیشنز

شہباز نیلا — ایبٹ روڈ — لاہور



پاکستان

## سیاسی جوار بھانا

منیر احمد منیر

”پاکستان..... سیاسی جوار بھانا“ جیسا کہ نام سے عیاں ہے کہ اس کتاب میں پاکستان کی سیاسی زندگی میں ابھرنے، ابھر کر چلنے اور چل کر طغیانی بن جانے والی ان لہروں کا تذکرہ ہے جن کی لپیٹ میں آکر صائب سوچیں اور سرسبز اوتھیں دم توڑتی چلی گئیں اور پھر ان کی کوکھ سے کئی لیوں نے جنم لیا۔

قیمت..... ایک سو روپے

## رنجیت سنگھ کا دربار

پنجاب کے مطلق العنان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار، اس کے طریق حکومت، اس کی زمانہ فوج، ہنگ ویدل اور سن و طرب میں ڈوبی ہوئی اس کی کتاب زندگی کے اوراق — اور بیشمار واقعات کا آنکھوں دیکھا حال —

مصنف :- ڈیویو جی آسبرن  
ترجمہ :- نواب ذوالفقار علی خاں  
قیمت :- پچاس روپے

## مادرن کولبس

جاوید اقبال کارٹونسٹ کا ایسا منفرد، دلچسپ اور دلربا سفرنامہ یورپ و امریکہ کہ جو پڑھے جھومتا جائے۔ اس کے کارٹونوں کی طرح بے باک، بے ساختہ اور اورجنل۔ جسے پڑھتے ہوئے قاری خود کو جاوید اقبال کا ہم سفر محسوس کرتا ہے۔  
سفرناموں کے ادب میں ایک دلکش افسانہ  
قیمت..... پچتر روپے

اقتساف شائے پبلیکیشنز

شہباز نیما — ایٹ روڈ — لاہور



## حالات قائد اعظم

مصنف  
خالد اختر افغانی

قیمت :- ۱۲۵ روپے

یہ کتاب قائد اعظم کے سفر سیاسی  
جنگ و تاز کی تاریخ ہے۔ جو  
قائد اعظم کے سیاسی تشخص  
اور اس دور کے سیاسی  
مذہب و جزر کے تاریخ ساز واقعات  
اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

## قائد اعظم جناح

بیانات امین جانا بھوں

مصنف  
حسن اصفہانی

قیمت :- ۱۲۵ روپے

حسن اصفہانی کی یہ تصنیف معرکے ہی کی نہیں، بلکہ  
یادگار اور عظیم الشان بھی ہے۔ جس سے قائد اعظم کی  
شخصیت اور قیام پاکستان کے لئے ان کی جدوجہد  
ایک نئے انداز میں سامنے آتی ہے اور اس دور کی بعض شخصیتوں  
اور واقعات کی اصلیت بے نقاب ہوتی ہے۔

## انجمن

مصنف

فقیر سید وحید الدین

قیمت: ایک سو روپیہ

قائد اعظم، علامہ اقبال، مولانا الطاف حسین حالی،  
نواب بہادر یار جنگ، مولانا ظفر علی خاں، سر ظفر اللہ خاں، راجا گوپال  
اچاریہ اور فیض احمد فیض سمیت ۳۴ سیاسی، علمی اور ادبی  
شخصیتوں سے متعلق نادر اور تاریخی واقعات اور یادداشتوں  
کے حسین گلدستے کا نام ہے — انجمن —

آتش فشاں پبلیکیشنز

شعبان سنہ — ایبٹ روڈ — لاہور



## میراجبائی

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ  
کی داستانِ حیات جسے ان کی عظیم بہن مادیات محترمہ فاطمہ  
جناح نے اپنی یادداشتوں سے کشید کیا۔ اور جس میں قائد کی  
زندگی کے وہ پہلو بھی بیان کئے ہیں جو اب تک نظروں  
سے اوجھل تھے۔

قائد کے خاندانی حالات، بچپن، جدوجہد اور مسلسل  
سے بھرپور زندگی جس نے رکاوٹوں کا بھرپور کھدکھدایا۔

قائد اعظم پر اب تک  
لکھی جانے والی کتابوں  
میں ایک خوش اسلوب اضافہ

قیمت: چالیس روپے

## قائد اعظم پر قابلِ زعہ

ترجمہ  
میراج احمد منیر

اکبر الہ پیر بجائی بار ایٹ لار

قیمت: پچاس روپے

## قائد اعظم ابتدائی تیس سال

اس کتاب کے پیش لفظ میں قائد اعظم کی ہمشیرہ  
محترمہ شیریں جناح لکھتی ہیں:

”..... قائد اعظم کے ابتدائی تیس سال کے تذکرے  
میں بہت سے انکشافات ہیں اور جو باتیں پیش کی ہیں، ان میں  
بیشتر کے دستاویزی ثبوت بھی مہیا کئے ہیں، جن سے اُن  
تمام کہانیوں کی تردید ہو جاتی ہے جو تحریروں میں  
آگئی ہیں.....“

رضوان احمد  
قیمت پچاس روپے

## اقتشے فشاں پبلیکیشنز

شعبان مینا — ایٹ روڈ — لاہور



## روزگار فقیر

فقیر سید وحید الدین

قیمت جلد اول ۷۵ روپے  
قیمت جلد دوم ۱۲۵ روپے

## فیض احمد فیض

”روزگار فقیر“ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:  
اس تصنیف میں اقبالؒ کی زندگی کے گھریلو  
روزمرہ مناظر، ان کی نجی صحبتیں اور رنجشیں، راحتیں اور  
کلفتیں، ان کے دل کا گداز اور دماغ کی شگفتگی، اقبالؒ  
کے آئسوا اور اقبالؒ کے قہقہے سبھی شامل ہیں۔

منیر احمد منیر

کی



کچھ اس کی لاش سارا دن وہاں پڑی  
رہی۔ کوئی قریب سے نہ جانے۔

کچھ شام سوئی تڑپ کے لئے انہوں  
نے ایسا کیا۔

کچھ غدار خان ہم تھے سرحد کا بادشاہ بنا  
دیں گے۔

کچھ ایک نصرت بھو اندر آئیں۔  
دراںک روم میں انہوں نے بھاگنا  
مجھے تو نہ چاہتی تھیں۔ وہ پھر چلی گئیں  
اور مجھے پتہ چل گیا کہ ڈراپ  
سین ہو گیا ہے۔

کچھ ۱۹۸۸ء لاکھ اس کے پرائیویٹ خزانے  
میں تھا۔ اسی آدمی اس پر گارڈ تھے۔

قیمت ایک سو روپیہ

منیر احمد منیر کی



دو جہاں چار پانچ  
بغلاک ہمارے  
پاس رہا کھانگی  
غیشی تو میری ہے کلون

یہ منظر اتنا دلہن  
تھا کہ بچی خاں  
کھاں تکوں سے  
آئسوا پید کیے

قیمت: ۵۰ روپے

آتش فشاں پبلیکیشنز

شعبان سنہ — ایسٹ روڈ — لاہور



# محسن اعظم اور محسنین رضی

قیمت..... (اردو ایڈیشن) پچاس روپے

قیمت..... (سندھی ایڈیشن) پچاس روپے

محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ  
اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی حیات  
مبارکہ پر فقیر سید وحید الدین کی دلنشین  
انداز اور دلکش اسلوب میں لکھی ہوئی  
منفرد تالیف -

## The Benefactor

(TRANSLATION OF MOHSIN-I-AZAM AND MOHSANIN)

BY

FAKIR SYED WAHEED-UD-DIN

ENGLISH TEXT REVISED

BY

FAIZ AHMED FAIZ

Price: 100/-

**ATISH FISHAN**

PUBLICATIONS

Shabistan Cinema, Abbot Road, Lahore



**MOHOMED ALI JINNAH**  
**AN**  
**AMBASSADOR OF UNITY**

WITH A BIOGRAPHICAL APPRECIATION

BY

SAROJINI NAIDU

PRICE: RS.100/-

24737  
 ACC. # .....  
 MADAR-I-MILLAT LIBRARY  
 MUHAMMAD I. QUAID-I-AZAM  
 MAZARIA-PAKISTAN TRUST  
**THE**  
**MAGNA CARTA**  
**OF**  
**PAKISTAN**

(QUAID'S MAGNA CARTA TO THE NATION)

PRICE: RS.100/-

**ATISH FISHAN**

PUBLICATIONS

Shabistan Cinema, Abbot Road, Lahore